علامہ فضل حق خیرآبادی
چند عنوانات
خوشتر نورانی
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

علامہ فضل حق خیرآبادی

چند عنوانات

خوشتر نورانی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

علامہ فضل حق خیرآبادی

چند عنوانات

خوشتر نورانی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

پہلی اشاعت : 2013
تعداد : 550
قیمت : -/91 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1799

Allama Fazle Haque Khairabadi
Chand Unwanaat
By: Khushtar Noorani

ISBN :978-81-7587-983-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

علامہ فضل حق خیرآبادی تیرھویں صدی ہجری کی ایک عہد ساز شخصیت تھے جن کے ملک وملت پر تین ایسے احسانات ہیں کہ ان کے بار سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

وہ تین احسانات یہ ہیں:

انقلاب 1857 میں اپنے وطن کو انگریزی استعمار سے آزاد کرانے کے لیے پورے جوش اور ولولے کے ساتھ علمی، فکری اور عملی طور پر حصہ لیا اور اس جرم میں جلاوطنی اور قید وبند کی ناقابل برداشت سختیاں جھیلتے ہوئے دم توڑ دیا۔ یہ جنگ اور اس میں حصہ لینے والوں کی فکری وعملی بیداری اور قربانی ہی تھی جو 1947 میں ہندوستان کی آزادی کی بنیاد بن گئی۔

علامہ کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی کے ذریعے ''مکتب خیرآباد'' کی شکل میں جس دبستان علم وفن کی بنیاد ڈالی گئی، علامہ فضل حق خیرآبادی نے اس کی فیض بخشیوں کو اس طرح عام کیا کہ آج بھی مدارس دینیہ میں پڑھنے والے طالبان علوم کا شجرۂ تلمذ اسی دبستان پر استوار ہے۔ اس کے بعد پوری دنیا میں علم معقولات کا کوئی مکتب اور دبستان وجود میں نہ آسکا۔

تیرھویں صدی کے ربع اول میں دینی روایات، مذہبی معتقدات اور صوفیانہ مراسم کے خلاف فکری انحرافات کی جو تحریک اٹھی تھی، متحدہ ہندوستان میں علامہ خیرآبادی وہ پہلے شخص تھے

جنھوں نے اس تحریک پر بندش لگانے کے لیے اپنی پوری توانائی کے ساتھ زبانی، فکری اور قلمی جہاد کیا اور ہماری مذہبی اور تہذیبی اکائی کو پارہ پارہ ہونے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے بعد جن علمانے بھی اس جہت پر کام کیا اور کر رہے ہیں وہ بالواسطہ علامہ خیر آبادی کے مشن کی توسیع ہے۔

منت شناسی کا تقاضا تھا کہ ملک وملت کی حفاظت کے لیے علامہ کی ان اہم خدمات کی وجہ سے انھیں ہمیشہ یاد کیا جاتا، لیکن زود فراموشی کے اژدھے نے ایک عہد ساز شخصیت کو سالم نگل لیا اور تاریخ وتحقیق کے نام پر مسلکی فرقہ واریت اور گروپ ازم کے عمل نے ان کے کارناموں کو شکوک وشبہات کی سان پر چڑھا دیا۔ اس درمیان متعدد فضل حق شناسوں نے اپنے قلم کے ذریعے ان کمیوں کے تدارک کی کوششیں کیں، جن کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے، مگر ان کی یہ کوششیں انفرادی اور خالص علمی سطح کی تھیں، اس لیے ان کے اثرات ایک مخصوص حلقے تک ہی محدود رہے۔ اس کے بعد "خیر آبادیات" کے معلوم گوشوں کو دہرانے کا عمل شروع ہو گیا۔ 2011 میں علامہ خیر آبادی کے وصال کو ڈیڑھ سو سال مکمل ہوئے تو اہل علم وقلم کی جانب سے "فضل حق شناسی" کی عوامی اور علمی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا اور علامہ خیر آبادی کی مذکورہ خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ہندو پاک میں ہماری معلومات کے مطابق مختلف نوعیت کے متعدد کام ہوئے۔

ان کاموں کے ساتھ ساتھ محترم خوشتر نورانی کی ایک اہم علمی وتحقیقی کتاب "علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات" بھی منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب تاریخ کے نئے حقائق اور نئی معلومات کے ساتھ سامنے آئی، جسے سلسلۂ خیر آباد اور معرکہ ستاون کے معلوم گوشوں پر ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے، یقیناً یہ اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ محققین اور ناقدین نے بھی اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ہندو پاک کے اہم روزناموں اور رسائل وجرائد نے اس پر فاضلانہ تبصرے کیے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے اس کتاب کو اپنے موضوع پر "حرف آخر" قرار دیا اور پروفیسر سید حسین الحق نے اس کا شمار "اردو کی اعلیٰ تحقیقی کتب" میں کیا۔ کتاب کے مصنف کو ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ کی اہم خانقاہ "خانقاہ برکاتیہ" مارہرہ کی جانب سے ایک ایوارڈ بنام "نشان تاج العلما" اور جناب دگ وجے سنگھ (جنرل سیکریٹری: آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی) اور محترم سلمان خورشید (وزیر خارجہ: حکومت ہند) کے ہاتھوں مینائی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ لکھنؤ کی

جانب سے ''فضل حق ریسرچ ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا-2011 میں یہ کتاب ہند و پاک سے بیک وقت شائع کی گئی اور ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' نئی دہلی نے اس کتاب کی علمی، تحقیقی اور تاریخی حیثیت کے پیش نظر اس کے سیکڑوں نسخے خرید کر اہل علم اور لائبریریوں تک پہنچائے۔

کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اب ''قومی کونسل'' اسے شائع کر رہا ہے، امید کی جاتی ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست

اظہاریہ

اکتوبر 2010 میں کیو ٹی وی کی دعوت پر پاکستان جانے کے لیے میں اور میرے دوست مولانا اسید الحق قادری بدایونی پابہ رکاب تھے کہ ایک شام مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کا فون آیا، انھوں نے کچھ ضروری امور پر تبادلۂ خیال کے پیش نظر اپنے ادارے دار القلم حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں جب وہاں پہنچا تو انھوں نے توجہ دلائی کہ اگست 2011 میں استاذ مطلق مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی کے وصال کو ڈیڑھ سو سال مکمل ہو رہے ہیں۔ علامہ پر علمی و تحقیقی نوعیت سے بہت کم ورک ہوا ہے، اس لیے ہم سب کا مشترکہ فریضہ ہے کہ ہم مختلف جہتوں سے علامہ کے علمی، فکری اور جنگ آزادی 1857 پر مشتمل کارناموں کو سامنے لائیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ تم ہمارا یہ پیغام لے کر پاکستان بھی جاؤ اور وہاں کے علما، محققین اور اہل قلم کی توجہ اس طرف مبذول کراؤ۔

مصباحی صاحب کی اس گفتگو سے اولین مرحلے میں ہم نے طے کیا کہ اس موقع پر ہم "جام نور" کا ایک خصوصی شمارہ شائع کر دیں گے جو ہماری طرف سے علامہ خیر آبادی کی بارگاہ میں ان کی ڈیڑھ سو سالہ وفات پر علمی خراج ہوگا۔ پاکستان سے واپسی پر اس تعلق سے اسید الحق صاحب سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے جام نور کے خصوصی شمارے کے لیے علامہ پر ان کے علم و فضل کے حوالے

سے ایک مبسوط مضمون لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا، جب کہ جنگ آزادی کے حوالے سے قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ہم نے اپنے اپنے موضوع پر دستیاب مواد کا مطالعہ شروع کر دیا۔مطالعے کے نتیجے میں جو چند باتیں مجھ پر منکشف ہوئیں، وہ کچھ ایسی تھیں:

1۔علامہ کی وفات 1861 کے سو سال بعد تک ان کی حیات وخدمات پر مشتمل کوئی مبسوط سوانح سامنے نہ آسکی۔ایک سو سال کے بعد جو کام ہوئے وہ ابتدائی نوعیت کے تھے، اس کے بعد دستیاب شدہ مواد اور تحریر کردہ فکری جہتوں پر خاطر خواہ اضافہ نہ ہو سکا۔اس ضمن میں مفتی نجم الحسن خیر آبادی، حکیم سید محمود احمد برکاتی اور ڈاکٹر سلمہ سیہول کے کاموں کو مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

2۔معرکہ ئستادن میں علامہ کی شرکت کے ثبوت میں اطمینان بخش مواد سامنے آچکا ہے، انھی معلوم گوشوں اور جہتوں کا اعادہ کرنا وقت اور قلم کا ضیاع ہے۔

3۔آج سے تقریباً پچاس برس قبل جنگ آزادی میں علامہ کی شرکت کو شکوک کے دائرے میں لانے کی جو شعوری کوششیں دو ماہرین غالبیات نے کیں تھیں، بعد کے غالب شناس محققین کا قلم انھی کی تحقیقات پر غیر مشروط ایمان لاتا رہا۔

4۔اکثر ناقدین نے Common Minimum ایجنڈے کے تحت علامہ کی زندگی کے چند گوشوں مثلاً انگریزی ملازمت، ہم نامی کا مسئلہ اور فتوئ جہاد وغیرہ کو ہی بنیاد بنا کر جنگ آزادی میں علامہ کی عدم شرکت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ان تمام گوشوں پر اب تک علمی وفکری جہتوں سے بہت تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا گیا یا ان پر اس حیثیت سے قلم نہیں اٹھایا گیا کہ ناقدین کے غیر شعوری شبہات کا ازالہ ہو جائے۔

مذکورہ جن پہلوؤں کا مجھ پر انکشاف ہوا، ان میں مؤخر الذکر پہلو ایسا تھا جس پر کام کرکے ''خیر آبادیات'' پر اضافے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔چنانچہ میں نے ناقدین کے ان تمام گوشوں کو سامنے رکھ کر کام کا آغاز کر دیا۔اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی کا رخ کیا اور ہفتوں وہاں گزارے، سوئے اتفاق اس وقت وہاں 1657 سے متعلق تمام دستاویزات کو ڈیجیٹلائز (Digitalize) کرنے کا کام چل رہا تھا، اس لیے انھوں نے مجھے متعلقہ تمام کاغذات کو دیکھنے کی اجازت نہیں دی، جن چند دستاویزات کے مطالعے کا موقع ملا ان سے

جنگ آزادی میں علامہ کی شرکت کے ثبوت میں دو ایک نئے حوالوں کی بازیافت ہوئی- پھر اپنے موضوع کی تلاش میں میں نے ہندوستان کی مختلف لائبریریز کی خاک چھانی، یہاں تک کہ علامہ کے وطن خیرآباد کا سفر بھی کیا- اس تفتیش و مطالعے کے بعد جو مواد میسر آیا اس کی روشنی میں لکھنا شروع کیا جس کے نتیجے میں یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے-

اس کتاب میں ناقدین کے شبہات کے ازالے اور قارئین کو نئی معلومات فراہم کرنے کے لیے علامہ خیرآبادی کی زندگی کے مختلف گوشوں پر الگ الگ تحریریں لکھی گئی ہیں، اس لیے کتاب کا عنوان "علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات" رکھا گیا ہے- کتاب میں نئے گوشوں اور نئی جہتوں کے ساتھ بعض ایسے مواد بھی پیش کیے گئے ہیں جو پہلی بار عام قارئین کے سامنے آرہے ہیں، ان میں علامہ کے فتویٰ جہاد کے ثبوت میں ایک نیا حوالہ، قصیدہ نونیہ کا اردو ترجمہ اور 235 اشعار پر مشتمل قصیدہ رائیہ کی بازیافت اور اس کا اردو میں خلاصہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دستیاب مواد سے جو کچھ لکھا گیا، کوشش کی گئی کہ وہ نئی جہتوں پر استوار ہو- تنقیدی زاویوں سے لکھی جانے والی تحریروں میں عموماً جذبات برافروختہ ہو جاتے ہیں، لیکن اس کتاب میں عمومی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ناقدین کے موقف سے اختلاف کرنے میں تحقیقی تقاضے، علمی متانت اور لب و لہجے کی شائستگی پامال نہ ہونے پائے- کتاب کے آغاز میں ان قارئین کے لیے تاریخی ادوار پر مشتمل "توقیت فضل حق" کے عنوان سے علامہ کی پوری زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جو "فضل حق، عہد فضل حق اور خیرآبادیات" سے اب تک متعارف نہیں ہو سکے ہیں- تاریخی ادوار پر مشتمل اس خاکے میں علامہ کے انہی واقعات و حالات کو شامل کیا گیا ہے جن کی حتمی تاریخ معاصر مآخذ میں مذکور ہے یا محققین نے اپنے دلائل کی روشنی میں متعین کرنے کی سعی کی ہے- اس طرح کتاب کی یہ فصل بھی نئی جہت اور نیا انداز لے کر سامنے آئی ہے- حوالہ دیتے وقت میں نے قوسین میں صرف کتاب کے نام اور صفحہ نمبر پر اکتفا کیا ہے، مصنف، سنہ طباعت اور مطبع و ناشر کی تفصیلات کتابیات کے ذیل میں درج کر دی گئی ہیں، کیوں کہ ہر حوالے میں تمام تر تفصیلات کا ذکر قاری کے تسلسل مطالعہ کو متاثر کرتا ہے- اسی طرح جہاں فارسی اور عربی کی طویل عبارتیں ہیں انھیں ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں دے دیا گیا ہے-

اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں جن لوگوں نے بھی جس حیثیت سے دست تعاون دراز کیا ہے، میں ان سب کا ممنون ہوں۔خصوصیت کے ساتھ چند لوگوں کا ذکر ضروری ہے:

(1) مولانا یٰسین اختر مصباحی، برصغیر ہندو پاک میں فضل حق شناسی کی تحریک برپا کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔یہ کتاب بھی ان ہی کی تحریک پر وجود میں آئی۔آپ نے کتاب کی تالیف کے دوران ہمیشہ قابل عمل مشوروں سے رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

(2) میرے دوست مولانا اسید الحق قادری بدایونی، جن کے علمی وفکری تعاون اور گراں قدر مشوروں کے بغیر یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔کتاب کی تالیف کے دوران آپ نے جس طرح اپنے نادر کتب خانے کو میرے حوالے کیا ہے، چند رسمی جملے اس سنت شناسی کا بدل نہیں بن سکتے۔ کتاب کی ہر ہر فصل آپ کی نظروں سے گزرنے کے بعد ہی مکمل ہوسکی۔

(3) پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل (پروفیسر وصدر: شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان) پاکستان کے علمی حلقوں میں ایک اہم نام ہے۔آپ نے اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود کرم فرمایا اور اس کتاب پر وقیع مقدمہ لکھ کر علمی حلقوں میں اس کی اہمیت و حیثیت متعین کردی۔

(4) خواجہ رضی حیدر (ڈائرکٹر: قائد اعظم اکیڈمی، کراچی پاکستان) جنھوں نے اس کتاب کا فلیپ لکھ کر اس کے وقار کو دوبالا کیا۔

(5) میرے دوست سید صبیح الدین صبیح رحمانی (مدیر: نعت رنگ، کراچی پاکستان) جن کی خصوصی نوازشات سے یہ کتاب پاکستان میں مذکورہ دونوں شخصیتوں تک پہنچی۔

(6) پروفیسر ڈاکٹر اسد قادری احمد (پروفیسر: واشنگٹن یونیورسٹی، امریکہ) آپ نے بھی اس کتاب پر فلیپ لکھ کر اس کی انفرادیت کا احساس دلایا۔

(7) مولانا دلشاد احمد قادری (استاد: مدرسہ قادریہ بدایوں) جن کی خصوصی توجہ اور محنت سے قصیدۂ نونیہ کا ترجمہ اور قصیدہ رائیہ کا خلاصہ مکمل ہوسکا۔

(8) مولانا ذیشان احمد مصباحی (مدیر: جام نور دہلی) جنھوں نے کتاب میں درج عربی و فارسی متون کے ترجمے کی تصحیح وتنقیح نیز پوری کتاب پر نظر ثانی فرمائی۔

(9) میرے دوست کاشف صدیقی، جن کی کوششوں سے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا تک رسائی ممکن ہو سکی۔

اس کتاب کی تالیف کے ذریعے جنگ آزادی 1857 کے ایک مظلوم مجاہد کے ایثار کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ باشعور قارئین کے حوالے ہے۔

خوشتر نورانی

مقدمہ

علامہ فضل حق خیرآبادی انیسویں صدی کے مسلم ہندوستان میں اپنے تبحر علمی اور دانش و حکمت کے باعث علمائے عصر میں ایک ممتاز و نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔ انھیں علوم عقلی میں عبور اور ذوق ادب و شعر میں امتیاز حاصل رہا۔ یہ علمی اوصاف انھیں اپنے والد مولانا فضل امام خیرآبادی سے ورثے میں ملے تھے، جوان ہی علوم میں اپنی دسترس اور خدمات کے سبب خیرآباد مکتب فکر کے بانی سمجھے گئے، جسے ان کے بعد ان کے لائق فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی نے فروغ و وسعت دی اور ان کے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی نے آگے بڑھایا۔ علامہ فضل حق نے اولاً اپنے والد اور پھر شاہ عبدالقادر دہلوی، فرزند شاہ ولی اللہ دہلوی اور حافظ محمد علی خیرآبادی سے اکتساب فیض کیا تھا، جو خود اپنے زمانے میں علمیت و فضیلت میں ایک امتیاز رکھتے تھے۔ علمی مشغولیات کے ساتھ ساتھ علامہ فضل حق نے ایک بھرپور معاشرتی و سماجی زندگی بھی گزاری۔ ہم عصر علما کے ساتھ ساتھ نامور ادیبوں و شاعروں سے علامہ کے دوستانہ اور قریبی تعلقات استوار رہے، جن کے باعث وہ معاشرتی سطح پر بھی ممتاز و نمایاں رہے۔ علما میں مولانا مملوک العلی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی، مفتی سید رحمت خاں، مولانا عبداللہ خاں، مولوی کریم اللہ اور مولوی نصیرالدین شافعی سے ان کا صحبت و استفادے کا قریبی رشتہ رہا اور شعرا میں غالب، امام بخش صہبائی، شاہ نصیر، حکیم مومن خاں مومن، مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے اکابر ان کے مقربین میں

شامل تھے۔نظریاتی سطح پر جہاں انھوں نے شاہ ولی اللٰہی مکتبِ فکر سے استفادہ کیا تھا وہیں شاہ اسمٰعیل شہید سے ان کے مناظرے ومناقشے بھی ان سے منسوب ہیں۔ ان کی علمی فضیلت اور تبحر علمی کا فیضان ہی تھا کہ دور ونزدیک کے شائقین علم اور طلبہ ان سے استفادہ علمی کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔اس طرح ان کے زیر استفادہ وزیر اثر علما، جہاں جہاں ان کا قیام رہا، ان کے معترف وقائل رہے اور ان سے مستفیض ومستفید ہوتے رہے۔

اپنی اس غیر متنازعہ ومسلمہ علمی حیثیت وفضیلت کے باوجود ہماری علمی تاریخ میں ان کی شخصیت اور ان کا سماجی وسیاسی رویہ اور عمل متنازعہ صورت میں سامنے آیا ہے۔کہاں تو یہ صورت تھی کہ ایک طویل عرصے تک، وہ اپنی مسلمہ علمی حیثیت وخدمات کے باوجود، معاصر اور ایک عرصے بعد تک، مصنفین وتذکرہ نگاروں اور علمی جائزوں ومطالعات کا موضوع نہ بن سکے کہ جس کی وجہ سے اس احساس کو تقویت ملتی رہی کہ جیسے انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہو۔اصولی طور پر تحقیق و تاریخ نویسی میں ہم عصر ماخذ کو بنیادی اہمیت واستناد کا حامل سمجھا جاتا ہے۔بدقسمتی سے علامہ فضل حق کے بارے میں ہم عصر ماخذ اور اسناد نہ ہونے کے مترادف ہیں۔اگرچہ ان کے زمانے میں معاصر علما وفضلا کے متعدد تذکرے اور اجتماعی سوانحی کتب منظر عام پر آئیں، لیکن ایک جامع اور مفصل سوانح عمری تو درکنار، ان میں سے کسی میں علامہ کا مفصل تذکرہ بھی نظر نہیں آتا۔اس کی بظاہر دو تین وجوہات نظر آتی ہیں:

1۔علامہ کے جو تذکرے ان کے زمانے میں یا قریبی عرصے میں تحریر ہوئے، علامہ کے فکری ونظریاتی تناظر سے مناسبت نہ رکھنے والے مصنفین نے لکھے، جنھوں نے انھیں نظر انداز کیا۔

2۔علامہ جنگ آزادی 1857 میں حصہ لینے کی وجہ سے انگریزوں کے 'مجرم' سمجھے گئے تھے، چنانچہ مصنفین نے مصلحتاً انھیں موضوع نہ بنایا، یا اپنے تذکروں میں شامل نہ کیا۔

3۔ان مصنفین میں ایسے افراد بھی تھے جو اس وقت ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے تھے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے حامی تھے، ان کے لیے علامہ فضل حق کا اس وقت کا یہ معروف رویہ پسندیدہ نہ تھا، جس کے نتیجے میں بھی وہ نظر انداز کیے گئے۔

تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں کی احتیاط پسندی یا حکومت کی ناراضگی کے احساس نے

علامہ فضل حق کو اس وقت تک آزادانہ طور پر موضوع بننے نہ دیا جب تک کہ 1935 کے قانون کے تحت ہندوستانیوں کی حکومتیں قائم نہ ہو گئیں۔ اس وقت تک اگر چہ سید احمد خاں کی مؤقر تصنیف ''آثار الصنادید'' اور مولوی کریم الدین کے عربی شعرا کے تذکرے ''فرائد الدہر'' میں اور بلکہ محمد حسین خاں نے بھی اپنے تذکرے ''ریاض الفردوس'' میں علامہ فضل حق کا تذکرہ شامل کیا تھا اور ایسے ہی بعض سوانحی مآخذ میں بھی چند سطری مواد ان پر دستیاب ہے، لیکن جب عبدالشاہد خاں شیروانی نے علامہ کی عربی تصنیف ''الثورۃ الہندیہ'' کو ''باغی ہندوستان'' کے نام سے 1946 میں مرتب کیا اور اردو میں اس کا ترجمہ کیا تو اس پر ایک جامع مقدمہ لکھ کر اس میں علامہ کے تفصیلی حالات بھی تحریر کیے۔ یہ دراصل آغاز تھا علامہ کو بالتفصیل یا علی الخصوص موضوع بنانے کے رجحان کا، جس نے 1957 میں اس وقت مزید توجہ حاصل کی، جب اس سال جنگ آزادی کی صد سالہ تقریبات کا ایک عام اہتمام ہوا اور پھر اس کے بھی نتیجے میں تحریک آزادی پر متنوع چھوٹی بڑی کتابوں اور تحقیقی و تصنیفی منصوبوں کے تحت اعلیٰ معیار کی تصانیف منظر عام پر آئیں۔ لیکن اس ضمن میں علامہ پر ہونے والے مطالعات میں اس وقت ہلچل پیدا ہوئی جب اولاً مولانا امتیاز علی عرشی نے اور پھر مالک رام نے اپنے اپنے مقالات میں، جو قریبی عرصوں ہی میں شائع ہوئے، علی الترتیب نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کے نام علامہ فضل حق کے ایک نجی خط، مخزونہ رضا لائبریری رامپور کی بنیاد پر اور نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ علامہ کے مقدمے کی مسل کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ علامہ نے جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور وہ اس سے دور رہے تھے۔

ان مقالات کی اشاعت نے، جنھیں اپنے وقت کے انتہائی مؤقر اور محتاط محققین نے تحریر کیا تھا اور جو تحقیق کی دنیا میں ایک اعتبار و عزت کے حامل بھی ہیں، علامہ کے ضمن میں مطالعات کو اب اس بحث پر مرکوز کر دیا کہ علامہ نے واقعی جنگ آزادی میں شرکت کی تھی یا نہیں؟ علامہ پر کتابیں اگر چہ متعدد لکھی گئیں اور یہ سلسلہ روز افزوں اور وسیع تر بھی ہے، ان کی علمی خدمات اور حیثیت کے تعین و احاطے سے بڑھ کر زیادہ تر اب ان ہی دو سوالوں پر مرتکز نظر آتا ہے اور سارے مطالعات اور تحقیقات و جائزوں کا منتہائے مقصود یہیں پہنچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے، بلکہ علامہ پر مطالعے کا اصل مقصود بھی اب، کسی اور حیثیت کے تعین سے بڑھ کر، زیادہ تر یہی نظر آتا ہے۔ اس نوع کا

نسبتاً ایک مبسوط اور مفصل مطالعہ مخدومی حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کی تصنیف ''فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون'' ایک مخلصانہ وسنجیدہ تصنیف ہے اور ایسی تصانیف میں نمائندہ ہے جو اس بحث کو اتمام اور اثبات تک پہنچاتی ہیں کہ علامہ نے جنگ آزادی میں شرکت کی تھی۔ ان کے برعکس مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام کے مذکورہ مقالات اور ان کے علاوہ محمد سعید الرحمٰن علوی کی تصنیف ''علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی'' اور افضل حق قرشی کی مرتبہ تصنیف ''مولانا فضل حق خیرآبادی: ایک تحقیقی مطالعہ'' ایسی تصانیف میں قابل توجہ ہیں جن میں علامہ کی شرکت جنگ آزادی پر مثبت رائے سے گریز نظر آتا ہے۔

یہ سلسلہ تا حال رکا نہیں، لیکن ان سب سے قطع نظر حال میں سلمہ سیہول کی تصنیف ''علامہ محمد فضل حق خیرآبادی'' علامہ کے حالات وخدمات پر مفصل اور مبسوط کاوش ہے اور اس سے قبل علامہ پر جو کچھ اہم وغیر اہم مآخذ ومواد مصنفہ کو دستیاب ہوا، ان میں سے اکثر سے استفادہ کرتے ہوئے اسے تحریر کیا گیا ہے اور یہ بڑی حد تک جامع ہے۔ اس کے باوجود تحقیق میں کوئی نتیجہ، کوئی مطالعہ، حرف آخر نہیں ہوتا، مطالعہ وتحقیق کی گنجائش ہر وقت ہر جگہ موجود رہتی ہے، چنانچہ اب ایک تازہ اور اگلا قدم جناب خوشتر نورانی صاحب نے اٹھایا ہے اور ایک ایسے مرحلے پر اس زیر نظر تصنیف کا منصوبہ بنایا ہے جب مخدومی برکاتی صاحب اور محترمہ سلمہ سیہول کی تصانیف میں ان سارے موضوعات کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش نمایاں ہے جو علامہ فضل حق کے تعلق سے زیر بحث رہے ہیں اور ایسے موضوعات بھی کم وبیش سمیٹے جا چکے ہیں جن کا مطالعہ کسی بھی اعتبار سے ضروری تھا۔

خوشتر نورانی صاحب کی زیر نظر تصنیف اور اس کا ارادہ، میرے خیال میں فاضل مصنف کے لیے ایک بڑے چیلنج سے کم نہ تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مذکورہ مؤخر الذکر تصانیف اپنی جگہ اپنے اپنے موضوعات اور ان کے مطالعہ وتحقیق کی حد تک سیر حاصل تصانیف کہی جا سکتی ہیں۔ اب بہت کم گنجائش رہ گئی تھی کہ علامہ کے تعلق سے ان زیر بحث موضوعات پر مزید کوئی اضافہ کیا جا سکے۔ لیکن چونکہ علم وتحقیق اور دید ودریافت اور حصول واخذ نتائج میں ہمیشہ ترمیم وتصحیح، اضافوں اور حک واصلاح کی گنجائش موجود رہتی ہے، اس لیے خوشتر صاحب کی یہ کاوش اسی گنجائش کے ایک واضح ثبوت کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ فاضل مصنف کا اس کتاب کی تصنیف کا یہ فیصلہ بجائے خود اس

امر کا مظہر ہے کہ انھوں نے اس کی تصنیف اور اس کے لیے متعلقہ سارے مواد اور مآخذ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ موضوع یا اس سے متعلقہ موضوعات کا حق ابھی ادا نہیں ہوا ہے۔یعنی یا تو سابقہ سارے مصنفین کی جانب سے اخذِ نتائج میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے یا ان کی جانب سے مباحث کو ان کے صحیح زاویے سے نہیں دیکھا گیا۔یا پھر کوئی اہم ماخذ یا کچھ ضروری مآخذ ابھی تک سابقہ مصنفین کی رسائی سے دور رہے۔اس تصنیف کا خیال اور پھر اسے اس طور پر عملی صورت دینا کہ سابقہ تحقیقات اور مطالعات میں یہ اضافہ بھی سمجھا جائے اور نئی معلومات اور تازہ تجزیہ بھی اس سے حاصل ہو سکے ایک حوصلے و جرأت کا کام تھا۔اس کے ساتھ ساتھ شاید یہ خیال بھی موجزن رہا کہ اس طرح اس سے ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو سکے گا جو حقائق کے منافی ہیں یا سمجھی گئی ہیں۔

یہ تصنیف اگرچہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے سابقہ دیگر تصانیف سے بہت مختلف نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان موضوعات پر خوشتر صاحب نے نئے زاویے سے نظر ڈالی ہے اور سابقہ معروف مآخذ کی نئے انداز سے چھان پھٹک کی ہے اور اپنے تجزیے سے، جو بنظر غائر اور غیر جانبدارانہ بھی ہے، نتائج اخذ کرنے کی ایسی کوشش کی ہے جو اول تو قاری کو سوچنے پر آمادہ کرتا ہے اور پھر اسے قبولیت کی منزل تک لانے کی ایک کامیاب کوشش بھی ہے۔اپنے اس عمل میں خوشتر صاحب انتہائی سنجیدہ و مخلص دکھائی دیتے ہیں کہ دیانت داری کے تقاضے کے تحت انھوں نے تمام دستیاب مآخذ کو حاصل کرنے اور ان سے کما حقہٗ استفادہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور ان تمام مآخذ کی جستجو بھی کی ہے جو تازہ ہیں اور شاید دور افتادہ بھی۔فہرستِ مآخذ اس کا واضح ثبوت ہے کہ کس طرح اور کہاں کہاں سے انھوں نے ان مآخذ کا کھوج بھی لگایا اور ان سے استفادہ بھی کیا جن میں سے متعدد واقعتاً غیر معروف بھی ہیں اور دور افتادہ بھی۔مثال کے طور پر ان کی باخبری کا یہ حال ہے اور جو قابل ستائش بھی ہے کہ وہ رہتے بھارت میں ہیں لیکن انھیں ان کتابوں، رسائل اور مضامین کی اطلاع بھی ہے جو پاکستان کے کونے کھدروں میں شائع ہوئے اور جن سے خود یہاں کے افراد بھی کم ہی واقف ہوں گے۔یہ تحقیق کا کمال ہے کہ کوئی اہم اور ناگزیر ماخذ چھوٹ نہ جائے اور ایک لحاظ سے ہر ماخذ اہم ہو سکتا ہے اور اس بات سے خوشتر صاحب خوب واقف ہیں۔چنانچہ مآخذ کے تنوع اور ان کی جامعیت کے اعتبار سے اس تصنیف کی کتابیات بہت باثروت ہے اور یہ ان کے

کام کے اعلیٰ تحقیقی معیار کا بھی ایک مظہر ہے۔

اب تک علامہ فضل حق پر جو تصانیف منظر عام پر آئی تھیں ان میں معیاری اور اہم تصانیف بھی موجود ہیں اور موضوع یا شخصیت کی اہمیت کے لحاظ سے مزید تحقیقات و مطالعات بھی سامنے آتے رہیں گے، لیکن اس ضمن میں خوشتر صاحب نے اپنی کاوش کے توسط سے متعلقہ مباحث پر مطالعے و تحقیق اور تجزیے کی ایک عمدہ مثال پیش کی ہے جس میں اخلاص بھی ہے اور جستجو و محنت بھی جو ایک جانب کئی خلا بھی پر کرتی ہے اور دوسری جانب کئی مباحث کو اس انجام تک پہنچاتی ہے کہ مزید شاید ان پر کوئی نظر ڈالنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ خوشتر صاحب نے اس میں خیرآباد کے علم و فن اور دیگر ضمیموں کے اہتمام سے اس تصنیف کو مزید مفید و معلوماتی حیثیت دے دی ہے جو ان کے علمی ذوق کا اضافی ثبوت ہے۔ ان اوصاف اور خصوصیات کے باعث خوشتر صاحب کی اس تصنیف کو علامہ فضل حق خیرآبادی کی شخصیت و خدمات علمی و سیاسی کو سمجھنے کے لیے ناگزیر سمجھا جانا چاہیے۔

معین الدین عقیل

صدر: شعبۂ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد (پاکستان)

تاثرات وجائزے

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی
ماہنامہ "شب خون" رانی منڈی، الہ آباد (یوپی)

آپ کی نہایت عمدہ کتاب "علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات" کچھ دن پہلے ملی تھی۔ آپ نے حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے علاوہ ان کے والد ماجد حضرت علامہ فضل امام خیرآبادی کے بارے میں بھی بہت سی معلومات جمع کر دی ہیں۔ افسوس کہ ان کے اعقاب میں کوئی بھی شخص قابل ذکر نہیں رہا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کا فتوئی انگریزی حکومت کے بارے میں بھی آپ نے کتاب میں ترجمے کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس طرح ایک اہم دستاویز محفوظ ہو گئی۔ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی اور 1857 کے معرکے میں ان کے کردار کے بارے میں آپ نے حرف آخر لکھ دیا ہے۔ اس کے لیے آپ کو اللہ جزائے خیر دے گا۔ مجموعی طور آپ کی کتاب بے حد قابل قدر ہے اور میں نے اسے اپنے کتب خانے میں محفوظ کر لیا ہے، ورنہ زیادہ تر کتابیں میں یہاں کی لائبریریوں میں دے دیتا ہوں۔

□□□

حکیم سید محمود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی، کراچی (پاکستان)

محترم جناب خوشتر نورانی نے یہ کتاب بڑی محنت کر کے مرتب کی ہے، ایک مجاہد حریت اور ایک امام وقت کی سوانح کے اوجھل گوشوں کی تحقیق میں جو کاوش کی ہے وہ اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام تحریروں میں اپنے معیار تحریر و تحقیق کے لحاظ سے فائق ہے، میں نے اسے بار بار پڑھا ہے اور خوشتر صاحب کی سعی بلیغ کے ثمرات پر جھوم گیا ہوں- واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے نام نہاد محققین کے سامنے حجت تمام کر دی ہے، حضرت فضل حق کے تمام معتقدین کی طرف سے وہ شکریے کے مستحق ہیں، اس فقیر بے مایہ خیر آبادی کی طرف سے بھی خوشتر صاحب ہدیہ تبریک و تحسین قبول فرمائیں- یہ کتاب پڑھ کر امید پیدا ہو گئی ہے کہ اب اس موضوع پر سنجیدہ تحریروں کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے اور مخالفانہ تحریروں کا سلسلہ بھی بند ہونے والا ہے اور عقیدت مندانہ اور بے اصل و ناقابل قبول قصص و روایات کا باب بھی بند ہو جائے گا- انشاء اللہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جہاد حریت کے موضوع سے فراغت پا کر اب ان کے علوم پر ارباب علم توجہ فرمائیں گے اور منطق، کلام، الٰہیات میں مولانا اور ان کے حلقے کے فضلا کی خدمات پر تحقیق کی جائے گی، ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی طباعت کی جائے گی اور ان کے تراجم کیے جائیں گے- ◻◻◻

خواجہ رضی حیدر

سابق ڈائرکٹر: قائد اعظم اکیڈمی، کراچی (پاکستان)

امام علوم و فنون مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی اپنے علمی اور عملی کارہائے مثالی کی بنا پر مجھے ہند اسلامی تہذیب کے ایک ایسے آخری نمائندہ فرد نظر آتے ہیں جنھوں نے 1857 کی جنگ آزادی سے قبل بھی اور بعد ازاں دوران اسیری بھی برصغیر کے مجہول اور زوال آمادہ معاشرے میں ''پورا آدمی'' ہونے کا ثبوت دیا- بقول ماہرین عمرانیات ''پورا آدمی'' حقیقت مطلق سے گہری وابستگی کے بغیر وجود میں نہیں آتا ہے- گویا علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنی دینی روایت سے پیوست رہ کر مذہب کے نافع ثقافتی عناصر اور معتقدات کا، جو ہند اسلامی تہذیب کا خاصہ تھے، بکمل

دفاع کیا، جبکہ اس دور کے بیشتر علمانہ صرف نجدی ثقافتی مظاہر اور عقائد کے نفاذ کے لیے تازہ وارد انگریز حکمرانوں سے مصالحت اور سودے بازی کے ثمرات سمیٹ رہے تھے یعنی مذہبی منظر پر ''کسری آدمی'' کے طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ ان افراد نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر اس تہذیبی اکائی کو توڑ دیا تھا جو صدیوں سے ہند اسلامی تہذیب کی نمائندہ تھی۔ یہ بہت ابتلا اور آزمائش کا وقت تھا اور اس وقت میں اگر علامہ فضل حق خیرآبادی اپنی زندگی کو داؤں پر لگا کر Devotional Islam کی حفاظت کا فریضہ انجام نہ دیتے تو عقائد اہل سنت کی تاثیر اپنی اس جولانی سے ہم کنار نہ ہوتی جو آج پوری دنیا میں دلوں کو مسخر کر رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ مابعد تاریخ میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی مساعی کو تاریخی تسلسل سے خارج کرنے کی مسلسل اور منظم کوششیں کی گئیں، لیکن حساس قلم کاروں کی تحقیقی کاوشوں سے بالآخر ''فضل حق'' عام ہو گیا۔ ادھر کچھ عرصے سے ایسی تصانیف منظر عام پر آ رہی ہیں جن کے آئینے میں علامہ فضل حق ''پورے آدمی'' کے طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ خصوصاً محترم خوشتر نورانی نے جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں مستند تاریخی مواد، دستاویزی ذخائر، بنیادی تفصیلات اور غیر مطاہر اندراجات کا نہایت نکتہ سنجی اور تاریخی بصیرت سے تجزیہ اور تعاقب کر کے پیش نظر کتاب میں علامہ خیرآبادی کی جو سچی اور حقیقی تصویر پیش کی ہے وہ یقیناً ان کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے جہاں محققین کے غیر مذکی رویوں اور تعصبات کا پردہ چاک ہوگا وہاں تجزیاتی، توضیحی اور منطقی انداز میں تاریخ نویسی کے جدید رجحان کو بھی مقبولیت حاصل ہوگی۔ خوشتر نورانی کا قلم رواں اور اسلوب موثر ہے۔ میں اس ٹھوس علمی اور تحقیقی کارنامے پر ان کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ □□□

پروفیسر اسد قادری احمد

پروفیسر: واشنگٹن یونیورسٹی، سینٹ لوئس (امریکہ)

''خیرآبادی مکتب فکر'' پر لکھی جانے والی اس کتاب کی اشاعت ایک بہت ہی خوش آئند قدم ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس کے فاضل مصنف مولانا خوشتر نورانی نے خیرآبادی خانوادے کی علمی اور معاشرتی تاریخ سے متعلق اصل مصادر، قلمی نسخوں اور مخطوطات سے

براہ راست استفادہ کیا ہے۔ مولانا نے قاری کو کچھ نایاب مواد بھی فراہم کیا ہے جو اصل عربی و فارسی زبان میں بھی ہے اور ان کے اردو تراجم بھی دے دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ صراحت بھی کردی گئی ہے کہ یہ مواد کس ذخیرے میں، کس کتب خانے میں، کہاں موجود ہے۔ مصنف نے مواد کی تلاش میں مختلف مقامات کا سفر کیا ہے اور اپنے تجربات کو بہت دلچسپ اور بامعنی انداز میں بیان کردیا ہے۔ جس نکتہ سنجی اور احتیاط کے ساتھ مباحث کا تجزیہ کیا گیا ہے، یہ موجودہ دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس کتاب سے علمی دنیا کی بڑی خدمت ہوگی اور آنے والے محققین کے لیے ''خیرآبادیات'' پر تحقیق کی مزید بنیادیں فراہم ہوں گی۔ اس کتاب کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب جنوبی ایشیا کی اسلامی تاریخ کے حوالے سے لکھی جانے والی تحریروں کے اس عام عیب سے پاک ہے جن میں فرقہ وارانہ اور مسلکی معاملات کو ابھار کر گفتگو کو بوجھل اور غیر سنجیدہ بنادیا جاتا ہے۔ مولانا خوشتر نورانی کی گفتگو خالص علمی اور تاریخی ہے۔ ◻◻◻

ماہنامہ ''اردو دنیا''

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

علامہ فضل حق خیرآبادی کے حوالے سے اب تک جو تحقیقی بحثیں ہو چکی ہیں، خوشتر نورانی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں نئے زاویۂ نگاہ اور نادر و نایاب مواد کی پیش کش سے ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اس کتاب میں فضل حق خیرآبادی کے دو عربی قصائد، قصیدۂ نونیہ اور رائیہ کی نہ صرف بازیافت کی ہے، بلکہ ان کے اردو تراجم اور تلخیص بھی پیش کیے ہیں، جن سے انگریزوں کی مذمت اور ان کے خلاف فتوئ جہاد کی تصدیق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیقی مسئلے پر یہ ایک نیا حوالہ ہے۔ اس کے علاوہ فضل حق شناسی میں خوشتر نورانی کا ایک اور اہم اضافہ یہ ہے کہ انھوں نے ''توقیت فضل حق'' کی ترتیب میں بڑی تحقیقی دقت رسی کا مظاہرہ کیا ہے۔

خوشتر نورانی صاحب معروف عالم اور صحافی ہیں، انھوں نے اس کتاب میں تجزیاتی، استدلالی اور منطقی اسلوب کو قائم رکھنے کی بہت حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت جو ہر سنجیدہ قاری کو متاثر کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں حواشی، ضمیمے اور حوالوں کا اہتمام کیا گیا ہے، جس سے مصنف کے محققانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے اس کتاب سے فضل حق خیر آبادی ہی نہیں، بلکہ 1857 کے معرکے پر نئے زاویے سے تحقیق و جستجو کار۔جحان فروغ پذیر ہوگا۔□□□

ماہنامہ "اردو بک ریویو"

پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب اس اعتبار سے اہم قرار دی جا سکتی ہے کہ اس میں فاضل مصنف نے تحقیق کے عصری مآخذ کو بروئے کار لاتے ہوئے تحقیق کا فریضہ ادا کیا ہے اور سلجھے ہوئے انداز میں نقد بھی کی ہے۔

جن محققین اور اہل قلم نے مختلف اسالیب میں علامہ پر شبہات وارد کیے، ان میں مصنف کے بقول نمایاں ناقدین میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، غلام رسول مہر، پروفیسر ایوب قادری، ڈاکٹر ثریا بتول ڈار اور شمیم طارق خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مصنف نے بڑے محققانہ اسلوب میں نہ صرف ان ناقدین کے شبہات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ اپنے طرز استدلال سے عہد حاضر کے تحقیقی انداز اور رویے پر سوالیہ نشان بھی قائم کر دیا ہے۔ یہ پورا باب لائق مطالعہ ہے۔ اس طرح مصنف نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معرکۂ ستاون کا فتویٰ جہاد جنرل بخت خاں کے مشورے پر علامہ کی طرف سے تھا۔ ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے ان چند نامور اور ممتاز علما میں ہوتا ہے، جن کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ ان کی ایک امتیازی حیثیت کا تعلق علم و فضل سے تھا اور دوسرے کا اعلائے کلمۂ حق سے۔ مصنف نے شبہات پیدا کرنے والے محققین اور ناقدین کی خدمت میں بڑے معروضی اور علمی و تحقیقی انداز میں اپنی معروضات پیش کی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ خیر آبادی کی علمی اور انقلابی شخصیت کو رام پور کے ایک ہم نام "سید فضل حق" کے ذریعے بھی شبہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس باب میں بھی مسکت علمی جواب دیا ہے۔

اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب یقینی طور پر تحقیق کے نئے گوشے وا کرتی ہے اور اردو کے تاریخی لٹریچر میں قیمتی اضافہ ہے۔□□□

پروفیسر سید حسین الحق

صدر: شعبۂ اردو/ پروکٹر، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

''علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات'' پڑھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ عام طور پر علما اور مذہبی پس منظر رکھنے والوں کے بارے میں ایک خیال ہے کہ یہ لوگ جذبات اور اشتعال سے اپنے کو بچا نہیں پاتے ہیں۔ لیکن یہ کتاب اتنے غیر جذباتی، معروضی اور تحقیقی اوصاف سے متصف ہے کہ یقیناً اس کا شمار اردو کی اعلیٰ تحقیقی کتب میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا عرشی، مالک رام اور دوسرے متبعین مالک و عرشی کے نام نہاد مفروضات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی گئی ہیں۔ مگر اس کے باوجود مولانا خوشتر نورانی کا بیانیہ کہیں بھی لڑکھڑایا نہیں ہے۔

دفاعی ہونے میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ دفاع کرنے والے کو معتذر نہیں ہونا پڑتا۔ پس خوشتر نورانی بھی کہیں معتذر نہیں ہیں۔ یہ اچھی بات ہے، مگر اس سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ وہ معترض بھی بہت کم ہوئے ہیں۔ تحقیق میں ان کا اسلوب ''استفہامیہ اسلوب'' ہے یا ''انکشافی''، وہ غلط بات کے مقابل ایک صحیح بات رکھ دیتے ہیں یا غلط بات پر ایسا سوال کھڑا کرتے ہیں کہ سامنے والا بغلیں جھانکتا پھرے اور اپنا پہلو بچاتا پھرے۔ بلاشک وشبہ ''علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات'' علامہ پر ایسی معیاری اور معتبر تحقیقی کتاب ہے، جس کے بعد ذکر خیرآبادی کی محفل میں معتقدین چین سے بیٹھیں گے، متشککین پہلو بدلیں گے اور مخالفین کچھ کہہ نہ پائیں گے۔ اس کتاب نے ایک مصرعے کو ذرا بدل کر پڑھنے کے مواقع فراہم کردیے ہیں۔ میں تو اب اسے یوں ہی پڑھوں گا:......ع

نوا را شیرتری کن چوں ذوق نغمہ کم یابی

□□□

توقیت فضل حق

(ولادت سے وفات تک)

1212ھ/1797	علامہ فضل حق خیرآبادی حنفی ماتریدی چشتی کی ولادت قصبہ خیرآباد ضلع سیتاپور (موجودہ) صوبہ اتر پردیش میں ہوئی۔☆
1803	لارڈ لیک کی کمان نے دہلی پر دھاوا بولا اور اس پر قابض ہو گئی۔ایک معاہدے کے تحت کمپنی کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے شاہ عالم ثانی کی بادشاہت کو لال قلعے تک محصور کر دیا اور عملاً سارے ہندوستان پر انگریز حکومت کرنے لگے۔سقوط دہلی کے بعد علامہ کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی دہلی تشریف لائے اور تدریس کا آغاز کیا، جلد ہی

☆32 واسطوں سے علامہ فضل حق خیرآبادی کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت عمر فاروق کی اولاد میں دو حقیقی بھائی بہاء الدین اور شمس الدین ایران سے ہندوستان آئے، شمس الدین نے رہتک کی مسند افتا سنبھالی اور بہاء الدین بدایوں میں فروکش ہوئے۔شمس الدین کی اولاد سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خاندان ہے، جبکہ بہاء الدین کی اولاد سے علامہ فضل حق خیرآبادی کا خاندان ہے۔ علامہ خیرآبادی اور شاہ ولی اللہ کے خاندانوں میں قرابت داری تھی، اس لیے چودہ واسطوں کے بعد دونوں کا سلسلۂ نسب ایک ہو جاتا ہے۔بارھویں اور تیرھویں صدی میں علم و فضل اور دینی خدمات کے حوالے سے دونوں خاندان ممتاز رہے ہیں۔

ان کے معقولات کی تدریس کا ڈنکا بجنے لگا۔ محققین کا خیال ہے کہ اسی زمانے میں علامہ بھی دہلی آگئے اور اپنے والد سے معقولات کا درس لینے کے ساتھ علم حدیث کی تحصیل کے لیے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے جہاں ان کے ہم درس مفتی صدرالدین آزردہ تھے۔

1806/7 سقوط دہلی کے بعد انگریزی نظم ونسق قائم ہوا اور انگریزوں نے عدالتوں کی تنظیم کی تو علامہ کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی مفتی عدالت مقرر ہوئے اور اس کے بعد دہلی کے پہلے صدر الصدور (سب جج) ہوئے۔

1225ھ/1810 علامہ فضل حق خیرآبادی نے تیرہ سال کی عمر میں درس سے فراغت حاصل کی، چار ماہ میں قرآن کریم حفظ کیا اور سلسلۂ چشتیہ میں حضرت دھومن دہلوی سے بیعت ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی تدریس کا آغاز کردیا۔ علمی شوکت اور فکری دبدبے کی وجہ سے انھیں جلد ہی شہرت مل گئی۔ قیام دہلی میں جو لوگ علامہ کے شاگرد ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے: حکیم امام الدین دہلوی (طبیب اکبر شاہ ثانی و بہادر شاہ ظفر)، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا نورالحسن کاندھلوی، حکیم نورالحسن امروہوی، نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں، مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی، منشی دادار بخش پنجابی، مولوی غلام قادر گوپاموی، ملا فتح الدین لاہوری۔

1231ھ/1816 انیس سال کی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور سررشتہ دار عدالت دیوانی (کچہری چیف) مقرر ہوئے۔

29 ربیع الثانی 1240ھ/1824 شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب "تقویۃ الایمان" کی قابل اعتراض عبارتوں پر دہلی کی جامع مسجد میں تاریخی مناظرہ ہوا، جس میں بقول مولانا ابوالکلام آزاد "ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی تھے

	اور دوسری طرف تمام علمائے دہلی۔" ان علمائے دہلی میں علامہ خیرآبادی کے ساتھ شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا مخصوص اللہ دہلوی اور شاہ محمد موسیٰ دہلوی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔
18 رمضان 1240ھ/ 1825	علامہ نے مسئلہ امکان نظیر اور مسئلہ شفاعت پر شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب 'تقویۃ الایمان' کے خلاف فتویٰ کفر صادر فرمایا جو "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے منظر عام پر آیا، اس فتوے پر دہلی کے مشاہیر علما مولانا مخصوص اللہ دہلوی، مولانا محمد موسیٰ دہلوی اور مولانا احمد سعید نقشبندی کے علاوہ مفتی صدر الدین آزردہ نے بھی تائیدی دستخط فرمائے۔
1825 تا 1829	غالب مقدمۂ جائیداد کے سلسلے میں کلکتہ میں مقیم تھے، اس عرصے میں علامہ کے نام انھوں نے متعدد خطوط لکھے۔
1242ھ/ 1827	مولانا فضل امام خیرآبادی دہلی میں صدالصدور کی ملازمت سے مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ ان کے شاگرد مفتی صدر الدین آزردہ دہلی کے صدر الصدور مقرر ہوئے۔
1243ھ/ 1828	علامہ کے قابل فخر فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کی ولادت ہوئی۔☆
1243ھ/ 1828	20 فروری 1828 کو مرزا غالب مقدمہ جائیداد کے سلسلے میں کلکتہ پہنچے، جہاں 20 جون 1828 کو ان سے کہا گیا کہ وہ ضابطے کے مطابق اپنا مقدمہ دہلی کے ریزیڈنٹ کے توسط سے پیش کریں، وہ اس کام

☆ علامہ نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی زوجہ بی بی وزیرن سے تین صاحبزادیاں، بی بی سعید النساء حرماں، بی بی نجم النساء، بی بی محمور النساء اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی ہوئے۔ علامہ کی دوسری زوجہ دہلی کی تھیں، ان کا نام امراؤ بیگم تھا، ان سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق ہوئے۔ علامہ کی دونوں شادیوں کی تاریخ دستیاب نہیں مل سکے۔ پہلی زوجہ سے مولانا عبدالحق کی اولادیں تو خیرآباد میں ہی ہیں، دوسری زوجہ سے مولوی شمس الحق کی دختری اولاد دہلی میں ہے جب کہ مولوی علاء الحق کی اولادیں بھوپال میں ہیں۔

کے لیے دہلی نہیں جا سکتے تھے، اس لیے اپنے ''محسن'' علامہ کو مدد کے لیے خط لکھا، علامہ نے اس مقدمے کی پیروی کے لیے پنڈت ہیرا لال کو مقرر کر دیا۔

5 ذی قعدہ 1244ھ/ 1829 — علامہ کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی انتقال فرما گئے۔ مولانا فضل امام کی وفات پر پہلی بار غالب نے قطعۂ تاریخ کہا:

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل　　کرد سوئے جنت الماویٰ خرام

چوں ارادت از پئے کسب شرف　　جست سال فوت آں عالی مقام

1245ھ/ 1831 — ناقدری حکام اور طبعاً ناپسندیدگی کی وجہ سے کمپنی کی ملازمت (سررشتہ داری عدالت دیوانی دہلی) سے استعفا دے دیا۔

1246ھ/ 1832 — والیِ جھجھر نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر ملازمت کے لیے علامہ جھجھر چلے گئے، جہاں نواب نے آپ کے لیے پانچ سو روپے مشاہرہ برائے مصارف خدام مقرر کیا۔

1835 تا 1840 — رئیس جھجھر نواب فیض محمد خاں کا 16 اکتوبر 1835 میں انتقال ہوا، اس کے بعد علامہ جھجھر کو چھوڑ کر ملازمت کے سلسلے میں الور چلے گئے، وہاں سے سہارن پور اور پھر ٹونک۔ قیام سہارن پور کے تلامذہ کے نام یہ ہیں: مولوی عبدالرزاق سہارنپوری، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولوی محمد اکبر وغیرہ۔

1840 تا 1846 — نواب محمد سعید خاں ریاست رام پور میں تخت نشیں ہوئے تو ان کی دعوت پر رام پور چلے گئے، جہاں پہلے کتابوں کے ترجمے اور تالیف پر مقرر کیے گئے نیز نواب صاحب کے صاحبزادگان نواب محمد یوسف علی خاں اور نواب محمد کاظم علی خاں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ پھر محکمۂ نظامت اور اس کے بعد مرافعہ عدالتین (دیوانی و فوجداری) کے حاکم مقرر کیے گئے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں

سے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے اکتساب علم وفن کیا- قیام رام پور میں جو لوگ علامہ کے شاگرد ہوئے ان کی فہرست طویل ہے، چند خاص نام یہ ہیں: مولانا عبدالحق خیرآبادی، صاحبزادی بی بی سعید النساء حرماں، مولانا ہدایت اللہ جونپوری، نواب یوسف علی خاں، نواب کاظم علی خاں، مولانا عبدالعلی خاں، مولوی ہدایت علی بریلوی، مولوی احمد حسن مرادآبادی، مولوی سلطان حسن خاں وغیرہ-

فروری 1847	سلطنت اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو علامہ رام پور سے لکھنؤ بلا لیے گئے اور "کچہری حضور تحصیل" کے مہتمم مقرر کیے گئے نیز انھیں صدر الصدور کا عہدہ بھی دیا گیا- علامہ لکھنؤ میں تقریباً نو سال مقیم رہے، اس عرصے میں جن لوگوں نے آپ سے اکتساب علم وفن کیا ان میں چند نام یہ ہیں: مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا نور احمد عثمانی بدایونی، مولانا محمد محسن ترہتی، مولانا سید عبداللہ بلگرامی، مولانا عبدالحق کانپوری وغیرہ-
1264ھ/1848	مفتی صدرالدین آزردہ نے روضہ رسول ﷺ کی زیارت کے موضوع پر "منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال" نامی رسالہ تصنیف فرمایا، اس پر علامہ نے تقریظ لکھی-
1269ھ/3-1852	شاہ اسماعیل دہلوی کے ایک حامی سید حیدر علی ٹونکی کے خلاف امکان کذب وامتناع نظیر کے مسئلے میں علامہ نے فتویٰ لکھا-
1270ھ/4-1853	مولانا فضل رسول بدایونی نے عربی زبان میں علم کلام وعقائد کی معرکہ آرا کتاب المعتقد المنتقد تصنیف فرمائی، اس کتاب پر مفتی صدرالدین آزردہ کے ساتھ علامہ نے بھی تقریظ لکھی-
نومبر 1855	لکھنؤ کے قریب اجودھیا میں مغل بادشاہ بابر کے ذریعے بنائی گئی مسجد جسے بعد میں ہندوؤں نے ختم کر کے اس سے متصل ہنومان گڑھی

بنائی تھی، صدیوں کے بعد کچھ مسلمانوں نے اس مسجد کے احیا کی کوشش شروع کردی، ہندوؤں نے مزاحمت کی تو مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کے لیے نکل کھڑی ہوئی جس میں ڈھائی سو سے زائد مسلمان شہید ہوگئے۔حاکم اودھ واجد علی شاہ نے اس قضیے کے حل کے لیے چار ثالثوں پر مشتمل ایک مجلس مصالحت تشکیل دی، جس کے ایک رکن علامہ بھی تھے۔

4رفروری 1856	انگریزی سرکار نے واجد علی شاہ کو معزول کیا اور اودھ کی خودمختاری کو ختم کر کے اسے کمپنی کے مقبوضات میں شامل کرلیا۔
فروری 1856	اودھ پر کمپنی کے قبضے کے بعد علامہ اپنی ملازمت چھوڑ کر لکھنو سے راجہ بنے سنگھ کی دعوت پر الور چلے گئے، جہاں آپ تقریباً ڈیڑھ سال ملازمت میں رہے۔
27رجنوری 1857	علامہ نے مرزا غالب کو خط لکھا کہ سرکار (والی رام پور نواب یوسف علی خاں) کی خدمت کے لیے کمربستہ ہوجایئے اور اصلاح اشعار کا کام انجام دیجیے، اس سے قبل علامہ غالب کی مالی مشکلات دور کرنے کے لیے نواب صاحب کو راضی کرچکے تھے۔
5رفروری 1857	علامہ کی سفارش اور کوشش سے والی رام پور نواب یوسف علی خاں کے استاذ کی حیثیت سے مرزا غالب کا تقرر ہوا۔
10رمئی 1857	میرٹھ سے ستاون کی جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔
مئی 1857	معرکۂ ستاون کا آغاز ہوا تو علامہ بادشاہ کی دعوت پر ملازمت چھوڑ کر جنگ میں عملی و فکری شرکت کے لیے الور سے دہلی آگئے۔
11رمئی 1857	مجاہدین نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔
12رمئی 1857	مجاہدین کی رسدرسانی کے انتظام کے لیے قلعے میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی جس میں علامہ بھی شامل ہوئے۔علامہ نے بہادر شاہ سے مجاہدین کی مالی اعانت کے لیے کہا تو بادشاہ نے خزانہ خالی

اور مال گزاری وصول نہ ہونے کا عذر کیا۔اس پر علامہ نے تحصیل داری اور رسد کی فراہمی کے لیے اپنے صاحبزادے عبدالحق اور دوسرے اعزہ کا نام پیش کیا، بادشاہ نے منظور کیا اور علامہ کے داماد کے حقیقی بھائی میر نواب کو دہلی کا گورنر اور بعد میں مولانا عبدالحق خیر آبادی کو گڑگاؤں کا کلکٹر مقرر کیا گیا۔

مئی، جون 1857 — علامہ نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کو دستوری حکومت اور آئینی بادشاہت میں تبدیل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک دستور العمل بنایا، جس کا نفاذ بھی عمل میں آیا۔

جون، جولائی 1857 — علامہ نے سلطنت کا جو دستور العمل بنایا تھا اس کے نفاذ کے لیے ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی، علامہ اس کے رکن اور نگراں بنے۔

18/اگست 1857 — علامہ بہادر شاہ ظفر سے ملے اور جنگ کے انتظامی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔

19/اگست 1857 — علامہ شریک دربار ہوئے اور براہ راست انتظام سنبھالنے کے خواہش مند ہوئے۔

19/ستمبر 1857 — دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

19 تا 24 ستمبر 1857 — علامہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بھوکے پیاسے گھر میں بند رہے۔

24 ستمبر 1857 — دہلی کی تاراجی کے بعد علامہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنا بیش قیمت اسباب اور نادر کتب خانہ چھوڑ کر دہلی سے نکل گئے۔

نومبر 1857 — بڑی مشکلوں اور مصیبتوں کے ساتھ علی گڑھ اور رام پور ہوتے ہوئے تقریباً دو ماہ کے بعد علامہ اپنے وطن خیر آباد پہنچے۔

دسمبر 1857 تا وسط مارچ 1858 — علامہ نے خیر آباد میں قیام کیا۔

14/مارچ 1858 — لکھنؤ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور بیگم حضرت محل اور مجاہدین لکھنؤ

	خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔
مارچ1858	بیگم لکھنؤ سے نکل کر سیتاپور پہنچیں اور یہیں علامہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور یہ قافلہ سیتاپور سے نکل کر بونڈی ضلع بہرائچ پہنچا۔
اپریل تا نومبر 1858	علامہ بونڈی، کھیڑی، ہرگاؤں، تنبول، سہور پور اور دریہ میں مقیم رہے اور مجاہدین کی معاونت کرتے رہے۔
نومبر 1858	ہر محاذ پر انگریزوں نے فتح حاصل کی۔ ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان شائع کیا اور اس کی مہلت 30 دسمبر تک دی کہ اس مدت میں جو بھی باغی باغیانہ سرگرمیوں سے باز آئے گا اسے نہ گرفتار کیا جائے گا اور نہ سزا دی جائے گی۔
دسمبر 1858	اعلان معافی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے وسط دسمبر میں علامہ اپنے وطن خیرآباد لوٹ گئے۔
26دسمبر 1858	خیرآباد پہنچ کر علامہ کرنل کلارک سے ملے، کرنل نے انھیں ڈپٹی کمشنر کی تحویل میں دیے جانے کا حکم دیا۔
30دسمبر 1858	ڈپٹی کمشنر سے مل کر علامہ اپنے گھر میں مقیم گویا نظر بند ہو گئے۔
30جنوری 1859	اعلان معافی کے برخلاف علامہ کو گرفتار کر کے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔
21فروری 1859	کیپٹن ایف اے وی تھربرن (F.A.V. Thurburn) کی عدالت میں مقدمہ شروع ہوا۔
28فروری 1859	کیپٹن تھربرن نے فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشیل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔
4مارچ 1859	جوڈیشیل کمشنر مسٹر جارج کیمبل (G.Cambell) اور میجر بارو (Barrow) قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت نے علامہ کو باغی قرار دیتے ہوئے ان کی جائیداد کی ضبطی اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا فیصلہ سنایا۔

4/مارچ تا مئی 1859	فیصلے کے بعد علامہ لکھنؤ کی جیل میں قید رہے۔
مارچ، اپریل 1859	علامہ نے سزا کے فیصلے کے بعد گورنر جنرل کے پاس رہائی کی اپیل کی جو نامنظور ہوئی۔
مئی 1859	علامہ کو لکھنؤ سے کلکتہ کے علی پور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔
مئی، جون 1859	کلکتہ میں مولوی فضل الرحمٰن قاضی القضاۃ کلکتہ اور دیگر عمائدین کلکتہ نے ڈیڑھ سو اصحاب کے دستخط کے ساتھ حکومت کو رہائی کی درخواست لکھی، لیکن حکومت نے اسے بھی نامنظور کر دیا۔
8/اکتوبر 1859	علامہ کو کلکتہ سے ''فائر کوئین'' نامی جہاز سے پورٹ بلیئر جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیا گیا۔
9/جنوری 1860	جزیرۂ انڈمان پہنچ کر علامہ نے وزیر ہند کے نام اپنی رہائی کی درخواست لکھی۔ وزیر ہند نے یہ درخواست مقامی حکام کو بھجوا دی۔
1276ھ/1860	علامہ نے جزیرۂ انڈمان میں قید کے دوران جنگ آزادی کے اسباب و واقعات اور قید میں اپنے مصائب و آلام کے ذکر پر مشتمل ایک رسالہ ''رسالۂ غدریہ'' (الثورۃ الہندیہ) اور دو طویل قصائد (ہمزیہ اور دالیہ) لکھے۔
30/جولائی 1861	وزیر ہند کے نام علامہ کی بھیجی ہوئی درخواست کو خیرآباد ڈویژن سے چیف کمشنر اودھ لکھنؤ کو بھجوا دی گئی۔
12/اگست 1881	چیف کمشنر اودھ لکھنؤ نے وزیر ہند کے نام علامہ کی بھیجی ہوئی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے جواب لکھا کہ اگر مولوی فضل حق کے سلسلے میں کچھ بھی رعایت کی گئی تو وہ اس کی سختی سے مخالفت کریں گے۔
12 صفر 1278ھ/ 20 اگست 1861	علامہ جزیرۂ انڈمان میں انتقال فرما گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔

□□□

تحقیق کے دو پیمانے

علامہ فضل حق خیرآبادی تاریخ کی ایک ایسی مظلوم شخصیت کا نام ہے جس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور کارناموں کو مؤرخین اور محققین کی کرم فرمائیوں نے شکوک وشبہات کے دائرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ ان شکوک وشبہات کا تعلق حسب ذیل امور سے ہے:

1- معرکۂ ستاون میں علامہ خیرآبادی کی شرکت 2- معرکۂ ستاون میں انگریزی سرکار کے خلاف ان کا فتویٔ جہاد 3- جزیرۂ انڈمان میں علامہ کی قبر کی تعیین 4- مقدمہ میں ان پر عائد کردہ الزامات کی حقیقت 5- جرم بغاوت کی سزا کے بعد ان کی رہائی کا مسئلہ 6- معرکۂ ہنومان گڑھی میں مجاہدین کے خلاف فتویٔ جہاد کا معاملہ 7- شاہ اسماعیل دہلوی سے علامہ کے نزاع کی نوعیت اور تعلقات 8- اور علامہ کا شخصی کردار۔

علامہ کی زندگی کے یہ وہ پہلو ہیں جن پر جزوی یا کلی طور پر بہت سے محققین اور اہل قلم نے مختلف اسالیب میں شبہات وارد کیے ہیں۔ علامہ کے ان ناقدین میں چند نمایاں نام یہ ہے:

مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، غلام رسول مہر، پروفیسر ایوب قادری، ڈاکٹر ثریا بتول ڈار اور شمیم طارق۔

علامہ کے مذکورہ ناقدین کے شبہات کا ازالہ ہند وپاک کے متعدد نامور ”فضل حق شناسوں“

نے علمی وتحقیقی اسلوب میں کرنے کوشش کی ہے۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں جن شبہات کا ازالہ اب تک نہیں ہوسکا ہے ان پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ مذکورہ محققین میں سے اکثر میں قدر مشترک پہلو یہ ہے کہ جہاں ان حضرات نے علامہ فضل حق خیرآبادی کے سلسلے میں بساط تحقیق بچھائی ہے وہیں سید احمد رائے بریلوی (1201ھ/1246ھ) اور ان کی تحریک کے حوالے سے بھی اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ ان تحقیقات کے مطالعے کے بعد ان محققین کی فاضلانہ اور محققانہ بصیرت افروزی کا معترف ہونا پڑتا ہے، لیکن اس سلسلۂ تحقیق میں ایک چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ مذکورہ دونوں شخصیات (علامہ فضل حق خیرآبادی اور سید احمد رائے بریلوی) کے تعلق سے متعدد تحریریں پڑھ کر ان محققین کے ایک اور قدر مشترک پہلو کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے مذکورہ دونوں شخصیات پر کلام کرنے میں اپنی تحقیقات کے دو پیمانے بنا رکھے ہیں۔ ان حضرات نے ان دونوں کے لیے تحقیق کے دو الگ الگ پیمانے کیوں مقرر کیے ہیں؟ اس کا جواب ہمیں اب تک نہیں مل سکا ہے۔ تاہم اس کیوں کا جواب نہ ملنے کے باوجود اتنا ضرور ہوا ہے کہ تحقیق کے اس دہرے رویے کی وجہ سے علامہ خیرآبادی پر وارد کیے گئے شبہات اہل علم کے نزدیک زمرۂ تحقیق سے باہر نکل کر ''مسلکی تفریق'' کے خانے میں آگئے ہیں۔

تحقیقات کے ان دونوں پیمانوں کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ پہلی بار علامہ خیرآبادی کی تفصیلی سوانح ''باغی ہندوستان'' 1947 کے اوائل میں مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ اس سے قبل علامہ کی شہرت ایک متکلم، فلسفی، منطقی، ادیب اور مفکر کی حیثیت سے تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد پہلی بار اہل علم کے درمیان علامہ کا تعارف ایک سرگرم مجاہد آزادی کی حیثیت سے ہوا۔ علامہ کی زندگی کا یہ پہلو ابھی تحقیق کے ابتدائی مرحلے میں ہی تھا کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام نے معاصر شواہد اور دستاویزی ثبوت سے صرف نظر کرتے ہوئے دو ایک کمزور بنیادوں پر علی الترتیب 1957 اور 1960 میں ماہنامہ تحریک دہلی میں علامہ پر مضامین لکھے۔ اول الذکر نے معرکۂ ستاون میں علامہ کے فتویٰ جہاد کے تعلق سے انکار کیا تو موٴخر الذکر نے معرکۂ ستاون میں علامہ کی علمی وعملی شرکت کا ہی انکار کر دیا۔ اس بحث کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اس کے بعد جس کسی نے بھی اپنی تحقیقات عالیہ کے اندر معرکۂ ستاون میں

علامہ کی عدم شرکت کو ثابت کرنے کی کوشش کی اس نے مولانا عرشی اور مالک رام کا آموختہ دہرادیا۔تحقیق کا یہ معیاراورانداز حددرجہ حیران کن ہے۔

دراصل کسی بھی شخصیت یا تحریک کے تعلق سے کوئی بھی موقف اختیار کرنے کے لیے معاصر شواہداوراولین ماخذ سے اس کی تائید ضروری سمجھی جاتی ہے۔معاصر شواہد اگر متعلقہ موقف کے مؤید نہیں ہوتے تو پھر اسے کمزور سمجھا جاتا ہے، محققین نے عام طور پر اپنی تحقیقات کے سلسلے میں یہی اصول ومنہاج مقرر کررکھا ہے۔جس پر وہ چلنے کی حتی الامکان کوشش بھی کرتے ہیں،لیکن معلوم نہیں کیوں تیرھویں صدی ہجری کی دواہم شخصیات سید احمد رائے بریلوی اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے تعلق سے یہ محققین اپنے مذکورہ اصول پر قائم نہیں رہ پاتے۔اس سلسلے میں مذکورہ عہد کی تاریخ کوموضوع بنانے والوں نے دومعیار قائم کررکھے ہیں:

1۔ایک معیار یہ ہے کہ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کا انگریزی سرکار کے خلاف جہاد کا اولین اور معاصر ماٰخذ سے ثبوت نہ ہونے کے باوجود ثانوی ماٰخذ کی بنیاد پر انھیں اوران کی تحریک کوانگریز مخالف ثابت کرنے پر اصرار کرنا۔

2۔اور دوسرا یہ کہ علامہ فضل حق خیرآبادی اوران کے مسلک ومنہاج پر چلنے والوں کے انگریزی سرکار کے خلاف جدوجہد کے متعدد معاصر شواہد اور دستاویزی ثبوت ہونے کے باوجود انھیں انگریزوں کا حامی ووفادار قرار دینا۔

پہلا پیمانہ: سید احمد رائے بریلوی اوران کی تحریک کے سلسلے میں چاراہم معاصر اور بنیادی ماٰخذومراجع ہیں:

1۔''مخزن احمدی''مولوی سید محمد علی کی فارسی تصنیف ہے،یہ کتاب 1299ھ/1881 میں لکھی گئی اور مطبع مفید عام آگرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔

2۔''تواریخ عجیبہ''موسوم بہ سوانح احمدی مؤلفہ منشی جعفر تھانیسری جو 1307ھ/1889 میں لکھی گئی اوراس کا پہلا ایڈیشن 1895 میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔اس کتاب کا بنیادی ماٰخذ''مخزن احمدی''ہی ہے۔

3۔''تواریخ عجیب''(کالاپانی) مؤلفہ منشی جعفر تھانیسری جو 1302ھ/1884 میں لکھی گئی۔

4- چوتھا اہم اور سب سے تفصیلی ماخذ "وقائع احمدی" ہے جو سید صاحب کے رفقا اور خدام کی چشم دید روایتوں پر مشتمل ہے اور تقریباً پونے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب کی ترتیب کا کام سید صاحب کے مرید وخلیفہ نواب وزیر الدولہ کے حکم سے 1274ھ سے شروع ہوا۔ اس کے متعدد قلمی نسخے مختلف لائبریریوں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک اور رضا لائبریری رام پور وغیرہ میں موجود ہیں، اس کو پہلی بار 2007 میں سید احمد شہید اکیڈمی لاہور نے ایک جلد میں، مولانا رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہی مطبوعہ نسخہ اس وقت راقم کے پیش نظر ہے، جو 2477 صفحات پر محیط ہے۔

یہ چاروں معاصر ماٰخذ نہ صرف سید صاحب اور ان کی تحریک کے تعلق سے انگریز مخالفت کی تردید کرتے ہیں، بلکہ ان میں شامل متعدد واقعات انگریزی سرکار کی معاونت کا اشارہ بھی دیتے ہیں، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> 1- "ایام طفولیت سے آپ (سید احمد رائے بریلوی) کی طبیعت اور جبلت میں شوق وذوق اعلائے کلمۃ اللہ وانطفائے نائرہ کفر وبدعت کا بھرا ہوا تھا، اس واسطے ہر گھڑی اور ہر ساعت جہاد اور قتال کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی گو کافر تھی مگر اس کی مسلمان رعایا کی آزادی اور سرکار انگریزی کی بے روریائی اور بوجہ موجودگی ان حالات کے ہماری شریعت کے شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کو مانع تھیں، اس واسطے آپ کو منظور ہوا کہ اقوام سکھ، پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکامات شریعت کی حارج اور مانع تھے، جہاد کیا جائے، مگر جہاد کا کام ایسا نہیں ہے کہ جھٹ پٹ انجام کو پہنچ جائے اور اس سے فارغ ہو کر اپنے گھر کو لوٹ آئے۔ لہٰذا آپ نے چاہا کہ جہاد کرنے سے پہلے فرض حج کو ادا کر لیں، اور بعد ادائے اس فرض کے سکھوں سے جہاد شروع کریں۔"
>
> (تواریخ عجیبہ "سوانح احمدی" ص:45)
>
> 2- "اثنائے قیام کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسماعیل شہید وعظ

فرمار ہے تھے، ایک شخص نے مولانا سے یہ فتوئی پوچھا کہ سرکار انگریزی پر
جہاد کرنا درست ہے یا نہیں، اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی
بے روریا اور غیر متصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے،
اس وقت پنجاب کے سکھوں کا ظلم اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ ان پر جہاد کیا
جائے۔" (مرجع سابق ص:57)

3۔"ابتدائے عمل داریٔ سرکار سے وہابیوں سے قتل انگریزی تو درکنار کبھی
خلاف تہذیب بھی سرزد نہیں ہوئی۔ عین بغاوت 1857 کے عام فتنہ کے
وقت بجائے بغاوت اور فساد کے، وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں
کو باغیوں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے گھروں میں چھپا رکھا۔"

(تواریخ عجیب (کالا پانی) ص:83/84)

ان کتابوں کے پینتالیس پچاس برسوں کے بعد "سیرت سید احمد شہید" مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" مؤلفہ مولانا عبید اللہ سندھی، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مؤلفہ مولوی سید طفیل احمد "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی اور "سید احمد شہید" مؤلفہ مولانا غلام رسول مہر جیسی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اپنی کتابوں کی ترتیب و تالیف کے دوران ان تمام لوگوں کے پیش نظر مذکورہ تینوں بنیادی ماٰخذ تھے، لیکن ان محققین نے اولین ماٰخذ کے برخلاف اپنی کتابوں میں سید صاحب اور ان کی تحریک کو انگریز مخالف ثابت کرنے پر قلم کا پورا زور صرف کیا۔ آج یہی ثانوی ماٰخذ اور کتابیں موجودہ نامور محققین کا بنیادی ماٰخذ ہیں، کیونکہ انھیں سید احمد رائے بریلوی اور ان کی تحریک کے سلسلے میں اپنے مفروضہ موقف (انگریزی سرکار کے خلاف جہاد) کو یہیں سے غذا فراہم ہوتی ہے۔

اب تک تحقیق کا اصول تو یہ رہا کہ اولین اور معاصر ماٰخذ سے ثانوی ماٰخذ کی اصلاح کی جاتی رہی ہے، لیکن مذکورہ بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ثانوی ماٰخذ سے اولین اور معاصر ماٰخذ کی تصحیح کی جانے لگی۔ "سوانح احمدی" کے سلسلے میں پروفیسر ایوب قادری کا یہ بیان مذکورہ تحقیقی اصول سے کس درجہ منحرف ہے، ملاحظہ ہو:

"یہ کتاب (سوانح احمدی) سید احمد شہید اور ان کے اکابر خلفا کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے، سید صاحب کے حالات میں سب سے پہلی کتاب ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی - اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ مؤلف نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اول تا آخر سکھوں کے خلاف تھی، انگریزوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن کو انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرخاش نہ تھی، حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر جماعت کے خاص راز دار تھے جس کے نتیجے میں انھوں نے خوف ناک تکلیفیں اٹھائیں ......ان حالات اور مصائب وآلام کا یہ ردعمل ہوا کہ انھوں نے اس مرقع میں مصلحت کے قلم سے نقش ونگار بھرنے کی کوشش کی ہے ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں اور ظاہر ہے-" (مرجع سابق، ص:51/52)

سید احمد رائے بریلوی اور ان کی تحریک کے سلسلے میں ذکر کردہ چاروں کتابیں مخزن احمدی، سوانح احمدی، تواریخ عجیب اور وقائع احمدی نہ صرف اولین مأخذ ہیں بلکہ اول الذکر سید صاحب کے بھانجے ☆ کی تحریر کردہ ہے، ثانی الذکر دونوں کتابیں سید صاحب کی تحریک کے ایک سرگرم رکن اور "خاص راز دار" کی ہے، جبکہ مؤخر الذکر ان کے مریدین وخلفا کی چشم دید روایتوں پر مشتمل ہے- ان سب مسلمات کے باوجود سید صاحب اور ان کی تحریک سے بے محابہ عقیدت ہمارے نامور محققین کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان معاصر مأخذ کی اصلاحات کا فریضہ انجام دیں اور اپنے مفروضہ موقف کی اشاعت کے لیے ثانوی مأخذ پر اعتماد کریں، نیز ان کی تحریک جہاد کا ڈانڈا معرکۂ بالاکوٹ ہوتے ہوئے معرکۂ ستاون سے ملادیں-

تاریخ نویسی اور تحقیق کا یہ انداز صرف سید احمد رائے بریلوی اور ان کی تحریک تک محدود نہیں

☆ مولانا غلام رسول مہر نے "مخزن احمدی" اور اس کے مؤلف سید محمد علی کے بارے میں لکھا ہے کہ "سید احمد رائے بریلوی کے چار بھانجے تھے، بڑے سید محمد علی جنھوں نے ابتدا سے آغاز جہاد تک حالات لکھے اور اس کتاب کا نام "مخزن احمدی" رکھا، ایک مرتبہ چھپ بھی گئی تھی، مگر اب کمیاب ہے بلکہ نایاب ہے-"
(افادات مہر، ڈاکٹر شیر بہادر خان، ص:139، مطبوعہ غلام علی اینڈ سنس، لاہور پاکستان)

ہے، بلکہ اس زمرۂ تحقیق میں کچھ اور بھی شخصیتیں شامل ہیں -معرکۂ ستاون میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کی علمی، عملی اور فکری شرکت کے ذکر سے معاصر مأخذ کی مکمل خاموشی کے اعتراف کے باوجود، مختلف جہتوں سے یہ اصرار کیا جاتا رہا ہے کہ مذکورہ دونوں شخصیتوں کی معرکہ ستاون میں بھرپور حصہ داری تھی -اس سلسلۂ تحقیق میں مولانا غلام رسول مہر کا یہ اقتباس حیرت انگیز ہے:

> ''ان بزرگوں (مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی) نے بھی 1857 کی جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا -افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں -'' (اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد، ص:250)

واقعی معاصر ادبیات معرکۂ ستاون میں دونوں ''بزرگوں'' کی کوئی تفصیل مطالعے سے نہیں گزری، البتہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی اولین مستند سوانح ''تذکرۃ الرشید'' نظر سے گزری تو غلام رسول مہر صاحب کا مولانا گنگوہی کے حوالے سے مندرجہ بالا دعویٰ یکسر غلط معلوم ہوا- مولانا گنگوہی کا انتقال 9 راگست 1905 میں ہوا، ان کے انتقال کے ایک سال کے بعد ہی مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے 1906 میں مولانا کی سوانح بنام تذکرۃ الرشید لکھنے کا آغاز کر دیا اور دو سال کے بعد 1908 میں یہ کتاب مکمل ہوگئی، اس لیے اہل علم نے مولانا کی سوانحیات میں اس کتاب کو اولین اور مستند قرار دیا ہے- اس کتاب کے دو اقتباسات بلا تبصرہ حاضر ہیں، یہ اقتباسات خود بتائیں گے کہ مولانا نے معرکہ ستاون میں حصہ لیا تھا یا انگریزی سرکار کے حامی و وفادار تھے:

1 -معرکۂ ستاون جب ختم ہو گیا تو بعض لوگوں نے کسی دشمنی کی وجہ سے مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے ''باغی'' ہونے کی مخبری کر دی، اس قضیے کا حال مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں- انھوں نے اپنا رنگ جمایا

اوران گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔"
(تذکرۃ الرشید، ص:76)

جبکہ صورت حال یہ تھی:

"یہ حضرات حقیقتاً بے گناہ تھے، مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی ومفسد اور مجرم وسرکاری خطاوار ٹھیرا رکھا تھا۔ اس لیے گرفتاری کی تلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر تھی۔ اس لیے کوئی آنچ نہ آئی اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔" (مرجع سابق، ص:79)

2۔معرکۂ ستاون کے بعد انگریزی سرکار کی دار وگیری کے نتیجے میں ہر شخص خوف و ہراس میں تھا، انہی ایام میں مولانا گنگوہی کو بھی معلوم ہوا کہ ان کا نام بھی قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں آچکا ہے، لیکن ان کا حال یہ تھا:

"آپ کو واستقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے۔ اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔" (مرجع سابق، ص:80)

ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد غیر جانب دار محققین کو یہ فیصلہ لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ مولانا گنگوہی کے حوالے سے غلام رسول مہر صاحب کا مذکورہ دعویٰ ثانوی مأخذ پر استوار ہے یا ان کی خود ساختہ تاریخ ہے، مولانا گنگوہی کی اولین سوانح جس کی تائید نہیں کرتی۔

دوسرا پیمانہ: علامہ فضل حق خیرآبادی کے مذکورہ ناقدین اور محققین کی تحقیقات کا یہ ایک رخ تھا۔ ان کی تحقیقات کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب بھی محققین علامہ خیرآبادی پر معرکہ ستاون میں شرکت کے حوالے سے داد تحقیق دیتے ہیں تو تحقیقی اصول ودیانت کے خلاف ان کی نگاہیں ثانوی مأخذ پر ٹک جاتی ہیں یا پھر مولانا عرشی اور مالک رام کے کمزور استدلال پر، جس کے بعد درجنوں معاصر شواہد اور متعدد دستاویزی ثبوت بے وقعت ہوجاتے ہیں۔ کہاں تو تحقیق کا یہ انداز کہ جن

بزرگوں کی معرکۂ ستاون میں شرکت یا جہاد کا کوئی ثبوت نہ ہونے بلکہ انگریزی سرکار سے وفاداری کے معاصر شواہد کے باوجود انھیں جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کیا جائے اور کہاں تحقیق کا یہ تیور کہ علامہ کی معرکۂ ستاون میں شرکت کے ثبوت میں درجنوں معاصر شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ایک عبارتوں کو سامنے رکھ کر بساط تحقیق لپیٹ دی جائے اور معرکہ ستاون میں علامہ کی عدم شرکت کا حتمی فیصلہ سنا دیا جائے۔ تحقیق کا دیانت دارانہ تقاضا تو یہ تھا کہ علامہ خیرآبادی کی اولین تفصیلی سوانح ''باغی ہندوستان'' کی اشاعت کے بعد قومی و ریاستی محافظ خانوں کی طرف مراجعت کر کے اس سلسلۂ تحقیق کو مزید آگے بڑھایا جاتا، جہاں اب بھی معرکۂ ستاون کے تعلق سے ہزاروں دستاویزات تحقیق و تفتیش کے منتظر ہیں، لیکن علامہ کے ناقدین نے محض مولانا عرشی اور مالک رام کی تحقیق پر غیر مشروط ایمان لا کر ان کے موقف کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ جن مستند محققین نے مولانا عرشی اور مالک رام کے دلائل کی معاصر شواہد سے تغلیط کرنے کی کوشش کی، ان کی محققانہ کاوشوں کو بیک جنبش قلم ''روایتوں کا مجموعہ'' اور ''مناظرانہ طرز تحریر'' کہہ کر ان سے بچنے کی شعوری کوشش کی جانے لگی۔ (دیکھیے ''غالب اور ہماری تحریک آزادی'' از شمیم طارق) تحقیق کا یہ انوکھا انداز ان لوگوں کی شادمانی میں اضافے کا سبب تو بن سکتا ہے جو علامہ کو اس حیثیت میں نہیں دیکھنا چاہتے، تاریخی حقائق پر خط تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔ در اصل تاریخ، تاریخ ہوتی ہے جو ہمارے مفروضہ ذہن و فکر کی تابع نہیں ہوتی، اس کو من و عن قبول کرنا اور اسے اسی طرح پیش کر دینا دل گردے کی بات ہے، جس کی تاب ہر ذہن و قلم نہیں لا سکتا۔

معاصر ماخذ سے معرکۂ ستاون میں علامہ کی شرکت کا مستحکم ثبوت: معرکۂ ستاون میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی شرکت کے حوالے سے کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ان اولین اور معاصر ماخذ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے:

1- تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ-2- حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشت مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق-3-1857 کے غداروں کے خطوط مرتبہ سید عاشور کاظمی-4- اخبار دہلی از چنی لال-5- روزنامچہ معین الدین حسن خاں معروف بہ ''خدنگ غدر''-6- روزنامچہ منشی جیون لال-7-1857 کا تاریخی روزنامچہ (عبداللطیف) مرتبہ خلیق احمد نظامی-8- غدر دہلی کے گرفتار

شدہ خطوط-9- مقالات سرسید حصہ شانز دہم-10- بہادر شاہ کا مقدمہ مرتبہ خواجہ حسن نظامی-11- غالب کا روز نامچۂ غدر 1857 مرتبہ خواجہ حسن نظامی-12- ہمارے ہندستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر-13- الثورۃ الہندیہ مصنفہ علامہ فضل حق خیر آبادی- ان کے علاوہ قومی وریاستی محافظ خانوں کے مختلف دستاویزات وفرامین، مسل مقدمہ مولوی فضل حق اور دستور ایڈمنسٹریشن کورٹ-

ان اولین اور معاصر مأخذ سے علامہ خیر آبادی کی معرکۂ ستاون میں جن سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے، وہ یہ ہیں:

1- دہلی اور اودھ کی بغاوت میں عمومی شرکت: مقدمے کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو 30 جنوری 1859 کو گرفتار کیا گیا اور لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا- مقدمے کے "نقل فیصلہ" میں عدالت نے علامہ کے تعلق سے جو تفصیل لکھی ہے، وہ یہ ہے:

> "وہ (مولوی فضل حق) 1857 اور 1858 کے دوران بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی-" (مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

2- دہلی کی بغاوت میں عمومی شرکت:

> "دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں کے حکام سے بھی اس سے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو حالات تحریر کیے، ان سے معلوم ہوا کہ 1857 میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں-" (مرجع سابق)

> "بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا- یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا-" (مرجع سابق)

3- جنگ کے دوران بادشاہ کو مشورے دینا: معرکۂ ستاون کے دوران بہادر شاہ ظفر کو علامہ مخلصانہ مشورہ دیتے رہے اور بہادر شاہ اس اعتماد کی بنا پر جو انھیں علامہ کے اخلاص اور ان کی اصابت رائے پر تھا ان مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے- بہادر شاہ ظفر کے وزیر اعظم حکیم احسن

اللہ خاں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے:

''مولوی (فضل حق) صاحب جب بھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے باہر (محاذ پر) نکلیں اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں۔''

(میموائرس آف حکیم احسن اللہ خاں، ص:23)

4- مجاہدین کی اعانت: مجاہدین کی اعانت روپے اور سامان رسد سے، اہل کار حکام کا تقرر، مال گزاری کی تحصیل کا انتظام اور ہمسایہ والیان ریاست کو جنگ میں اعانت و شرکت کی دعوت کے لیے لال قلعہ کے دارالانشا (سیکریٹریٹ) سے علامہ کے حکم سے بہت سے پروانے جاری ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں کہتے ہیں:

''بادشاہ نے حکم دیا کہ مولوی (فضل حق) صاحب کی تجویز کے مطابق والیان ریاست کو پروانے لکھے جائیں اور بعجلت روانہ کر دیے جائیں۔''

(مرجع سابق، ص:23/24)

5- اہل کار حکام کا تقرر: بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کے دوران حکیم احسن اللہ خاں نے بیان دیا:

''(مولوی) فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا۔'' (بہادر شاہ کا مقدمہ، ص:347)

6- آمدنی پر توجہ اور مال گزاری کی تحصیل کا انتظام: بہادر شاہ ظفر کے پرائیویٹ سیکریٹری مکند لال نے اپنی ایک تحریر 18 راگست 1857 میں لکھا ہے:

''بہادر شاہ کے دربار عام سے اپنے کمرۂ خاص میں چلے جانے کے بعد مولانا (فضل حق) نے حسب ذیل افراد کے نام پروانے جاری کرنے کا حکم دیا: (1) بنام حسن بخش عرض بیگی، ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لیے (2) بنام فیض محمد، اسے ضلع بلند شہر اور علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لیے مقرر کیا گیا (3) بنام مولوی عبد الحق (ابن علامہ فضل

حق) ضلع گڑگانوہ کی مال گزاری وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔"

(غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط، ص:129)

7- جہاد کی ترغیب کے لیے وعظ و بیان: علامہ دیگر علمائے دہلی کے ساتھ جلسے کر کر کے ترغیب جہاد کے لیے وعظ کرتے رہے کہ حملے کی شکل میں دار الاسلام کو بچانے کی فکر و کوشش کرنا شرعاً واجب ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے ایک درباری چنی لال کا بیان ہے:

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔"

(اخبار دہلی از چنی لال، ص:273، فائل:127)

8- باغی فوجیوں کو ترغیب جہاد: معرکۂ ستاون کے دوران ان تمام سرگرمیوں کے علاوہ علامہ کی نگاہیں میدان جنگ پر بھی تھیں جس کے لیے وہ مسلسل باغی فوجیوں کو جہاد اور جنگ کی ترغیب دے رہے تھے۔ انگریزوں کے ایک مخبر تراب علی نے 28 راگست 1857 کو رپورٹ دی:

"مولوی فضل حق جب سے دہلی آیا ہے شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں مصروف ہے۔"

اسی خط کے آخری حصے میں یہ بھی ذکر ہے:

"مولوی فضل حق کے کہنے پر شاہزادے اب حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً سبزی منڈی کے پل پر لڑتے ہیں۔"

(1857 کے غداروں کے خطوط، ص:159)

10- فتویٰ جہاد: جنرل بخت کے مشورے سے علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی اور استفتا پیش کیا جس پر ممتاز علما نے دستخط کیے۔ (مختلف دستاویزات)

11- "کنگ کونسل" کے رکن: بہادر شاہ نے جنگ کے ایام میں مشاورت اور حالات پر قابو پانے کے لیے سہ رکنی "کنگ کونسل" بنائی، جس کے ایک رکن علامہ بھی تھے۔ سید مبارک شاہ (جو معرکۂ ستاون کے درمیان دہلی کا کوتوال تھا) نے بیان دیا کہ:

"شاہ (بہادر شاہ ظفر) نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی تھی۔"

(دی گریٹ ریولیوشن آف 1857، ص:128/183)

12۔ سلطنت کا نیا دستور بنایا: دہلی پر انگریزوں کا کامل تسلط 1803 میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہو چکا تھا اور مغل بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ستاون کا انقلاب برپا ہونے کے بعد علامہ نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کو دستوری حکومت اور آئینی بادشاہت میں تبدیل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک دستور العمل بنایا جس کا نفاذ بھی عمل میں آیا۔مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب عالم تبحر مشہور تھے، وہ الور سے ترک ملازمت کر کے دہلی آئے تھے۔انھوں نے بادشاہ کے لیے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا، جس کی ایک دفعہ یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عمل داری میں ذبح نہیں ہوگی۔'' (تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، ص:687)

13۔ مجلس منتظمہ کے ڈائرکٹر: علامہ نے سلطنت کا جو دستور العمل بنایا تھا اس کے نفاذ کے لیے ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی، جو دس ارکان پر مشتمل تھی، جن میں 6 فوج کے نمائندے اور 4 شہری تھے۔انگریزوں کے مخبر تراب علی نے یکم ستمبر 1857 کو ''دہلی کی خفیہ خبروں'' کے عنوان سے جو خط انگریزی حکام کو بھیجا تھا اس میں کورٹ کی تشکیل کی خبر کے ساتھ کورٹ کے فوجی ارکان کی فہرست دی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

''اور مولوی فضل حق بھی شامل ہیں۔''

(1657 کے غداروں کے خطوط ص:159)

معروف مؤرخ اور محقق مہدی حسین نے اپنی کتاب ''بہادر شاہ دوم'' صفحہ 182 پر لکھا ہے کہ اس مجلس منتظمہ کا ڈائرکٹر (نگراں) علامہ کو بنایا گیا۔

علم و فضل کی بنیاد پر علامہ خیر آبادی کی شہرت اطراف ہند میں تھی ہی، معرکۂ ستاون میں ان کے ان نمایاں کارناموں اور پھر ان بنیادوں پر ماخوذ ہونے کی وجہ سے اس شہرت کو چار چاند لگ گئے۔علامہ کے صاحبزادے مولانا عبد الحق خیر آبادی جن دنوں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس تھے تو ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر نے مولانا عبد الحق کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کی اس شہرت کا اعتراف کیا:

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو 1857

کے غدر نے نمایاں کر دیا تھااور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس
طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لیے جلا وطن
کر دیے جائیں-اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط
کرلیا تھا،اب کلکتہ کالج میں موجود ہے-''

(ہمارے ہندوستانی مسلمان،ص:202/203)

علامہ خیرآبادی کی 1857 کی جنگ میں ان اولین ،معاصر اور نا قابل تردید شواہد کے بعد
اب ''غالب شناس'' محققین کے یہ ریمارکس ملاحظہ ہوں:

''جب یہ ہنگامہ(1857)شروع ہوا تو وہ(مولانا فضل حق)عملاً اس
سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ
سے-انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا، نہ تلوار ہی اٹھائی''-
(مولانا فضل حق خیرآبادی، مالک رام،مشمولہ''ماہنامہ تحریک دہلی شمارہ
جون1960)

اس کے بعد جناب شمیم طارق نے اسی آموختے کو یوں دہرایا ہے:

''انھوں(مولانا فضل حق خیرآبادی) نے جہاد آزادی میں عملی شرکت کی
بھی نہیں کی تھی، جہاد کے فتوے پر ان کا دستخط کرنا بھی قرین قیاس نہیں
ہے-''(غالب اور ہماری تحریک آزادی،ص:34)

علامہ کے حوالے سے ان محققین کے مذکورہ ریمارکس اور تحقیق کے دہرے پیمانے کو دیکھ کر
نادم سیتاپوری کے اس اقتباس سے اتفاق کرنا مشکل نہیں ہوتا:

''انگریز پرست مسلمان تو مولانا سے اس لیے خفا تھا کہ وہ سن ستاون کی
جنگ آزادی میں مجاہدانہ اور باغیانہ کردار کے حامل رہ چکے تھے اور کٹر
مذہبی حلقے اس لیے ناراض تھے کہ مولانا خیرآبادی حضرت شاہ اسماعیل
شہید کے نظریات سے متفق نہیں تھے-ایک صدی بیت گئی، لیکن ذہنی گرد و
غبار کے بادل چھٹ نہ سکے-انگریز جب تک برصغیر میں برسر اقتدار رہا

آئین اور قانون کی دیواروں سے جھانک کر بہت سے چہرے پہچانے گئے، مگر نظر نہ آسکی تو مولانا فضل حق کی ڈراؤنی صورت، جن کی ''غالب ساز'' شخصیت کو چھپانے کے لیے بڑے بڑے غالب شناس ریسرچ اور تحقیق کی پرخار وادیوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔''

(فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص:6)

□□□

علامہ فضل حق خیر آبادی اور معرکۂ ستاون کا فتویٔ جہاد

علامہ فضل حق خیر آبادی تیرھویں صدی ہجری کے ان چند نامور اور ممتاز علما میں سے ایک تھے جن کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ اس امتیاز کی وجہ ان کی دو حیثیتیں تھیں، ایک کا تعلق علم و فضل سے تھا جبکہ دوسرے کا اعلائے کلمۂ حق سے۔ ان دونوں حیثیتوں میں وہ اپنے معاصرین پر نمایاں فوقیت رکھتے تھے۔ علامہ کے علم و فضل کا نشان امتیاز ''معقولات'' تھا، بقول مالک رام جس میں وہ ''آخری دور کے امام'' ☆ تسلیم کیے گئے۔ علامہ کے مستند تذکرہ نگاروں نے انھیں عالم اسلام کے فلاسفہ میں نصیر الدین طوسی، میر باقر داماد اور صدر شیرازی کے ہم صف اور ہم مرتبہ قرار دیا۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خاں کا یہ اعتراف قابل مطالعہ ہے، جن کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کا ایک زمانہ معترف ہے:

> ''جمیع علم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے، علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک

☆ مولانا فضل حق خیر آبادی، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: جون 1960

حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کر نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔"

(آثار الصنادید، جلد دوم، ص:88)

علامہ نے اپنے علمی وفکری فیضان سے متحدہ ہندوستان میں علم الٰہیات، علم کلام اور منطق و فلسفے کے ایک جدید مکتب علم "مکتب خیر آباد" کی بنیاد ڈالی۔ تیرھویں صدی کے بعد معقولات کے ہر خوشہ چیں کا شجرۂ تلمذ اسی مکتب علم سے استوار ہوتا ہے۔

معرکۂ ستاون میں علامہ خیر آبادی کی شرکت کی جہتیں: جہاں تک علامہ کی دوسری حیثیت کا تعلق ہے تو معاصر مآخذ اور دستاویزی ثبوت کے ذریعے یہ رائے آسانی سے قائم کی جاسکتی ہے کہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے معرکۂ ستاون میں پرجوش حصہ لیا تھا اور اسی بنیاد پر انھیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ اس سلسلے میں علامہ کے مستند سوانح نگاروں نے ان کی معرکۂ ستاون میں شرکت کی جو جہتیں متعین کی ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(1) علامہ نے دہلی کے مرکز جہاد میں بھی حصہ لیا اور اودھ کے مرکز جہاد میں بھی۔

(مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

(2) معرکۂ ستاون کے دوران بہادر شاہ ظفر کو علامہ مخلصانہ مشورہ دیتے رہے اور بہادر شاہ اس اعتماد کی بنا پر جو اسے علامہ کے اخلاص اور ان کی اصابت رائے پر تھا، ان مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے۔ (مختلف دستاویزات)

(3) جنرل بخت کے مشورے سے علامہ نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی اور استفتا پیش کیا، جس پر ممتاز علما نے دستخط کیے۔ (باغی ہندوستان)

(4) مجاہدین کی اعانت روپے اور سامان رسد سے، اہل کار حکام کا تقرر، مال گزاری کی تحصیل کا انتظام اور ہمسایہ والیان ریاست کو جنگ میں اعانت و شرکت کی دعوت کے لیے لال قلعہ کے دارالانشاء (سیکریٹریٹ) سے علامہ کے حکم سے بہت سے پروانے جاری ہوئے۔

(میموائرس آف حکیم احسن اللہ خاں)

(5) دہلی پر انگریزوں کا کامل تسلط 1803 میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں ہو چکا تھا اور مغل بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ ستاون کا انقلاب برپا ہونے کے بعد علامہ نے بہادر شاہ کی

شہنشاہی کو دستوری حکومت اور آئینی بادشاہت میں تبدیل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک دستور العمل بنایا جس کا نفاذ بھی عمل میں آیا۔ (تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ)

(6) غیر ملکی غاصبوں کے خلاف اہل وطن کی متفقہ جد وجہد کے لیے علامہ نے ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ علامہ نے سلطنت کے لیے جو دستور العمل مرتب کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ یکم اگست 1857 کو عید الاضحیٰ کے موقعے پر مسلمان گائے کی قربانی نہیں کریں گے، چنانچہ بادشاہ کی جانب سے ذبیحہ گاؤ کشی کی ممانعت کا حکم جاری ہوا۔ (مرجع سابق)

(7) علامہ دیگر علمائے دہلی کے ساتھ جلسے کر کر کے ترغیب جہاد کے لیے وعظ کرتے رہے کہ حملے کی شکل میں دار الاسلام کو بچانے کی فکر و کوشش کرنا شرعاً واجب ہے۔

(اخبار دہلی از چنی لال)

(8) ہندوستانی فوجیوں اور شہزادوں کو بھی علامہ "بھڑکانے" میں مصروف رہے۔

(اخبار دہلی، رپورٹ تراب علی)

(9) معرکے کے دوران علامہ نے شاہی فوج کی کمان بھی کی۔ (بہادر شاہ دوم)

(10) بہادر شاہ نے جنگ کے ایام میں سہ رکنی "کنگ کونسل" بنائی، جس کے ایک رکن علامہ بھی تھے۔ (دی گریٹ ریولیوشن آف 1857)

(11) علامہ نے سلطنت کا جو دستور العمل بنایا تھا اس کے نفاذ کے لیے ایک مجلس منتظمہ تشکیل دی گئی، جس کا ڈائرکٹر (نگراں) علامہ کو بنایا گیا۔ (بائی لاز ایڈمنسٹریشن کورٹ)

(12) 19 ستمبر کو دہلی پر انگریزی حکومت کا قبضہ ہو جانے کے بعد علامہ اودھ میں بیگم حضرت محل کے ساتھ سرگرم ہو گئے۔ (مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

علامہ خیر آبادی کے مستند سوانح نگاروں نے معرکۂ ستاون میں علامہ کی شرکت کی مذکورہ جہتوں کو معاصر روزنامچوں، خطوط، دستاویز، فرامین اور شواہد کی بنیادوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔

(دیکھیے: "باغی ہندوستان" اور "فضل حق اور سن ستاون")

علامہ خیر آبادی کی معرکۂ ستاون میں شرکت پر محققین کے انکار کی وجوہات: علامہ کے علم و عرفان اور اس کے اثرات پر آج تک کوئی محقق انگلی نہ اٹھا سکا، اس کی بنیادی وجہ ان کی

مطبوعہ تالیفات، شروح اور حواشی تھیں جو ان کے علمی قد وقامت کا تعین کرتی تھیں اور پھر ان کے قابل فخر اخلاف وتلامذہ کی ایک معتد بہ تعداد جو زبانی اور تحریری طور پر علامہ کے فضل وکمال کی داستان کو نسلوں میں منتقل کرتی رہی۔ ہم عصر تذکروں میں ان کے معاصرین کے اعترافات ان پر مستزاد۔ لیکن علامہ کی دوسری حیثیت جس کا تعلق اعلائے کلمۂ حق سے تھا، اس پر متعدد محققین اور مؤرخین نے سوالات کھڑے کیے اور معرکۂ 1857 میں ان کی فکری اور عملی شرکت پر شکوک و شبہات وارد کیے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ علامہ کی وفات 1861 کے تقریباً اسی سال گزر جانے کے بعد تک ان کی کوئی مبسوط سوانح مرتب نہیں کی جا سکی جس میں معاصر ماٰخذ اور دستاویزی شواہد کے ذریعے نا قابل تردید حقائق پیش کیے جاتے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش حکیم بہاء الدین گوپاموی (ف:1962) کے ذریعے سامنے آئی جنھوں نے علمائے سیتاپور کے حالات و کوائف پر ایک مختصر کتابچہ ''سیر العلماء'' مرتب کیا، جس میں علامہ خیر آبادی کے حالات صرف دو صفحات میں ذکر کیے گئے۔ اس کے بعد مفتی انتظام اللہ شہابی گوپاموی ثم اکبرآبادی (ف1968) نے ایک طویل مضمون ''مولانا فضل حق وعبدالحق'' لکھا، جو ''مصنف'' علی گڑھ میں باہتمام سید الطاف علی بریلوی دو قسطوں میں شائع ہوا، لیکن اس مضمون میں ذکر کردہ بہت سی روایات کی ثقاہت پر متعدد محققین نے اعتراضات کیے۔ بقول پروفیسر ایوب قادری:

> ''ان (مفتی انتظام اللہ شہابی) کا یہی مضمون حک واضافہ کے ساتھ مختلف رسالوں میں شائع ہوتا رہا اور مولانا فضل حق سے متعلق نامعتبر روایات نقل ہوتی رہیں۔ پھر جس کسی نے مولانا فضل حق پر قلم اٹھایا اس کے ماخذ مفتی انتظام اللہ تھے۔'' (مولانا فضل حق خیرآبادی: دور ملازمت، ص:39)

اس کے بعد مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے علامہ خیرآبادی کا رسالہ اور قصائد غدریہ ''باغی ہندوستان'' کے نام سے 1947 کے اوائل میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ علامہ کی تحریر کردہ مبسوط سوانحیات میں اس کتاب کو ''نقش اول'' کا درجہ حاصل ہے، لیکن اتفاق سے اس کتاب کی ترتیب میں بھی مولانا عبدالشاہد خاں کے پیش نظر مفتی انتظام اللہ کا مذکورہ مضمون رہا نیز ان کے مفید مشورے بھی شامل رہے۔ اس صورت حال نے محققین کو انگشت

نمائی کا موقع فراہم کردیا۔ ''باغی ہندوستان'' کے تعلق سے نادم سیتاپوری کا یہ اقتباس میرے اس قول کی تائید کرتا ہے:

''مولانا شیروانی کی یہ پہلی تالیف تھی۔ اپنے موضوع سے انھیں والہانہ عشق بھی تھا، اس لیے ''زور بیان'' میں وہ بعض مقامات پر اپنے موضوع سے آگے نکل گئے اور کہیں پیچھے رہ گئے۔ سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ انھیں مرحوم مفتی انتظام اللہ خاں شہابی کی غیر معتبر اور غیر مستند حکایات و روایات کا بھی سہارا لینا پڑا، انجام ظاہر تھا۔ ''خیرآبادیات'' کے موضوع پر ''نقش اول'' کا درجہ رکھنے کے باوجود یہ تالیف اہل تحقیق وتنقید کی ''خوردہ گیری'' سے نہ بچ سکی۔'' (فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص: 7)

اس ''خوردہ گیری'' کا نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ خیرآبادی کی دوسری حیثیت جس کا تعلق (معرکۂ ستاون میں عملی شرکت کی وجہ سے) اعلائے کلمۂ حق سے تھا، محققین نے انکار کردیا۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی آواز مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ہے، جنھوں نے ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857 کا فتویٰ جہاد'' لکھا جو ماہنامہ تحریک دہلی، اگست 1957 میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے علامہ کے تعلق سے فتویٰ جہاد کا انکار کیا اور فرمایا کہ ''مولانا خیرآبادی کا جہاد کے فتوی سے کوئی تعلق نہ تھا''۔ اس کے بعد اس موضوع پر ''مولانا فضل حق خیرآبادی'' کے عنوان سے مالک رام صاحب نے داد تحقیق دی، جو ماہنامہ تحریک دہلی کے ہی شمارہ جون 1960 میں شائع ہوا، جس میں وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انھوں نے معرکۂ ستاون میں علامہ کے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے عدم شرکت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں مضامین اس وقت میرے پیش نظر ہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ان دونوں مضامین کی اشاعت کے بعد تو ''غیر جانب دار'' محققین کو جیسے مسالہ فراہم ہوگیا اور اس کے بعد مختلف جہتوں سے علامہ کی اس حیثیت کو مشکوک بنانے کی ہوڑ لگ گئی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بشمول مولانا عرشی اور مالک رام ہر محقق نے 'باغی ہندوستان' کو ہی بنیاد بناکر آواز اٹھائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ کی مبسوط سوانحیات میں اسی کتاب کو نقش

اول کا درجہ حاصل تھا، اس کے بعد جو بھی کتابیں لکھی گئیں ان کا بنیادی ماخذ یہی کتاب بنی اور علامہ کے تعلق سے دستیاب شدہ معلومات میں اضافہ نہ کر سکیں۔ باغی ہندوستان کی اشاعت کے تقریباً 28 برسوں کے بعد اور مولانا عرشی اور مالک رام کے مضامین کی اشاعت کے تقریباً 18 برسوں کے بعد ہندو پاک میں خیر آبادی مکتب فکر کے نمائندے مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی (کراچی) نے جواباً ایک کتاب لکھی جو "فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" کے نام سے 1975 میں کراچی پاکستان سے شائع ہوئی، اس کتاب میں علامہ خیر آبادی پر دیگر بہت سے الزامات کے جوابات کے ساتھ مذکورہ دونوں محققین کا بھی علمی جواب دیا گیا۔ اس کتاب کو باغی ہندوستان کے بعد سلسلۂ خیر آبادیات میں یقیناً اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ "فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" کی اشاعت کے تقریباً دس برسوں کے بعد جب باغی ہندوستان کا چوتھا ایڈیشن 1985 میں باہتمام المجمع الاسلامی مبارک پور شائع ہوا تو اس میں مولانا شیروانی نے "ابحاث جدیدہ" کے عنوان سے ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اس میں مولانا عرشی، مالک رام اور دیگر محققین کے اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ علامہ خیر آبادی کے وصال کے تقریباً 80 برسوں کے بعد باغی ہندوستان کی شکل میں ان کی مبسوط سوانح منظر عام پر آئی بھی تو محققین کی دسترس سے باہر رہی، اس سلسلے میں مفتی سید نجم الحسن خیر آبادی کا یہ بیان بڑا حیرت انگیز ہے۔ مفتی صاحب کا یہ بیان 1968 کا ہے جب وہ "خیر آباد کی ایک جھلک" کے عنوان سے اپنی کتاب مرتب کر رہے تھے:

> "یہ رسالہ (الثورۃ الہندیہ) باغی ہندوستان مؤلفہ مولانا عبد الشاہد خاں صاحب شیروانی کے ساتھ منسلک ہے، باغی ہندوستان میں علامہ کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں، ساتھ ہی خیر آباد کے اس علمی خاندان کے اور بھی بزرگوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب اب نایاب ہے، راقم کو اس کتاب کے ایک نسخے کی ضرورت ہے جو سعی بسیار کے باوجود نہ حاصل ہو سکا۔" (خیر آباد کی ایک جھلک، حاشیہ، ص: 58)

یہ بیان اس شخص کا ہے جو مولانا شیروانی کا رفیق و ہم درس تھا اور باغی ہندوستان کی ترتیب و تدوین میں ان کا معاون بھی، پھر عام قارئین، محققین اور اہل قلم کی دسترس سے یہ کتاب کتنی دور

ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل علامہ کی پہلی تفصیلی سوانح ''باغی ہندوستان'' کا پہلا ایڈیشن 1947 میں مدینہ پریس، بجنور سے شائع ہوا، پھر اس کے 38 برسوں کے بعد المجمع الاسلامی مبارک پور کے زیر اہتمام 1985 میں اس کا چوتھا ایڈیشن چھپا، درمیان میں دوسرا اور تیسرا ایڈیشن بالترتیب 1974 اور 1978 میں شائع بھی ہوا تو مکتبہ قادریہ لاہور پاکستان سے جو ہندستانی قارئین کی پہنچ سے باہر تھا۔ اس کتاب کا آخری پانچواں ایڈیشن 2001 میں المجمع الاسلامی سے شائع ہوا ہے، اس کے بعد خاموشی ہے۔

اس تفصیل کے بعد علامہ خیر آبادی کی معرکۂ ستاون میں شرکت پر محققین کے انکار کی وجوہات کو اختصاراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

(1) علامہ کی وفات کے تقریباً آٹھ دہائیوں تک ان کی مبسوط سوانح کا منظر عام پر نہ آنا۔

(2) ''باغی ہندوستان'' میں بعض نامعتبر روایات کا شامل ہونا۔

(3) آزادی ہند کے بعد علامہ کے تعلق سے مزید معلومات کی حصولیابی کے لیے محققین کا قومی اور ریاستی محافظ خانوں کی طرف مراجعت نہ کرنا۔

(4) معاصر شواہد سے صرف نظر کرتے ہوئے سطحی معلومات کی بنیاد پر عجلت میں منفی موقف اختیار کرنا۔ ان کے علاوہ اور بھی وجوہات ہوسکتی ہیں، لیکن انکار کی اہم بنیادیں یہی ہیں۔

مولانا عرشی کا مقدمہ: علامہ فضل حق خیر آبادی کی معرکۂ ستاون میں شرکت کی جتنی بھی جہتیں محققین نے بیان کی ہیں، ان میں سب سے نمایاں ''فتوئ جہاد'' ہے کہ علامہ نے معرکۂ ستاون میں جنرل بخت خاں کے مشورے سے فتوئ جہاد دیا، جس پر علما نے دستخط کیے اور اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ ☆ علامہ کی زندگی کا اس رخ سے جائزہ لینے والے دیگر بے شمار اہل قلم نے بھی ان کے فتوئ جہاد کو ان کا سب سے اہم کارنامہ قرار دیا ہے۔ چوں کہ اس فتوے کو معرکۂ ستاون میں بہت اہمیت حاصل ہے، اسی فتوے نے مسلمانوں کے اندر انگریزی حکومت کے خلاف مذہبی جذبات بیدار کیے، انھیں متحد و مستحکم کیا اور ملک گیر سطح پر ان میں ایک نئی روح پھونک دی، اس لیے اس کی تعیین اور حقائق کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ اس سے

☆ باغی ہندوستان، عبدالشاہد خاں شیروانی، ص:215، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور، 2001

نہ صرف علامہ کے معرکہ ستاون میں فتویٰ دینے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے بلکہ اس جنگ میں علامہ کی شرکت کی بہت سی گمشدہ کڑیوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔

علامہ کے فتویٰ جہاد کے سلسلے میں محققین کے مذکورہ دعوے کے خلاف سب سے پہلے (جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا) مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری اور اس کے بعد مالک رام نے آواز اٹھائی۔ مولانا عرشی کے انکار کے دلائل یہ تھے:

1- تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ کا اقتباس بتاتا ہے کہ جنرل بخت خاں نے اپنی آمد دہلی (2 جولائی 1857) کے بعد علما سے جو فتویٰ حاصل کیا تھا وہ اخبار الظفر دہلی اور اس کے حوالے سے صادق الاخبار دہلی کے 26 جولائی کے شمارے میں شائع ہوا☆، اس پر دیگر علما کے ساتھ مولانا (فضل حق) کے دستخط نہیں ہیں۔

2- منشی جیون لال کے بیان کے مطابق مولانا 16 اگست 1857 کو دربار میں شریک ہوئے گویا یہ فتویٰ مولانا (فضل حق) کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہوا، اس لیے اس پر ان کے دستخط نہیں تھے۔ (مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857 کا فتویٰ جہاد، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: اگست 1957)

☆ صادق الاخبار دہلی میں جو فتویٰ شائع ہوا، اس کی اشاعت کے تعلق سے بشمول مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام تمام محققین یہی لکھتے چلے آرہے ہیں کہ اس فتوے کی اشاعت 26 جولائی 1857 کو ہوئی ہے۔ یہ درست نہیں ہے، یہ فتویٰ صادق الاخبار دہلی کی 27 جولائی 1857 کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

اب تک جہاں کہیں بھی محققین اور مؤرخین نے اس فتوے کا ذکر کیا ہے یہ کہتے ہوئے صادق الاخبار کے حوالے سے کیا ہے کہ یہ پہلے اخبار الظفر دہلی میں چھپا اور پھر وہاں سے نقل کر کے صادق الاخبار میں اشاعت پذیر ہوا، مگر قابل ذکر ہے کہ اخبار الظفر دہلی کے اس شمارے کی تاریخ کا تعین کوئی بھی نہیں کر سکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا دہلی میں دہلی اردو اخبار (اخبار الظفر) کے 8 مارچ سے 13 ستمبر 1857 تک کے جو شمارے دستیاب ہیں ان میں درمیان کے پانچ شمارے غائب ہیں اور انہی شماروں میں سے کسی ایک میں مذکورہ فتوے کی اشاعت ہوئی ہے۔ لیکن اس مسئلے پر ذرا غور و فکر سے تاریخ کی تعیین آسانی سے ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ صادق الاخبار کے 27 جولائی 1857 کے شمارے میں مذکورہ فتویٰ "نقل استفتا از اخبار الظفر دہلی" کے عنوان سے شائع ہوا، "از دہلی اردو اخبار" کے عنوان سے نہیں ہوا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ دہلی اردو اخبار کا ہی نام بدل کر بادشاہ ہندوستان بہادر شاہ ظفر کے نام کی مناسبت سے "اخبار الظفر" کر دیا گیا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا عرشی کے مذکورہ دونوں دلائل کے جو جوابات حکیم سید محمود احمد برکاتی نے دیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

1- یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ صادق الاخبار میں جو فتویٰ شائع ہوا تھا، کیا یہ وہی ہے؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ بخت خاں نے جو فتویٰ حاصل کیا تھا ذکاء اللہ کے بقول اس میں لکھا تھا کہ "مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض ہے کہ اگر کافروں کو فتح ہوگئی تو وہ ان کے سب بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے" اور اس فتوے میں اس سے ملتا جلتا یا اس مفہوم کا کوئی جملہ نہیں ہے۔

2- ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ "مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں" جبکہ اس فتوے پر دونوں کے دستخط موجود ہیں۔

3- تحریک آزادی کے دوران ایک نہیں کئی فتوے حاصل کیے گئے تھے، دیگر فتوؤں کا ذکر سر سید اور ذکاء اللہ نے بھی کیا ہے، اس لیے بخت خاں نے جو فتویٰ حاصل کیا تھا وہ یہ نہیں کوئی اور تھا۔

4- مولوی ذکاء اللہ کے مطابق "جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا تھا جہاد کے فتوے کا چرچا شہر میں بہت کم تھا" سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتویٰ تھا جس کا چرچا بہت کم ہی سہی مگر تھا۔

5- ذکاء اللہ کے بقول بخت خاں والے فتوے میں یہ الفاظ تھے کہ "اگر کافروں کو فتح ہوئی تو وہ ان کے سب بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے" اور مولانا فضل حق نے بہادر شاہ کو متنبہ کرتے ہوئے جو فرمایا تھا اس کے الفاظ یہ تھے "اگر انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندان تیموریہ بلکہ سب مسلمان

(پچھلے صفحے کا بقیہ) اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک یہ اخبار "دہلی اردو اخبار" کے نام سے شائع ہوتا رہا، یہ فتویٰ شائع نہیں ہوا بلکہ نام کی تبدیلی کے بعد ہوا اور نام کی یہ تبدیلی 12 جولائی 1857 کی اشاعت میں سامنے آئی۔ اس کے بعد مذکورہ فتویٰ اخبار الظفر کے حوالے سے 27 جولائی 1857 میں صادق الاخبار میں شائع ہوا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ 12 جولائی سے 26 جولائی 1857 کے درمیان اخبار الظفر کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار چوں کہ ہفتہ واری تھا، اس لیے 12 جولائی کے بعد 19 اور پھر 26 جولائی کے شمارے منظر عام پر آئے۔ اتفاق سے 12 اور 19 جولائی کے شمارے ہمارے پیش نظر ہیں جن میں یہ فتویٰ شامل نہیں ہے، اب باقی رہتا ہے 26 جولائی کا شمارہ جو دستیاب نہیں ہے، کیوں کہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا دہلی میں دہلی اردو اخبار (اخبار الظفر) کے وہ پانچ شمارے جو غائب ہیں ان میں سے ایک 26 جولائی 1857 کا شمارہ بھی ہے اور یقینی طور پر یہ فتویٰ اسی شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یعنی پہلے 26 جولائی 1857 کو اخبار الظفر میں یہ فتویٰ چھپا اور پھر فتوے کی اہمیت کے پیش نظر 27 جولائی 1857 کو اخبار الظفر کے حوالے سے صادق الاخبار میں شائع ہوا۔

نیست و نابود کر دیے جائیں گے'' دونوں الفاظ میں لفظی اور معنوی تطابق یہ بتاتے ہیں کہ بخت خاں کا حاصل کردہ فتویٰ جس کو علامہ نے دیا تھا وہ اس کے علاوہ تھا جو صادق الاخبار میں شائع ہوا۔

6- جیون لال کے یہ لکھ دینے سے کہ وہ 16 اگست کو بہادر شاہ سے ملے تھے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے دہلی میں نہیں تھے؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ مولانا جب بھی دربار میں آئے ہوں جیون لال ضرور لکھے، مثلاً 19 اگست کو بھی عبداللطیف کے بیان کے مطابق مولانا بادشاہ سے ملے تھے، مگر جیون لال کا روزنامچہ خالی ہے۔

7- حکیم احسن اللہ خاں کے روزنامچے کے مطابق مولانا نے ایک مجلس میں بادشاہ سے مجاہدین کے لیے رسد کی فراہمی کے لیے کہا، احسن اللہ خاں نے اس مجلس کی تاریخ نہیں لکھی ہے، مگر مولوی ذکاء اللہ نے اس مجلس کی تاریخ 12 مئی بتائی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا جنگ کے آغاز سے ہی دہلی میں تھے۔ (فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص: 68 تا 76)

سیاق وسباق اور ظن وتخمین کی بنیاد پر حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کے ان جوابات سے یہ ثابت تو ہو جاتا ہے کہ اس معرکے میں کئی فتوے دیے گئے اور یہ فتویٰ وہ فتویٰ نہیں تھا جسے بخت خاں کے کہنے پر دیا گیا تھا اور جس پر علامہ خیرآبادی کے دستخط بھی تھے، لیکن دستاویزی ثبوت اس بات کی واضح تائید کرنے سے قاصر ہیں جس سے یہ وضاحت ہو سکے کہ علامہ نے کوئی فتویٰ جہاد دیا بھی تھا، کیونکہ اب تک نہ علامہ کے دیے ہوئے اس فتوے کا متن سامنے آسکا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی اہم دستاویزی ثبوت فراہم ہو سکا ہے۔ شاید اسی بنیاد پر مولانا عرشی اور مالک رام نے عجلت میں علامہ فضل حق کے فتویٰ جہاد کا انکار کر دیا۔

ایک اہم دستاویز کی بازیافت: راقم اس سلسلے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں 1857 سے متعلق دستاویزات کی چھان پھٹک کر رہا تھا کہ اس میں علامہ کے فتویٰ جہاد کے تعلق سے ایک دستاویز ملا جو ٹونک کے نواب وزیرالدولہ☆ کی تحریر ہے جسے یکم ستمبر 1857 کو ریاست ٹونک کی

☆ریاست ٹونک نواب امیر خاں کی شجاعت اور اس دور کے سیاسی حالات کے نتیجے میں وجود میں آئی، دسمبر 1817 میں انگریزی حکومت اور امیر خاں کے درمیان معاہدہ ہوا۔ معاہدے کے دیگر شرائط کے ساتھ امیر خاں کے بیٹے وزیرالدولہ نواب محمد وزیر خاں (ف: 1281ھ/1864) کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ انگریزی سرکار سے ملنا طے ہوا۔

جانب سے جاری کیا گیا ہے اور اس میں انگریزوں کے خلاف جہاد کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ تحریر علامہ کے فتویٰ جہاد اور معرکہ ستاون میں ان کی بھرپور شرکت کے ثبوت میں محققین کے سامنے پہلی بار پیش ہو رہی ہے۔ اس تحریر کی عبارت یوں ہے:

''نواب نے (یہاں عبارت پڑھی نہیں گئی) کہا کہ جہاد انگریزوں پر درست نہیں ہے۔ بعد اس کے سب فوج سے کہا کہ میں نمک خوار انگریزوں کا ہوں، میں نمک حرام نہیں ہوتا اور تم میرے نمک خوار ہو، تم کو اختیار ہے کہ چاہو نمک حرام ہو جاؤ، چنانچہ اس بات پر پانچ سو آدمیوں نے نوکری چھوڑ دی۔''

اس تحریر کے درمیان میں دیگر کچھ باتوں کے بعد لکھا ہے:

مولوی فضل حق شریک جلسہ (میٹنگ) ہوتے ہیں اور مشتمل بر بخت خان کے محمد شفیع رسالدار، مولوی سرفراز علی خاں اور مولوی امداد علی ساکن بلب گڈھ رسالدار ہیں اور جو کچھ بخت خاں کرتا ہے، ابتدا میں ان (مولوی فضل حق) کے مشورے سے ہوتا ہے اور مولوی کی اطاعت ظل شاہ دربار خاص میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔''

(میوٹنی پیپرز، کلکشن: 16، نمبر: 12، 1 ستمبر 1857، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی)

اس تحریر سے حسب ذیل امور کا پتہ چلتا ہے:

(1) اگر صادق الاخبار کے 27 جولائی والے فتوے کو جنرل بخت خاں والا فتویٰ مان لیا جائے (جو 26 جولائی کو اخبار الظفر میں چھپا) ظاہر ہے فتویٰ اس سے پہلے ہی دیا گیا ہوگا، ایسی صورت میں اس فتوے کی اشاعت کے ڈیڑھ پونے دو ماہ بعد نواب کا احتجاج کرنے کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، اس کا مطلب یہ فتویٰ کوئی اور فتویٰ تھا جو صادق الاخبار والے فتوے کے بعد منظر عام پر آیا۔

(2) دہلی سے ٹونک کی مسافت محض 222 میل (356 کیلومیٹر) ہے، اس لیے فتوے کی خبر دہلی سے ٹونک تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگ سکتا تھا، مگر فتوے کے تعلق سے نواب

کی احتجاجی تحریر 1 ستمبر 1857 کو سامنے آتی ہے، اس سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ نواب کا احتجاج اس فتوے کے تعلق سے نہیں ہے جو صادق الاخبار میں چھپا۔

(3) الثورۃ الہندیہ میں علامہ خیر آبادی کی اس تحریر: ''یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہرو دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علما، زہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی'' ☆ سے صادق الاخبار والے فتوے کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ وہ فتویٰ معرکہ ستاون کی ابتدا میں سامنے آیا جس میں علامہ کے دستخط نہیں ہوئے تھے۔

(4) 16 اگست 1857 کو جیون لال کا بیان ''مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے'' سے مولانا عرشی اور مالک رام کے استدلال کو اگر بالفرض صحیح مانتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علامہ 16 اگست کو دہلی پہنچے تب بھی فتویٰ جہاد سے ان کی لاتعلقی ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ یکم ستمبر کو فتوے کے خلاف نواب کا احتجاج اس بات کا اشاریہ ہے کہ یہ فتویٰ یکم ستمبر سے ہفتہ دس دنوں پہلے سامنے آیا، جب علامہ دہلی میں موجود تھے۔

(5) فتوے کی اہمیت اس قدر تھی اور اس سے اتنی ''شورش'' بڑھ گئی تھی کہ جب نواب نے اپنی فوج کو جہاد سے روکنے کی کوشش کی تو پانچ سو آدمیوں نے نوکری چھوڑ دی۔

(6) فتویٰ جہاد کے خلاف اس احتجاجی تحریر میں علامہ کا اس حیثیت سے ذکر آنا کہ بخت خاں جو کچھ کرتا ہے انہی کے مشورے سے کرتا ہے اور ان کی اطاعت بادشاہ کے دربار میں بھی ضروری سمجھی جاتی ہے، اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ مذکورہ فتوے کے اجرا میں بخت خاں سے علامہ کی مشاورت اور شرکت دونوں تھی۔

نواب آف ٹونک کی اس تحریر سے مستفاد مذکورہ تمام کڑیوں کو جوڑا جائے تو عبدالشاہد خاں شیروانی کے اس دعوے کی تائید و توثیق ہوتی ہے:

> ''علامہ (فضل حق) سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے، مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا، بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی، استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی،

☆ الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) مولانا فضل حق خیر آبادی، ص: 35، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور، 2001

مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کردیے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی، دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی تھی۔'' (باغی ہندوستان، ص:215)

نواب کی تحریر اور مولانا شیروانی کے دعوے میں بہت حد تک لفظی و معنوی تطابق پایا جاتا ہے، اس لیے لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ علامہ خیرآبادی نے معرکۂ ستاون میں جنرل بخت خاں کے مشورے سے جہاد کا فتویٰ دیا، جو صادق الاخبار والے فتوے کے بعد منظر عام پر آیا اور جس سے ملک گیر سطح پر شورش بڑھ گئی۔

مالک رام کا مقدمہ:- مولانا امتیاز علی عرشی کا مذکورہ مضمون (مشمولہ ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ اگست 1957) کے شائع ہونے کے بعد علامہ فضل حق خیرآبادی کے فتویٰ جہاد کے تعلق سے کئی محققین کا زاویۂ نظر بدل گیا۔ ان محققین میں معروف نقاد جناب مالک رام بھی تھے۔ اتفاق سے انہی دنوں انھیں علامہ کے مقدمے کی مسل حکومت کے پرانے کاغذات میں کہیں دستیاب ہوگئی۔ مولانا عرشی کے مضمون کے مطالعے سے ان کا قبلۂ فکر تو تبدیل ہو ہی چکا تھا، مقدمے کے مسل کی دستیابی نے انھیں اس نتیجے پر پہنچادیا کہ

> ''جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ (مولانا فضل حق) عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے، نہ عملی لحاظ سے، انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا، نہ تلوار اٹھائی۔'' (مولانا فضل حق خیرآبادی، از مالک رام، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: جون 1960)

چوں کہ مالک رام نے اس تعلق سے اپنا مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی'' (مشمولہ ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ جون 1960) لکھنے سے قبل منفی رخ سے ذہن تیار کرلیا تھا، اس لیے اپنی دیرینہ روایات کے خلاف اپنے گرد و پیش پر قطعاً نگاہ نہیں ڈالی اور عجلت میں علامہ کی معرکۂ ستاون میں شرکت کے انکاری ہوگئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس مقدمے کو بنیاد بنا کر انھوں نے معرکۂ ستاون میں علامہ کی عدم شرکت کا فیصلہ سنایا ہے، اسی مقدمے سے ان کی شرکت کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔

افسوس کہ اس غلط انداز تحقیق نے 1857 کے ایک مجاہد کی قربانیوں کو ہزاروں کی نگاہ میں مشکوک بنادیا۔ یہاں اسی کے ازالے کے لیے مالک رام کی تحقیق کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

مقدمے کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو 30 جنوری 1859 کو گرفتار کیا گیا اور لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ گرفتاری کے تین ہفتے کے بعد کیپٹن ایف اے وی تھربرن (F.A.V. Thurburn) کی عدالت میں 21 فروری 1859 کو مقدمہ شروع ہوا۔ استغاثہ اور صفائی کے پانچ پانچ گواہوں کے بیانات کے بعد 28 فروری 1859 کو کیپٹن تھربرن نے فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشیل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کردیا۔ جوڈیشیل کمشنر مسٹر جارج کیمبل (G.Cambell) اور میجر بارو (Barrow) قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت سے 4 مارچ 1859 کو فیصلہ صادر کیا گیا۔

مقدمے میں فیصلے کی تفصیل اس طرح ہے:

''مولوی فضل حق پر الزام یہ تھا:

الزام: بغاوت اور قتل پر انگیخت

تشریح: (1) وہ 1857 اور 1858 کے دوران باغی سرکار کی حیثیت میں بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

تشریح: (2) اس نے بونڈی کے مقام پر مئی 1858 میں باغی سرغنے ممو خاں کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔

تشریح: (3): اس نے بونڈی کے مقام پر مئی 1858 میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔

ملزم نے جرم سے انکار کیا اور سماعت شروع ہوئی۔

عدالت کے سامنے ملزم مندرجہ ذیل امور میں مجرم ثابت ہوا۔

(1) 1857 اور 1858 میں اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔

(2) 1858 میں بونڈی کے مقام پر اس نے باغیوں کے، جو وہاں پڑاؤ

ڈالے جمع تھے اور بالخصوص باغی سرغنے ممو خان کے مشوروں میں خاص سرگری دکھائی - ان ہی ایام میں اس نے ایسے فتوے دیے جن کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا -

4 مارچ 1859 کو اسے بطور شاہی قیدی حبس حیات حبس بعبور دریائے شور اور اس کی تمام جائیداد کی ضبطی کی سزا دی گئی -''

(مسل مقدمہ مولوی فضل حق ، مشمولہ مولانا فضل حق خیرآبادی ، از مالک رام ، ماہنامہ تحریک دہلی ، شمارہ: جون 1960)

اس مقدمے کی تفصیل پیش کرنے کے بعد مالک رام صاحب فرماتے ہیں کہ:

''مولانا فضل حق کے سیرت نگاروں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''مولانا فضل حق پر مقدمہ سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بنا پر قائم ہوا -'' آپ نے اوپر مقدمہ کی پوری روداد پڑھ لی اور فرد جرم بھی دیکھ لی - اس سے معلوم ہوگا کہ اس دعویٰ کی تینوں شقیں ٹھیک نہیں ، بنائے مقدمہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں تھی یا کم از کم وہ واقعات نہیں تھے ، جن کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا جاتا ہے اور یقیناً انھوں نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا تھا ، جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو -''

(مولانا فضل حق خیرآبادی ، ماہنامہ تحریک دہلی ، شمارہ: جون 1960)

علامہ کی سلطنت مغلیہ سے وفاداری یا فتویٰ جہاد یا عام بغاوت کے سلسلے میں معاصر روزنامچوں اور دستاویزی ثبوت سے قطع نظر ، صرف ان کے مقدمے کی پوری کارروائی کو غور سے پڑھ لیا جائے تو معرکۂ ستاون میں ان کی شرکت کی ساری گرہیں کھلتی ہوئی نظر آئیں گی - سب سے پہلے تو علامہ پر جو الزامات عائد کیے گئے ان کی پہلی شق ہی کو لے لیں - وہ یہ ہے:

''وہ 1857 اور 1858 کے دوران باغی سرکار کی حیثیت میں بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی -''

اس شق میں علامہ خیر آبادی دہلی کے اندر سلطنت مغلیہ کے ساتھ بغاوت میں شریک رہے اور علامہ پر یہ الزام ثابت بھی ہوا۔ دہلی میں باغی سرکار کی حیثیت سے شرکت کا واضح مطلب ہے کہ وہ مغلیہ سلطنت اور بادشاہ کے وفادار تھے، کیونکہ یہ جنگ بادشاہ کی قیادت میں لڑی جارہی تھی۔

اس کے بعد مقدمے کے ''نقل فیصلہ'' میں عدالت نے علامہ کے تعلق سے جو تفصیل لکھی ہے، اس میں علامہ کی سلطنت مغلیہ سے وفاداری کا مزید ثبوت بھی ہے، فتویٔ جہاد اور عمومی بغاوت کا ثبوت بھی۔ اس ''نقل فیصلہ'' کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

1۔ دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں کے حکام سے بھی اس سے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو حالات تحریر کیے، ان سے معلوم ہوا کہ 1857 میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں۔

2۔ دہلی میں بھی اس کا یہی کام تھا اور اودھ میں بھی اس نے اپنی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔

3۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔

اس کے بعد علامہ کے سیرت نگاروں کا یہ دعویٰ کیا غلط ہے کہ ان پر مقدمہ ''سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٔ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بنا پر قائم ہوا۔''

دراصل مولانا عرشی کے مضمون کو پڑھ کر مالک رام صاحب کا ذہن منفی تو بن ہی چکا تھا مزید انھوں نے جب یہ دیکھا کہ مقدمے میں جو الزامات عائد کیے گئے ہیں ان میں جس بغاوت کا ذکر ہے اس کا تعلق بونڈی کے مقام سے ہے جہاں وہ ممو خاں کے مشیر کی حیثیت سے باغیانہ کردار ادا کررہے تھے، اس کے علاوہ مقدمے میں جس فتوے کا ذکر ہے اس کا تعلق سرکاری ملازم عبدالحکیم کے قتل کی ترغیب سے ہے۔ ان ظواہر نے ان کے منفی ذہن کو مزید صیقل کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کو اپنا فیصلہ (معرکۂ ستاون میں علامہ کی عدم شرکت کا) سنانے سے قبل علامہ پر الزامات کی پہلی

شق پر ان کی نظر ضرور ٹھہرتی اور ''نقل فیصلہ'' کے مذکورہ اقتباسات انھیں اپنا فیصلہ بدلنے پر ضرور مجبور کرتے۔

ایک اہم سوال: اب رہ گیا یہ سوال کہ جب علامہ کی سلطنت مغلیہ سے وفاداری، فتویٰ جہاد اور عام بغاوت کا جرم مقدمے کے مذکورہ اقتباسات میں درج ہے تو پھر ان بنیادوں پر مقدمہ کیوں نہیں چلا؟ اس کا اطمینان بخش جواب اسی مقدمے میں درج ہے:

> ''جہاں تک قیام دہلی کے زمانے میں اس (فضل حق) کے چال چلن کا تعلق ہے، وہاں کے گواہ عدالت کے سامنے نہیں، نہ ملزم کو ان گواہوں پر جرح کرنے اور عائد کردہ الزامات کی جواب دہی کا موقع دیا گیا ہے۔''
>
> (مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

علامہ کی دہلی کی سرگرمیوں کے تعلق سے عدالت کو جب گواہ ہی میسر نہ تھے تو پھر ان سرگرمیوں کو عدالت میں زیر بحث کیسے لایا جاسکتا تھا؟ اور دہلی میں دیے گئے علامہ کے فتوے کا ذکر کیسے آسکتا تھا؟ تاہم دہلی میں علامہ کی باغیانہ سرگرمیاں معروف اور نمایاں تھیں اس لیے اجمالی طور پر مقدمے میں اودھ میں ان کی باغیانہ سرگرمیوں کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا کہ:

> ''وہ 1857 اور 1858 میں باغی سرکار کی حیثیت میں دہلی میں بغاوت اور قتل میں مدددی۔''

اس میں ''بغاوت'' ایک وسیع المعنی لفظ ہے جس میں ساری چیزیں آگئیں، اس الزام میں ''باغی سرکار کی حیثیت میں'' ذکر کرکے واضح طور پر ان کی مغلیہ سلطنت سے وفاداری تو بتا ہی دی گئی، کیوں اگر کوئی باغی سرکار (کمپنی) ہے تو مغلیہ سلطنت کا وفادار ہوگا، رہا فتویٰ جہاد تو وہ بھی بغاوت کے اندر شامل ہے، جس کی طرف اشارہ ''قتل میں مددی'' کے ذریعے کیا گیا ہے۔

الزامی جواب: مولانا عبدالشاہد شیروانی نے اپنی کتاب ''باغی ہندوستان'' میں علامہ کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ عدالت کا فیصلہ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔''
>
> (باغی ہندوستان، ص:215)

اس پر مالک رام لکھتے ہیں کہ:

''اگر انھوں نے یہ فیصلہ ''مسرت اور خندہ پیشانی'' سے سنا تھا تو اس کی بھی توجیہ ہو سکتی ہے کہ جو الزام ان پر لگائے گئے تھے، ان کے نزدیک وہ صحیح تھے.........(جبکہ) وہ بار بار حکومت سے درخواست کرتے ہیں، خود بھی لکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں کہ میں بے گناہ اور مظلوم ہوں۔''.........اگر انھوں نے فیصلہ ''مسرت اور خندہ پیشانی'' سے سنا ہوتا تو کیا ان کا یہی رویہ ہوتا۔''

(مولانا فضل حق خیر آبادی، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: جون 1960)

اصل میں معرکہ ستاون کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے مظالم کا جو دور شروع ہوا، اس نے بڑے بڑوں کے حوصلے پست کر دیے۔ ایسے پر آشوب حالات میں معرکہ ستاون کی کئی قد آور شخصیتوں نے انگریزی قہر سے محفوظ رہنے کے لیے خلاف واقعہ اپنی بے گناہی اور مظلومیت کا بیان دیا۔ ان میں سب سے بڑی مثال بادشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی ہے، جنھوں نے اپنے مقدمے کے دوران 9 مارچ 1858 کو 21 ویں روز کی عدالتی کارروائی میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی صفائی کے لیے عدالت کو اپنا تحریری بیان دیا، جس میں انھوں نے ایک بار نہیں بار بار اس بات کو دہرایا کہ بغاوت میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے، انھیں باغی سپاہیوں نے مجبور و بے بس اور مقید کر دیا تھا۔

بہادر شاہ نے اپنی بے خبری اور مظلومیت کی داستان عدالت کو اس طرح بتائی:

1- اصل حقیقت یہ ہے غدر کے روز کی مجھے پہلے سے خبر نہیں تھی۔

2- باغی سپاہی دیوان خاص میں گھس آئی...... مجھے چاروں طرف سے گھیر کر پہرہ متعین کر دیا، میں نے ان کا مطلب دریافت کیا اور چلے جانے کے لیے کہا، جس کے جواب میں انھوں نے خاموش کھڑے رہنے کو کہا ....خوف کھا کر کہیں میں نہ قتل کر دیا جاؤں میں نے منہ سے اف تک نہ کی اور چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

3- شام کے وقت یہ نمک حرام (باغی فوجی) کچھ انگریز مرد و عورت کو گرفتار کر کے لوٹے........اور ان کے قتل کا قصد کرنے لگے- میں نے باز رہنے کی درخواست کی.........آخری وقت اگرچہ میں مفسد بلوائیوں کو حتی المقدور باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا، مگر ان بے چاروں کو قتل کرنے باہر لے گئے-

4- میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو میرا گواہ ہے کہ میں نے مسٹر فریز ریا اور کسی انگریز کے قتل کا حکم نہیں دیا-

5- میری مہر کی ثبت شدہ اور دستخط کیے ہوئے احکام کی نسبت معاملہ کی اصل حالت یہ ہے کہ جس روز سے سپاہ آئی انگریزی افسروں کو قتل کیا اور مجھے مقید کر لیا، میں ان کے اختیار میں رہا-

6- بدون میرے حکم کے جس نے جتنے احکام چاہے لکھ لیے اور مجھے ان کے خلاصہ تک سے اطلاع نہیں کی جاتی تھی-

7- یہ سپاہ ہی تھی جس نے جو چاہا کیا، میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا-

(بہادر شاہ کا مقدمہ، ص:295 تا 298)

مقدمے کے دوران بادشاہ کے ان بیانات سے مالک رام اور ان جیسے نامور محققین کو علامہ خیر آبادی کی طرح بادشاہ کے لیے بھی یہی فیصلہ دینا چاہیے کہ:

''جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو بادشاہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے، نہ عملی لحاظ سے-''

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے، کیونکہ پھر انھیں معرکۂ ستاون کا ایسا مرکزی بت تراشنا ہوگا، جس کے آگے سارا ہندوستان سجدہ ریز تھا- سچائی یہ ہے کہ بادشاہ کا یہ بیان حقائق پر مبنی نہیں تھا، بلکہ پیران فلک کی ستم کوشیوں سے بچنے کی ایک ناکام کوشش تھی- جب بادشاہ کے اس بیان پر انھیں معرکۂ ستاون کی قیادت سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر مقدمے کے دوران علامہ خیر آبادی کے بیان کو معرکۂ ستاون میں ان کی عدم شرکت کے دلیل میں کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں حکیم سید محمود احمد برکاتی ٹونکی کے اس اقتباس کو خلاصۂ بحث کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے:

''جہاد تو مولانا کی حیات کا صرف ایک رخ تھا ورنہ ایک مفکر، متکلم، ادیب، منطقی اور فلسفی کی حیثیت سے کئی عظیم المرتبت کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے وہ تاریخ ملت کے ایک لازوال و لافانی اور بے مثال و بے نظیر شخص تھے- جہاد ان کی کلاہ افتخار کا واحد ہیرا نہیں تھا- اگر معاصر مآخذ سے یہ مواد فراہم نہ ہوتا جو ہوا تو آپ مجھے بھی جناب مالک رام کا ہم نوا پاتے- مولانا فضل حق نے عدالت کے سامنے اپنی بے گناہی کے سلسلے میں جو کچھ کیا اور اپنی رہائی کے لیے جو کچھ کہا، صاف کہتا ہوں کہ یہ خلاف عزیمت فعل تھا اور حیات فضل حق میں یہ ورق کاش سیاہ ہو جاتا- مانا کہ کئی مجاہدین نے بھی یہی کیا، مگر کاش مولانا فضل حق اپنے شاگرد کے شاگرد مولانا معین الدین اجمیری کی طرح اپنے جرم کا اعتراف فرما لیتے-''

(فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص:17)

□□□

فضل حق خیرآبادی اور سید فضل حق رام پوری

علامہ فضل حق خیرآبادی اور مولوی سید فضل حق شاہجہان پوری ثم رام پوری ایک ہی عہد کے تھے۔ ہم نام ہونے کے علاوہ سید فضل حق رام پوری رام پور اور بریلی میں انگریزی سرکار کی مختلف ملازمتوں میں رہے اور جنگ آزادی میں عملی شرکت بھی کی۔ اس یکسانیت نے علامہ خیرآبادی کے ناقدین کو یہ کہنے کا سنہری موقع فراہم کر دیا کہ علامہ پر معرکۂ ستاون میں جن باغیانہ سرگرمیوں کے حوالے سے الزامات عائد کیے گئے وہ سرگرمیاں دراصل ان کی نہیں بلکہ مولوی سید فضل حق رام پوری کی تھیں، اس سلسلے میں علامہ بے قصور تھے۔ ہم نامی کے اس قصے کو علامہ کے اکثر ناقدین نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے اور اسے 1857 کی جنگ میں علامہ کی عدم شرکت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ناقدین کی طرف سے اس سنگین الزام کے اعادے کے باوجود اب تک اس پہلو سے تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا ہے، یہاں علامہ کی حیات اور ان پر عائد کردہ ہم نامی کے اسی الزام کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

محققین کے اس خیال کی تحقیق و تفتیش سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مولوی سید فضل حق شاہجہان پوری ثم رام پوری کون تھے۔ احمد علی خاں شوق نے ''تذکرۂ کاملان رام پور'' میں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

”ولد سید عبداللہ عرف ننھے میاں از اولاد حضرت سید عبدالرزاق خلف اکبر حضرت شیخ جیلانی علیہ الرحمہ- رامپور میں جناب سید احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں پیدا ہوئے، کتب فارسی وعربی مولوی عبداللہ و مولوی عبدالرحمٰن اولاد مولانا مدن وسدن شاہجہانپوری سے پڑھیں، سید شاہ سیادت علی صاحب نبیرۂ سید عبدالرزاق صاحب بانسوی قدس سرہ سے بیعت تھے، بڑے پرہیزگار اور برگزیدہ تھے، تمام عمر کسی نے ان کے جسم کو برہنہ نہیں دیکھا- نواب جنت آرام گاہ کے عہد میں نائب سرشتہ دار محکمہ صدر تھے، پھر بریلی کی کمشنری کے سرشتہ دار ہو گئے، ایام غدر میں پیلی بھیت یا بہیڑی میں تحصیل دار تھے، اسی زمانے میں بہ نیت جہاد مرزا فیروز شاہ کے شریک ہو گئے، نواب فردوس مکاں نے ہر چند چاہا کہ رام پور چلے آئیں، آپ نے یہ عرض کیا کہ اب تو تمنائے شہادت ہے، چنانچہ پھانسی میں شہید ہوئے، کوئی اولاد ذکور نہ تھی-“

(تذکرۂ کاملان رام پور، ص: 321/320)

محققین کا مقدمہ: ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ اگست 1957 میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ایک مضمون بنام ”مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857 کا فتویٰ جہاد“ لکھا، جس میں چند دلائل کے ذریعے پہلی بار یہ دعویٰ کیا کہ علامہ خیرآبادی نے جنگ آزادی میں انگریزی سرکار کے خلاف جہاد کا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا- اس دعوے کے ساتھ انھوں نے بالواسطہ معرکۂ ستاون میں علامہ کی عدم شرکت پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کیا- اس کی دلیل انھوں نے یہ دی کہ انھیں رضا لائبریری رام پور میں نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے نام علامہ فضل حق خیرآبادی کی ایک عرضی ملی ہے، جس میں علامہ نے اپنی مظلومیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولوی سید فضل حق رام پوری کی باغیانہ سرگرمیاں میرے سر تھوپ دی گئی ہیں، دراصل میں بے قصور ہوں- اس قضیے میں مولانا عرشی نے علامہ کی مذکورہ عرضی کا فارسی متن پیش کرنے کے بعد جو نمبر وار نتائج برآمد کیے ہیں، ان میں سے کچھ ضروری یہ ہیں:

''1- مولانا خیرآبادی نے ابتلا کے سلسلہ میں نواب رام پور کو تین خط لکھے تھے، چونکہ آخری خط میں ان سے مدد کی خواہش کی گئی ہے، اس لیے قیاس یہ ہے کہ پہلے دو خطوں میں بھی اسی قسم کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہوگا۔
2- مولانا (فضل حق خیرآبادی) پر حسب ذیل تین الزام عائد کیے گئے تھے:
(الف) نواب خان بہادر خان، نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔ (ب) جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خان کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔ (ج) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔
3- مولانا پر جو مذکورہ بالا الزام لگائے گئے تھے، یہ دراصل میر فضل حق شاہجہان پوری کے کارنامے تھے، مولانا ان سے بری الذمہ تھے۔
4- اگر کسی طرح ان الزاموں کا غلط ہونا یعنی ان جرموں کا میر فضل حق شاہجہان پوری سے تعلق ثابت ہو جاتا تو مولانا بری ہو جاتے۔''
(مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857 کا فتویٔ جہاد، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: اگست 1957)

ان نتائج کا ذکر کرنے کے بعد مولانا عرشی نے اپنا فیصلہ یوں سنایا ہے:
''ان امور کے پیش نظر یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا خیرآبادی پر تحریر فتویٰ کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ان پر غدر دہلی سے متعلق کوئی الزام بھی نہ لگا تھا اور جو الزام عائد کیے گئے تھے وہ دراصل دوسرے مولوی فضل حق کے کام تھے۔'' (مرجع سابق)

اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر کا موقف بھی یہی ہے، وہ کہتے ہیں:
''مولانا فضل حق خیرآبادی جن پر غلطی سے ایک ہم نام کے دھوکے میں

مقدمہ قائم ہوا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔"

(خطوط غالب، جلد دوم، ص:612)

مولانا عرشی کے اس فیصلے کو شمیم طارق نے بھی اپنے اسلوب میں کچھ اس طرح دہرایا:

"نام اور عہدے میں مشابہت کے سبب انھیں (مولانا خیرآبادی) کو گرفتار کیا گیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے ایک اور صاحب تھے جن کا نام مولوی سید فضل حق تھا۔ یہ فضل حق شاہجہانپوری ثم رام پوری کے نام سے مشہور ہیں۔ جس وقت عدالت میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے مقدمے کی سماعت چل رہی تھی اس وقت کے اخبارات میں مولوی سید فضل حق کی مجاہدانہ سرگرمیاں اور انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی خبریں بھی جگہ پا رہی تھیں، یہی نہیں مولوی سید فضل حق کی مجاہدانہ سرگرمیاں مولانا فضل حق خیرآبادی کے سر منڈھ دی گئی تھیں جس کے سبب انھیں کالے پانی کی سزا سنائی گئی تھی۔" (غالب اور ہماری تحریک آزادی، ص:35)

معرکۂ ستاون میں علامہ کی عدم شرکت کے ثبوت میں پیش کردہ مولانا عرشی کے مذکورہ خط کا مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے اختصار کے ساتھ جواب دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یہ عرضی (خط) رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، میری دیکھی ہوئی ہے، نہ علامہ کا رسم الخط ہے، نہ طرز بیان اور نہ ہی اس پر دستخط ہیں۔ آخر دستخط کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟ اصل چیز دستخط ہوتے ہیں، مہر تو تائید میں ہوتی ہے، پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ 18 دن میں علامہ نے تابڑ توڑ 3 عرضیاں روانہ کیں، جن میں سے دو بقول عرشی صاحب ضائع ہوگئیں، یہ تیسری اور آخری عرضی ہاتھ لگی۔ ریاستی محافظ خانہ کی داد دیجیے کہ اس نے ایک عرضی جناب عرشی صاحب کی تعمیر عمارت کے لیے سنگ بنیاد بنا کر محفوظ رکھی۔" (باغی ہندوستان، ص:267)

عرضی کے سلسلے میں مولانا شیروانی کا یہ شک اس حیثیت سے قابل اعتنا ہے کہ وہ نہ صرف

علامہ کے اولین سوانح نگار اور محقق ہیں بلکہ ان کے رسالۂ غدریہ اور قصائد کے مترجم اور مکتب خیرآباد کے خوشہ چیں بھی ہیں، اس حیثیت سے وہ علامہ کے اسلوب تحریر، طرز بیان اور رسم الخط کے شناسا ہیں، پھر اس اہم عرضی پر علامہ کا دستخط نہ ہونا بھی محل نظر ہے۔ لیکن اس عرضی کو دلیل بنا کر مولانا عرشی، مالک رام اور ان کے متبع محققین نے جو شعوری نتائج برآمد کیے ہیں، محض مولانا شیروانی کے اس جواب سے ان کا ازالہ نہیں ہوتا، اس لیے اس سلسلے میں کچھ باتیں عرض ہیں:

ہماری معروضات:

پہلا معروضہ: 10 مئی 1857 سے آزادی وطن کے لیے ہندوستانیوں نے اپنی مزاحمت کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ ستمبر 1857 تک زور وشور سے چلتا رہا، لیکن انھیں ہر محاذ پر شکست ہوئی۔ انگریزی سرکار جب ہر محاذ پر غالب آگئی تو نومبر 1858 میں ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے ''عام معافی'' کا اعلان شائع کیا گیا جس میں 30 دسمبر 1858 تک کی مہلت دی گئی کہ جو باغی سرکار بھی اس مدت تک ہتھیار ڈال دے گا اس پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور نہ سزا دی جائے گی۔ جیسا کہ اولین مأخذ سے معلوم ہوا کہ علامہ بھی دہلی اور اودھ میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے، لیکن اپنی پسپائی کے بعد استخلاص وطن سے مایوس اور مستقبل کے سلسلے میں متحیر تھے کہ ان کی نظر سے ''اعلان معافی'' گزرا اور وہ اس وعدے اور اعتماد پر اپنے گھر خیرآباد لوٹ آئے۔ خیرآباد پہنچ کر علامہ 26 دسمبر کو کرنل کلارک سے ملے، کرنل نے انھیں ڈپٹی کمشنر کی تحویل میں دیے جانے کا حکم دیا۔ 30 دسمبر کو علامہ ڈپٹی کمشنر سے مل کر اپنے گھر میں نظر بند رہے اور پھر 30 جنوری 1859 کو انھیں گرفتار کر کے لکھنؤ روانہ کر دیا گیا جہاں 22 فروری کو مقدمہ پیش ہوا۔

علامہ ''اعلان معافی'' کے پیش نظر اپنے گھر لوٹے تھے اس اعتماد کے ساتھ کہ انھیں گرفتار نہیں کیا جائے گا، نہ ان پر مقدمہ چلایا جائے گا اور نہ سزا سنائی جائے گی، مگر اس اعلان معافی کے برعکس سب کچھ ہوا۔ اس وعدہ خلافی پر اپنے کرب کا اظہار علامہ نے متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ 9 جنوری 1860 کو انڈمان سے انھوں نے وزیر ہند کے نام ولایت میں رہائی کی ایک درخواست بھیجی، اس میں فرماتے ہیں:

''میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا اور صرف اسپیشل کمشنر کے فیصلے کی اور

حکومت ہند سے اپنی درخواست کی نقلیں ملفوف کرتا ہوں، انہی سے معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر مقدمہ چلانے، میرا جرم ثابت کرنے اور پھر مجھے سزا دینے میں حضور ملکۂ معظمہ کا اعلان کی منشا کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔“
(نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی، فارن پولیٹیکل، ستمبر 1860، نمبر 556، بحوالہ: مولانا فضل حق خیرآبادی، از مالک رام، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: جون 1960)

آگے فرماتے ہیں:

”ملکۂ معظمہ کے اعلان میں آخری تاریخ دسمبر 1858 مقرر کی گئی تھی۔ اس میعاد کے گزرنے سے پہلے ہی میں سیتاپور کے اعلیٰ فوجی افسر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان سے اس مفاد کی سند بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد میں انہی کی زیرِ ہدایت اپنے مکان پر خیرآباد چلا آیا اور یہاں پہنچ کے میں نے وہ سند خیرآباد کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل کرا دی۔ جنوری 1859 میں مجھے زیرِ حراست لکھنؤ لائے اور یہاں مجھ پر مقدمہ قائم ہوا اور مارچ میں میرے خلاف فیصلہ ہوا۔“ (مرجع سابق)

”اعلانِ معافی“ کے برخلاف علامہ پر کارروائی کیے جانے پر انھوں نے اپنے ”قصیدۂ دالیہ“ میں بھی اشعار نمبر 36,37,36,39,40 کے تحت یوں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا:

”36۔ جب ملکہ نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا خواست گار دشمن، باغی اور سرکش باقی نہیں رہا۔

37۔ تو اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی، کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔

38۔ پہلے وعدہ کر کے لوگوں کو آرزومند بنا دیا۔ پھر عداوت و ظلم سے کام لیا۔ دراصل اس کا وعدہ، وعید کے لیے مکر تھا۔

39۔ اس کافرہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں پڑ کر میں

بھی اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ آیا۔

40- ہمارے ساتھیوں میں دوسرے روپوش لوگ بھی واپس آگئے، مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈال دیا۔"

(الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) ص:111)

علامہ نے اسی غصے کا اظہار "رسالہ غدریہ" میں بھی کیا ہے☆

اس تفصیل کے بعد مذکورہ ناقدین سے چند سوالات قائم کیے جاسکتے ہیں:

(الف) علامہ خیرآبادی نے معرکۂ ستاون میں جب عملی وفکری شرکت ہی نہیں کی تھی بلکہ ساری باغیانہ سرگرمیاں مولوی سید فضل حق سے متعلق تھیں تو پھر "اعلان معافی" سے علامہ کا کیا تعلق تھا؟

(ب) سارے جرم جب مولوی سید فضل حق رام پوری کے تھے اور اعلان معافی ایسے باغیوں کے لیے تھا تو علامہ بار بار یہ کیوں کہتے ہیں کہ "مجھے سزا دینے میں حضور ملکہ معظمہ کے اعلان کی خلاف ورزی کی گئی ہے؟"

(ج) جب علامہ نے جنگ میں حصہ ہی نہیں لیا تھا تو پھر ان کا اپنے وطن پہنچ کر اعلان معافی کی معیاد گزرنے سے پہلے ہی سیتاپور کے اعلیٰ فوجی افسر کی خدمت میں حاضر ہونے، ان سے مفاد کی سند حاصل کرنے، ان کی زیر ہدایت اپنے مکان میں رہنے اور سند مفاد کو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل کرنے کا کیا جواز بنتا ہے؟

دوسرا معروضہ: مولانا عرشی، غلام رسول مہر اور شمیم طارق تینوں حضرات نے یہی کہا ہے کہ علامہ پر مقدمے میں جو الزامات عائد کیے گئے وہ سید فضل حق رام پوری کے تھے اور اس سبب انھیں کالے پانی کی سزا بھی سنائی گئی۔ حیرت کی بات ہے کہ الف، ب اور ج کے تحت مولانا عرشی نے تو ان الزامات کی فہرست بھی دے دی ہے۔ مولانا عرشی اور غلام رسول مہر تو اب رہے نہیں، کم از کم شمیم طارق صاحب کو ہی علامہ کے مقدمے کی روداد (مسل) کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اپنی ادعائیت پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اگر انھوں نے مقدمے کی مسل کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ لکھا

☆ الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) مولانا فضل حق خیرآبادی، ص:73، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور، 2001

ہے، جیسا کہ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے (کیونکہ انھوں نے مالک رام کے مضمون کا حوالہ دیا ہے اور اپنے مضمون میں مالک رام نے مقدمے کی پوری کارروائی درج کی ہے) تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ شیم طارق نے شعوری طور پر علامہ کے تعلق سے غلط بیانی کی ہے جو تحقیقی اور اخلاقی دیانت سے ماورا ہے۔

مقدمے میں علامہ پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے ان کا تعلق نہ تو بریلی کی بغاوت سے تھا، نہ پیلی بھیت کی نظامت سے اور نہ ریاست محمدی کی چکلہ داری سے۔ مقدمہ مسل سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ پر جو الزامات عائد کیے گئے وہ یہ تھے:

(الف) وہ 1857 اور 1858 کے دوران باغی سرکار کی حیثیت میں بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

(ب) اس نے بونڈی کے مقام پر مئی 1858 میں باغی سرغنے مموخاں کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔

(ج) اس نے بونڈی کے مقام پر مئی 1853 میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔(مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

مقدمے کی مسل کے مطابق نقد و جرح کے بعد یہ تینوں الزامات درست ثابت ہوئے اور علامہ کو انھی الزامات کی بنیاد پر کالے پانی کی سزا بھی سنائی گئی۔ معاصر مآخذ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ پر لگائے گئے یہ تینوں الزامات بالکل صحیح تھے، بلکہ جنگ کے دوران دہلی میں علامہ کی جو مجاہدانہ سرگرمیاں تھیں اس کی تفصیل مقدمے میں پیش نہیں کی جاسکی، کیونکہ "مسل مقدمہ مولوی فضل حق" کے مطابق "عدالت کو دہلی کے گواہ میسر نہیں تھے اور نہ ملزم (فضل حق) کو ان گواہوں پر جرح کرنے اور عائد کردہ الزامات کی جواب دہی کا موقع دیا گیا۔" لیکن سرکار کو دیگر ذرائع سے دہلی میں علامہ کی باغیانہ کارروائیوں کا علم تھا، اس لیے عدالت نے علامہ پر قائم کردہ الزامات میں ان کی باغیانہ سرگرمیوں کا دائرہ اودھ کے ساتھ "دہلی" کو بھی رکھا۔

تیسرا معروضہ: مقدمے کے دوران علامہ پر جو الزامات عائد کیے گئے ان کا تعلق مولوی

سید فضل حق شاہجہاں پوری ثم رام پوری سے کبھی نہیں رہا، کیونکہ احمد علی خاں شوق کی ''تذکرۂ کاملان رام پور''، پروفیسر ایوب قادری کی ''جنگ آزادی 1857: واقعات وشخصیات'' اور خود شمیم طارق کی ''غالب اور ہماری تحریک آزادی'' میں دی گئی تفصیل کے مطابق مولوی سید فضل حق رام پوری کی باغیانہ سرگرمیوں کے علاقے دہلی اور اودھ نہیں تھے، نہ ہی وہ ان علاقوں میں شہید ہوئے اور نہ ہی ان جگہوں پر وہ کبھی سرکاری ملازمت میں رہے- مولوی سید فضل حق رام پوری کا تعلق باغیانہ سرگرمیوں کے درمیان کبھی بھی بونڈی کے مقام سے نہیں رہا اور نہ ہی انھوں نے باغی سرغنہ ممو خاں کی مجلس مشاورت میں حصہ لیا- اسی طرح سرکاری ملازم عبدالحکیم کے قتل کرنے کی ترغیب میں بھی ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا- جبکہ معاصر مآخذ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ خیر آبادی کی جہادی سرگرمیاں دہلی اور اودھ میں تھیں، وہی بونڈی کے مقام پر ممو خاں کی مجلس مشاورت کے میر تھے اور انھوں نے ہی عبدالحکیم کے قتل کا فتویٰ دیا تھا-

چوتھا معروضہ: مسل مقدمہ میں ''نقل فیصلہ'' کے تحت علامہ کے تعلق سے جو تفصیل درج ہے، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ پر جو الزامات عائد کیے گئے وہ ''فضل حق خیر آبادی'' ہی کی حیثیت سے عائد کیے گئے- ان الزامات کا تعلق مولوی سید فضل حق رام پوری سے نہیں تھا- چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> (الف) دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں کے حکام سے بھی اس سے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو حالات تحریر کیے، ان سے معلوم ہوا کہ 1857 میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں-
>
> (ب) دہلی میں بھی اس کا یہی کام تھا اور اودھ میں بھی اس نے اپنی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں-
>
> (ج) بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا- یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا- (مرجع سابق)

ان اقتباسات کے بعد اس وضاحت کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ مولوی سید فضل حق رام پوری کے کسی بھی نوعیت سے دہلی سے "پرانے تعلقات" نہیں رہے۔ دہلی سے یہ "پرانے تعلقات" علامہ کے تھے۔ وہ دہلی میں پلے بڑھے، تعلیم حاصل کی، رہائش اختیار کی، نکاح ثانی کیا، مختلف عہدوں پر رہے، ان کے احباب کا حلقہ یہیں کا رہا اور پھر ان کی مجاہدانہ سرگرمیاں بھی دہلی میں رہیں۔ اس کے علاوہ وہ علامہ خیرآبادی ہی تھے جو بغاوت شروع ہونے کے وقت الور میں راجا بنے سنگھ کے ملازم تھے، جہاں سے وہ دیدہ و دانستہ دہلی آئے۔ مولوی سید فضل حق کا تعلق نہ الور کی ملازمت سے رہا اور نہ ہی وہ دہلی آئے۔

یہ تو تھے تاریخی اور دستاویزی ثبوت جس سے مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ:

● علامہ فضل حق خیرآبادی کی گرفتاری "فضل حق خیرآبادی" کی ہی حیثیت سے ہوئی۔

● علامہ خیرآبادی پر مقدمے کے دوران جو الزامات لگائے گئے وہ درست تھے، ان کا تعلق مولوی سید فضل حق رام پوری سے نہیں تھا بلکہ علامہ سے ہی تھا۔

● علامہ پر جو الزامات عائد کیے گئے انہی کی بنیاد پر انھیں سزا بھی سنائی گئی۔

ان کے علاوہ چند قرائن اور دلائل اور بھی ہیں جن سے ہم نامی کے اس شعوری مغالطے کی مزید اصلاح ہوتی ہے۔

پانچواں معروضہ: ان دستاویزی شواہد کے بعد اب اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر علامہ خیرآبادی نے اپنے مقدمے کے دوران یہ بیان کیوں دیا کہ "فضل حق ایک اور شخص کا نام ہے، مجھے اس کی جگہ گرفتار کرلیا گیا ہے۔" اس کا سیدھا جواب ایک ہی کہ انھوں نے خلاف واقعہ یہ بیان دے کر اپنی رہائی کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہ جواب کسی ظن اور تخمین کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ معرکۂ ستاون کے جتنے بھی مجاہدین گرفتار کیے گئے ان میں سے کسی نے بھی انگریزی ظلم و بربریت کے خوف سے یہ اقرار نہیں کیا کہ میں 1857 کی جنگ میں سرکار انگریزی کے خلاف باغیانہ کردار ادا کر رہا تھا، بلکہ ان میں سے اکثر نے مقدمے کے دوران اپنی رہائی کے لیے عدالت کو اپنی مظلومیت اور بے قصوری کی داستان سنائی۔

اس دعوے کے ثبوت میں علامہ خیرآبادی کے علاوہ مزید دو مرکزی شخصیات کو پیش کیا جاسکتا

ہے-ایک بادشاہ ہند بہادر شاہ ظفر اور دوسرے حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کے پوتے نواب خاں بہادر خاں شہید-ان دونوں حضرات نے مقدمے کے دوران جنگ میں اپنی کسی طرح کی بھی شرکت سے برأت کا اظہار کیا اور مختلف حیلوں کے ذریعے سزا سے بچنے کی کوشش کی-ظاہر ہے کہ ان دونوں کا یہ عمل حقیقت کے برخلاف تھا-بہادر شاہ ظفر کی اس تفصیل کو جاننے کے لیے ان کے مقدمے کی روداد (مسل) دیکھی جاسکتی ہے-اس میں درج ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے مقدمے کے دوران 9 مارچ 1858 کو 21 ویں روز کی عدالتی کارروائی میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی صفائی کے لیے عدالت کو اپنا تحریری بیان دیا، جس میں انھوں نے ایک بار نہیں بار بار اس بات کو دہرایا کہ "یہ سپاہ ہی تھی جس نے جو چاہا کیا، میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا-"

(بہادر شاہ کا مقدمہ، ص:298)

اسی طرح جب نواب خاں بہادر خاں شہید پر مقدمہ قائم ہوا تو انھوں نے بھی اپنی برأت کا اظہار کیا-نادم سیتاپوری نے لاہور (پاکستان) کے قدیم اخبار "کوہ نور" کی فائل سے نواب خاں بہادر کے مقدمے کا ایک حصہ نقل کیا ہے-مقدمے کے دوران نواب صاحب نے اپنے بیان میں کہا:

> "جب تک فوج باغی بریلی میں رہی، کسی نے اطاعت نہیں کی، اور میرے پاس فوج نہ تھی کہ ان کو شرارت سے باز رکھتا، میں نے کسی صاحب بہادر کے مارے جانے کا حکم نہیں دیا- بلکہ میں نے ملک کو بدمعاشوں کی یورشوں سے بچانے کے واسطے کوششیں کیں- میں بیکس تھا اور انتظام شریروں کا نہ کر سکا-انھوں نے میرے حکم کو نہیں مانا بلکہ وے سب مرضی خود (پر) کاربند رہے- مجھ کو معلوم ہے کہ ایک اشتہار بھی درباب قتل صاحبان انگریزی کے جاری ہوا تھا- وے کہتے تھے کہ فرنگی اب نہیں آویں گے، جب میں نے آمد آمد انگریزوں کی سنی تو میں فوراً بریلی سے نکل گیا-اور فوج انگریزی سے صف آرا نہیں ہوا-" (سہ ماہی "العلم": اکتوبر تا دسمبر 1971، ص:21 بحوالہ باغی ہندوستان، ص:422)

حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ نواب بہادر نے جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیا، ان کے

مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل تاریخ کی مختلف کتابوں میں درج ہے کہ کس طرح انھوں نے فوجوں کو منظم کیا اور انگریزی سپاہیوں کے مقابلے میں داد شجاعت دی۔ اگر ان دونوں حضرات کے لیے یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سزا سے بچنے کے لیے اس طرح کا خلاف واقعہ بیان دیا تھا تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ علامہ خیرآبادی کے اس بیان کی بھی یہی توجیہہ کی جانی چاہیے اور ان کی مجاہدانہ قربانیوں کو مولوی سید فضل حق رام پوری کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ اگر بالفرض نواب رام پور کے نام علامہ کی اس عرضی کو درست مان بھی لیا جائے تو اس عرضی کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ وہ عرضی بھی اپنی رہائی اور سزا سے بچنے کی ایک کوشش تھی، کیونکہ درجنوں معاصر شواہد اس ایک عرضی اور اس حوالے سے علامہ کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔

علامہ کے مذکورہ بیان پر یہ تو الزامی جواب تھا، اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مقدمے کے دوران علامہ کے اس بیان کو خود عدالت نے ''خلاف واقعہ'' قرار دیا۔ مقدمہ کے ''نقل فیصلہ'' میں اسپیشل کمشنر نے کہا:

> ''اس (فضل حق خیرآبادی) نے مقدمے کے دوران میں ایک موقع پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں۔ لیکن یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ وہ دوسرا شخص سابق میں ضلع بریلی کا تحصیل دار تھا اور پچھلے ایام میں چکلہ دار اور باغیوں کا سرغنہ رہا ہے، لیکن ملزم (فضل حق خیرآبادی) تو کبھی صاحب سیف رہا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ہمیشہ صاحب رائے و مشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے۔'' (مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

چھٹا معروضہ: ہم نامی کا مغالطہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب دونوں ہم نام افراد کی علمی اور عملی خدمات کی شہرت نہ ہو یا دوسرے لفظوں میں دونوں گم نام یا غیر معروف ہوں، ایسی صورت میں لوگ عموماً ایک دوسرے کے علم یا عمل کے سلسلے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نام افراد میں سے کوئی ایک علمی اور عملی حیثیت سے معروف و مشہور ہو تو اس وقت ہم نامی کا مغالطہ بعید از امکان ہوتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں علامہ فضل حق خیرآبادی اور مولوی سید فضل حق شاہجہانپوری ثم رام پوری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

علامہ فضل حق خیرآبادی بحیثیت ایک متکلم، فلسفی، منطقی، ادیب، مفکر، مدرس اور شاعر معروف ومشہور تھے۔ جن کے تعلقات ہندوستان کے بادشاہ، امرا، نوابین، شہزادگان اور والیان ریاست سے تھے۔ ہندوستان کے مختلف والیان ریاست نے جن سے علمی، فکری اور انتظامی امور میں استفادہ کرنا باعث فخر سمجھا اور انھیں اپنی ریاستوں (ٹونک، رام پور اور الور) میں اعزاز واکرام کے ساتھ رکھا۔ دہلی، لکھنؤ اور رام پور جیسے ہندوستان کے مراکز میں وہ مختلف اعلیٰ مناصب پر رہے۔ ان کے احباب میں غالب، مومن اور آزردہ جیسی علمی وفنی شخصیتیں تھیں، آبائی اور نسبی طور پر ان کا خانوادہ معروف تھا اور ان کے تلامذہ میں ہندوستان کے جلیل القدر افراد تھے۔ انھی سب وجوہات کی بنا پر اس دور میں یا اس کے بعد جتنے بھی معروف تذکرے لکھے گئے ان میں علامہ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا گیا۔ خواہ وہ ''آثار الصنادید'' مؤلفہ سر سید احمد خاں، ''تذکرہ علمائے ہند'' مؤلفہ مولوی سید رحمان علی، ''علمائے ہند کا شاندار ماضی''، مؤلفہ مولانا سید محمد میاں'' ہمارے ہندستانی مسلمان'' از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ہو یا پھر ''نزہۃ الخواطر'' مؤلفہ مولانا سید عبدالحی لکھنوی۔ اس کے علاوہ ان کے جتنے بھی معروف معاصر گزرے ہیں ان میں سے اکثر نے اپنی کتابوں اور تذکروں میں ان کا ذکر کسی نہ کسی جہت سے ضرور کیا ہے۔ اُمرا وسلاطین، عوام اور اہل علم کے علاوہ علامہ خیرآبادی کی شہرت انگریزی حکام کے درمیان بھی تھی جس کا اعتراف خود علامہ نے اپنے ''رسالہ غدریہ'' میں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ میں ایمان واسلام میں راسخ العقیدہ ہوں اور علامۂ وقت ہونے کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہوں۔''
>
> (الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) ص:111)

علامہ کے اس دعوے کی تصدیق ان کے مقدمے کے دوران ''نقل فیصلہ'' میں اسپیشل کمشنر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

> ''وہ (مولانا فضل حق خیرآبادی) انگریزی ملازمت ترک کرکے اودھ، رام پور، الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا، اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے، جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں

دیکھا تھا وہ بھی مولوی فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے۔''

(مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

دوسری طرف مولوی سید فضل حق رام پوری تھے جو علامہ کی مذکورہ تمام خصوصیات میں سے کسی خصوصیت کے حامل نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ معاصر تذکرے نہ صرف ان کے کارناموں بلکہ ان کے ذکر سے بھی خالی ہیں۔'' تذکرۂ کاملان رام پور'' میں ان کا ذکر بھی آیا ہے تو صرف گیارہ سطروں میں، جس میں ان کی ولادت ووفات کے سنین بھی ندارد ہیں۔ اسی کتاب سے پروفیسر ایوب قادری نے اپنی کتاب ''جنگ آزادی 1857 : واقعات وشخصیات'' میں ان کے چند سطری کوائف کو نقل کیا ہے، حیرت ہے کہ ایوب قادری جیسا محقق، وسیع المطالعہ اور مختلف تذکروں کا مرتب بھی اس میں کچھ زیادہ اضافہ نہ کر سکا۔ ایسے میں علامہ خیر آبادی کی شہرۂ آفاق اور عبقری شخصیت کے کارنامے کو مولوی سید فضل حق رام پوری جیسے غیر معروف شخص کی سرگرمیوں سے مشتبہ کرنا مضحکہ خیز طرز تحقیق ہے۔

ساتواں معروضہ: ہم نامی کی وجہ سے علامہ خیر آبادی کی جنگ آزادی میں شرکت پر جو شبہات وارد کیے گئے تھے مقدمے کی مسل اور دیگر دلائل کے ذریعے ان کی عدم صحت کو ثابت کر دیا گیا، تاہم علامہ نے ہم نامی کی وجہ سے اگر اپنی پریشانی کا ذکر کیا ہے تو تحقیقی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی حیثیت سے یہ سچ ہے کہ مولوی سید فضل حق رام پوری تیرھویں صدی ہجری کی ایک شخصیت گزری ہے، جنھوں نے معرکۂ ستاون میں بریلی، پیلی بھیت اور جھانسی کے اندر اپنے کارنامے دکھائے، اور یہ صحیح ہے کہ ہم نامی کی وجہ سے علامہ خیر آبادی کو کچھ مشکلات کا بھی سامنا رہا، لیکن ان مشکلات کا تعلق مقدمے کے دوران ان پر عائد کردہ الزامات سے نہیں تھا جیسا کہ مقدمے کی روداد سے پتا چلتا ہے، بلکہ محض اخبارات کی رپورٹنگ سے تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب علامہ کے مقدمے کو عدالت میں پیش کرنے کی تیاری چل رہی تھی تو اخبارات میں ان کے تعلق سے خبریں بھی شائع ہو رہی تھیں، ان خبروں میں مولوی سید فضل حق رام پوری کے کچھ کارنامے بھی علامہ سے منسوب کیے جا رہے تھے، جس سے ان کے مقدمے کی شنوائی میں مزید مشکلات بڑھ رہی تھیں۔ پروفیسر ایوب قادری نے اس ہم نامی کے تعلق سے یہی بات

اپنی کتاب ''جنگ آزادی 1857: واقعات وشخصیات'' میں لکھی ہے☆:

''یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ جنگ آزادی کے بعد جب علامہ فضل حق خیرآبادی کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا اور اس زمانے کے اخبارات علامہ فضل حق سے متعلق مختلف خبریں شائع کررہے تھے تو ان خبروں میں روہیل کھنڈ سے متعلق مولوی فضل حق شاہجہاں پوری کی انقلابی وجنگی سرگرمیاں ہم نام ہونے کی وجہ سے علامہ فضل حق خیرآبادی کے سرمنڈھ دی گئیں، ظاہر ہے اس طرح علامہ خیرآبادی کا مقدمہ اور خراب ہورہا تھا چنانچہ اس سلسلے میں علامہ خیرآبادی نے نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور کو ایک خط لکھا۔''

(جنگ آزادی 1857: واقعات وشخصیات، ص: 568)

پروفیسر ایوب قادری کی یہ بات اس لیے بھی زیادہ باوزن معلوم ہوتی ہے کہ مولانا عرشی کا پیش کردہ علامہ کا عریضہ بنام والی رام پور 18 فروری 1859 کا ہے، جب مقدمے کی تیاری چل رہی تھی، اس عریضے کے دو روز کے بعد ہی ان کا مقدمہ 21 فروری کو عدالت میں پیش ہوا۔ پھر مولانا عرشی نے عریضے کے سلسلے میں یہ بھی کہا تھا کہ:

''مولانا خیرآبادی نے ابتلا کے سلسلہ میں نواب رام پور کو تین خط لکھے تھے، چونکہ آخری خط میں ان سے مدد کی خواہش کی گئی ہے اس لیے قیاس یہ ہے کہ پہلے دو خطوں میں بھی اس قسم کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہوگا۔''

(مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857 کا فتویٰ جہاد، ماہنامہ تحریک دہلی،

☆اسی کتاب سے تقریباً یہی بات شمیم طارق نے بھی لکھی ہیں (جیسا کہ اس بحث کے شروع میں ان کے اقتباس سے ظاہر ہے) لیکن علامہ کے سلسلے میں اپنے مفروضہ موقف کو تنومند کرنے کے لیے اخیر میں ایوب قادری کے موقف ''اس طرح علامہ خیرآبادی کا مقدمہ اور خراب ہورہا تھا'' کی جگہ مولانا عرشی اور مہر صاحب کی تقلید میں یہ اضافہ کردیا ''مولوی سید فضل حق کی مجاہدانہ سرگرمیاں مولانا فضل حق خیرآبادی کے سرمنڈھ دی گئی تھیں جس کے سبب انھیں کالے پانی کی سزا سنائی گئی تھی۔'' مقلدانہ تحقیق اور اسلوب بیان کے ساتھ کسی کی تحریر میں بھی ایسی بوالعجبیوں کا در آنا خلاف توقع نہیں ہے۔

شمارہ: اگست 1957)

مولانا عرشی کی اس بات سے ایوب قادری کے (عریضے کے سلسلے میں) مذکورہ بیان کو مزید توانائی ملتی ہے، کیونکہ علامہ کا یہ عریضہ اگر ان کی گرفتاری کے بعد 18 فروری کا ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ پہلے لکھے گئے بقیہ دونوں عریضے بھی گرفتاری کے بعد ہی ارسال کیے گئے ہوں گے، جب اخبارات والے ہم نامی کے شبہے میں مولوی سید فضل حق کے کارناموں کو علامہ کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ علامہ نے دیکھا ہوگا کہ جب مولوی سید فضل حق کے کارناموں کی وجہ سے ان کا مقدمہ خراب ہو رہا ہے تو پھر اپنے بچاو کے لیے وہی کام کیا جو اخبارات کر رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اخبارات مولوی سید فضل حق کے کارنامے کو علامہ کی طرف منسوب کر رہے تھے، علامہ اپنے بچاؤ کے لیے اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کو مولوی سید فضل حق کی طرف منسوب کر کے چھپانے کی کوشش کرنے لگے اور پھر مقدمے کے دوران وہ بیان دے ڈالا جس کو علامہ کے ناقدین پیش کر کے ان کی عدم شرکت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس رخ سے اگر مذکورہ عریضے اور علامہ کے بیان کو دیکھا جائے (معاصر شواہد بھی اسی پر اصرار کرتے ہیں) تو ان دونوں سے بھی علامہ کی جنگ آزادی میں عدم شرکت کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ ہم نامی کا جن بوتل میں بند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

□□□

علامہ فضل حق خیرآبادی اور انگریزی ملازمت

علامہ فضل حق خیرآبادی کے ناقدین نے جن چند دلائل کے ذریعے ان کی معرکۂ ستاون میں عدم شرکت کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور انھیں مختلف اسالیب میں دہراتے رہے، ان میں سے ایک ''انگریزی ملازمت'' بھی ہے۔ علامہ کے ناقدین کا مجموعی طور پر یہ خیال ہے کہ انھوں نے پوری زندگی انگریزوں کی ملازمت کی، ان سے خوشامدانہ اور دوستانہ رویہ رکھا اور انگریزی ملازمت کے ذریعے ان کے اقتدار کو مستحکم کیا، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے 1857 کی جنگ میں حصہ لیا ہوگا۔ تاہم اپنے ناکردہ گناہوں کی وجہ سے اپنے ممدوح (انگریزوں) کے ذریعے سزا پانے کے بعد ان کی سوچ کا زاویہ بدلا اور پھر انھوں نے انگریزوں کی مذمت میں قلم اٹھالیا۔ رسالۂ غدریہ اور قصائد فتنۃ الھند اسی بدلے ہوئے زاویۂ فکر کے نتائج ہیں۔ اس خیال پر مشتمل چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

> ''جس وقت اللہ کے یہ فرماں بردار بندے (سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی) دین وملت کی خاطر میدان جہاد میں اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے اس زمانے میں اس تحریک کے سب سے زیادہ مخالف مولانا فضل حق خیرآبادی (ف:1278ھ/1861) ایجنٹ دہلی کے محکمہ میں

سر رشتہ دار اور مولوی فضل رسول بدایونی (ف:1286ھ/1872) کلکٹری بدایوں (سہسوان) میں سر رشتہ دار تھے۔حکومت برطانیہ کی دوراندیشی اور پالیسی ملاحظہ ہو کہ اس نے مسلمانوں کے ذہین اور صاحب علم وفضل طبقہ کو سرکاری خدمات کے لیے حاصل کرلیا''۔

(تواریخ عجیب (کالا پانی) حاشیہ،ص:23)

انگریزی ملازمت میں شامل کچھ مزید علما کا نام شمار کرانے کے بعد فرماتے ہیں:

''ہند پاکستان کے وہ اعاظم وافاضل ہیں جنھوں نے منصب افتا، قضا اور صدر الصدوری کے ذریعے سرکار کمپنی کے انتظام واقتدار حکومت کو بحال اور مضبوط تر کیا۔'' (مرجع سابق،ص:24)

اسی فکر کی ترجمانی کچھ اضافے کے ساتھ شمیم طارق نے بھی یوں کی ہے:

''شاہ اسماعیل نے شروع ہی سے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، مولانا فضل حق نے انگریزوں کی خدمت وملازمت کے باوجود قید وبند کی مصیبت اٹھائی تو ان کے مخالف ہو گئے۔'' (غالب اور ہماری تحریک آزادی،ص:41)

آگے فرماتے ہیں:

''مولانا کی سرگرمیاں اور حکومتی ذمہ داریاں بھی یہ تسلیم کرنے میں مانع ہیں کہ انھوں نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہوگا، کیونکہ 1831 میں معرکۂ بالاکوٹ کے بعد بھی وہ نہ صرف حکومت کی ملازمت میں تھے بلکہ جھجھر، الور، ٹونک، سہارن پور اور رام پور میں حکومتی عہدہ سنبھالتے ہوئے 1848 میں لکھنؤ میں حضور تحصیل کے مہتمم وصدر الصدور ہو گئے تھے۔''

(مرجع سابق،ص:59)

سرکاری ملازمت کے نتیجے میں علامہ کی انگریزوں سے محبت کے اس الزام کا ہمیں مختلف جہتوں سے جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ

1- کیا صرف علامہ کا دامن فضل ہی ملازمت کی اس تہمت سے داغ دار ہے؟ ہندوستان کے

مختلف مشرب و مسلک سے تعلق رکھنے والے نامور علما اس وقت کیا کر رہے تھے؟

2- سزا پانے سے پہلے انگریزی ملازمت کو قبول کرنا علامہ کی کوئی مجبوری تھی یا پھر اس سے مطلوب انگریزوں کے اقتدار حکومت کو بحال اور مضبوط تر کرنا تھا؟

3- جن علما نے سرکاری ملازمت کی تھی کیا وہ سب کے سب معرکہ ستاون میں شریک نہیں تھے؟

4- جو علما سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے اعتقادی اور سیاسی تحریک سے متفق نہیں تھے، کیا ان لوگوں نے معرکۂ ستاون میں حصہ نہیں لیا تھا؟

5- قید و بند سے پہلے انگریزی ملازمت اور انگریزوں کے تعلق سے علامہ کا نقطۂ نظر کیا تھا؟

6- نیز کیا علامہ کے برخلاف ان کے فکری و اعتقادی حریف شاہ اسماعیل اور سید احمد رائے بریلوی انگریزوں کے مخالف تھے؟

ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے سے پہلے انحصار کے ساتھ یہ جاننا ضروری ہے کہ جب ہندوستان کے نامور علما نے انگریزی ملازمت قبول کرنا شروع کیا تو اس وقت ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات کیا تھے۔

ہندوستان کا سیاسی و معاشرتی پس منظر: ملکۂ الزبتھ کی اجازت سے برطانوی تاجروں نے 1601 میں ہندوستان میں اپنا کاروبار شروع کیا اور اپنے کاروبار کو منظم کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی، یہ دور شہنشاہ محمد اکبر کی بادشاہت کا تھا۔ اپنے کاروبار کو مضبوط کرنے کے لیے کمپنی نے دھیرے دھیرے ہندوستان کے مختلف حصوں مثلاً سورت، ہگلی، احمد آباد، برہان پور، آگرہ، اجمیر، کھمبات اور جنوبی ہند کے علاقوں میں تجارتی کوٹھیاں بنالیں اور ہندوستان کی زراعت، تجارت اور صنعت کے ساتھ حکمت عملی اور نہایت ہوشیاری سے کرسی اقتدار کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے انھوں نے بادشاہ، وزرا، نوابوں اور زمینداروں کے بیچ اپنے وفادار بھی تیار کر لیے جو ان کے حکم کے پابند تھے۔ کمپنی کی اس سازش اور ارادے کو اکبر کے بعد نہ نورالدین جہانگیر سمجھ سکے اور نہ ہی اورنگ زیب عالمگیر۔ حالانکہ اورنگ زیب ہی کے دور سے کمپنی سے وابستہ افراد نے سیاسی اور عسکری سازشیں شروع کر دی تھیں۔ کمپنی کے ان خفیہ عزائم کو سمجھتے ہوئے حاکم بنگالہ نواب سراج الدولہ، سلطان ٹیپو کے والد حیدر علی اور خود سلطان ٹیپو نے کئی عملی

اقدامات کیے مگر وہ کمپنی کو روکنے میں ناکام رہے- بات جب آگے بڑھی تو محاذ آرائی کی نوبت آئی اور 1757 میں پہلی باقاعدہ جنگ پلاسی (بنگال) میں نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان ہوئی، جس میں انگریزوں کو کامیابی ملی- اس کامیابی سے ان کے حوصلے جوان ہو گئے، اس کے بعد میر قاسم و نواب شجاع الدولہ سے بکسر (بہار) کے میدان میں 1764 میں، حافظ رحمت خاں روہیلہ سے روہیل کھنڈ میں 1774 میں، نواب غلام محمد خاں سے 1794 میں دوجوڑہ (بریلی) میں اور پھر سلطان ٹیپو سے آخری جنگ سرنگہ پٹنم (جنوبی ہند) میں 1799 میں- ان جنگوں کے بعد ہندوستان کے بیشتر علاقے انگریزوں کے زیر اقتدار آ گئے-

سقوط دہلی اور علما کے نقطۂ نظر میں تبدیلی: سرنگہ پٹنم کی فتح کے بعد انگریزوں نے شمالی ہند میں دہلی کی طرف بڑھنا شروع کیا، 1801 میں روہیل کھنڈ کا علاقہ ایک معاہدے کے تحت نواب سعادت علی خاں نواب وزیر اودھ سے انگریزوں کو مل گیا- 1803 میں لارڈ لیک کی کمان نے دہلی پر دھاوا بولا اور اس پر قابض ہو گئی- لارڈ لیک نے مرہٹوں کی قوت کو ختم کر دیا اور دوآبہ کے اضلاع بھی 1803 میں انگریزوں نے حاصل کر لیے- دھیرے دھیرے ان کی گرفت دہلی کے اطراف کے جاگیرداروں پر سخت ہوتی گئی- اس کے بعد راجپوتانہ کی ریاستوں کو بھی معاہدوں کے ذریعے قبضے میں کر لیا گیا- دہلی اور اس کے اطراف کی ریاستوں کو قبضے میں کرنے کے بعد ایک معاہدے کے تحت کمپنی کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے شاہ عالم کی بادشاہت برائے نام رہ گئی اور عملاً سارے ہندوستان پر انگریز حکومت کرنے لگے-

سقوط دہلی کے بعد ملک کی سیاسی و معاشرتی اور مذہبی حالات کو دیکھ کر قاضی ثناء اللہ پانی پتی (ف: 1225ھ/1810) اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (1239ھ/1824) نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا- پروفیسر ایوب قادری کے بقول:

> ''جس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے اور ایک طرح سے یہ فتویٰ انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا براہ راست اعلان تھا- مسلمانوں نے انگریزی ملازمت کا مقاطعہ کیا اور ان سے معاشرتی روابط کو بھی پسند نہیں کیا-''

(مولانا فضل حق خیرآبادی: دور ملازمت، ص: 14)

الطاف حسین حالی نے ''حیات جاوید'' میں ذکر کیا ہے کہ:

''دلی اور اس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے، خصوصاً جو خاندان قلعۂ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے ان کو انگریزی نوکری کا کبھی خواب بھی نظر نہ آتا ہوگا۔''

(حیات جاوید، حصہ دوم، ص:20)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فتاویٰ عزیزی جلد اول (فارسی) میں صفحہ 119 پر اس طریقہ کار کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح اس زمانے میں دہلی کے اندر خانقاہ مجددیہ کے مشائخ ایسے افراد سے نذرانے قبول نہیں کیا کرتے تھے جو انگریزی ملازمت سے وابستہ تھے۔

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت بشمول چند علما کچھ لوگوں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی، تاہم علما کا ایک بڑا طبقہ سرکاری ملازمت سے دور تھا۔ انگریزی سرکار نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد 1806 یا 1807 میں دہلی کے اندر نظم ونسق قائم کیا تو بادشاہ کی آئینی عظمت کے ساتھ ہندستانیوں کی مذہبی اور تہذیبی حیثیتوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی، صرف عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مولانا سید محمد میاں مؤلف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کے بقول:

''مغل بادشاہ کی بادشاہت اور آل تیمور کی عظمت بھی محفوظ کر دی گئی ہے۔ صرف کاروبار حکومت جو ہندو یا مسلمان امرا اور وزرا کے حوالے ہوا کرتا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی معاملات قاضیوں کے سپرد کر کے ان کو کلچرل اٹانمی (تہذیبی خود مختاری) بھی دے دی گئی''۔

(علمائے ہند کا شاندار ماضی، حصہ دوم، ص:447)

اس صورت حال نے رفتہ رفتہ انگریزی ملازمت کے تعلق سے علما کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی اور وہ یکے بعد دیگرے انگریزی ملازمت قبول کرتے چلے گئے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر وہ مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی معاملات کے تصفیے اور زبان وعلوم کی اشاعت کے لیے خود

آگے نہیں بڑھیں گے تو لامحالہ انگریز ہی ان مناصب پر بیٹھے ہوں گے- پھر یہ کہ علما اگر ان مناصب کو قبول نہیں کرتے تو انگریزی اقتدار تو کمزور نہیں ہوتا، البتہ معاشرتی اور مذہبی طور پر افراتفری ضرور پھیل جاتی- میرے اس خیال کی تائید انگریزی ملازمت کی موافقت میں شاہ عبدالعزیز کی پیش کردہ اس دلیل سے ہوتی ہے کہ ''کافر کے ہاتھ سے کوئی منصب قبول کرنا بھی جائز ہے، جب یہ معلوم ہو کہ اقامت حق اور سیاست حق اس کے بغیر ممکن نہیں-'' اس لیے یہ کہنا کہ علما نے انگریزی ملازمت اختیار کر کے سرکاری اقتدار کو بحال اور مضبوط تر کیا، بے تکی بات ہے-

اس صورت حال کا نتیجہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسی شخصیت جنھوں نے سقوط دہلی کے ابتدائی برسوں میں دارالحرب کا فتوی دے کر حکومت سے عدم تعاون کا براہ راست اعلان کیا تھا (جس سے علما کا ایک بڑا طبقہ بھی متفق تھا) وہ بھی مشروط طور پر انگریزی ملازمت کی اجازت دینے لگے اور سب سے پہلے اپنے داماد مولوی عبدالحی بڈھانوی کو اس کے لیے پیش کیا- مولانا ابوالکلام آزاد شاہ عبدالعزیز کے اس رویے کی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علمائے ثقات کا عام مسلک یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے، شاہ صاحب کا بھی ابتدا میں یہی مسلک تھا، جب کمپنی نے کلکتہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم کیا اور اس کے لیے لکھنؤ لکھا تو لکھنؤ سے ایک استفتا شاہ صاحب کے نام گیا تھا- شاہ صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر اس سے احتراز واجب ہے...... لیکن جب انگریزی حکومت پر کچھ عرصہ گزر چکا تو انگریزوں کی کوششیں جو وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تالیف قلب کے لیے برابر کیے جا رہے تھے، بہت کچھ کامیاب ہونے لگیں- حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا کہ خود شاہ صاحب تیار ہو گئے کہ اپنے داماد مولوی عبدالحی کو میرٹھ کے مفتی عدالت ہونے کی اجازت دے دیں اور مدرسہ عزیزیہ کی طرف سے ان کا نام پیش کریں-'' (نقش آزاد، ص:313,314 بحوالہ: 1857: پس منظر و پیش منظر، ص:64)

شاہ صاحب کے دارالحرب کے فتوے پر جس طرح علما کی کثیر تعداد نے اتفاق کیا، اسی طرح جب انگریزی ملازمت کو قبول کرنے کے سلسلے میں انھوں نے شرعی دلائل کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو عملی اور فکری سطح پر پیش کیا تو بھی علما نے عام طور پر اس سے اتفاق کیا اور انگریزی ملازمت قبول کرنے لگے۔ تاہم اس دور میں کچھ متصلب علما و مشائخ بھی رہے ہوں گے جنھوں نے شاہ صاحب کے اس قدم کو بنظر استحسان نہیں دیکھا ہوگا، کیونکہ اس بات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب ملازمت کے تعلق سے شاہ صاحب کے نظریے میں تبدیلی آئی اور انھوں نے اپنے داماد مولوی عبد الحی کو اس کے لیے پیش کیا تو شاہ غلام علی مجددی نقش بندی دہلوی (1240ھ/1824) نے ان لفظوں میں احتجاج کیا:

> حضرت سلامت سلمکم اللہ تعالیٰ علی رؤس الفقراء باختیار الفقراء بعد تسلیمات کثیرہ معروض می دارد کہ دریں وقت شخصے ظاہر نمود کہ در مدرسۂ ما فقیران مذکور نوکری کفار فرنگ۔ وقبول خدمت افتائی شود خدا آگاہ است کہ فقیر را شرف علم وعلم را شرف بنی آدم گردانیدازیں خبر ایں فقیر بسیار تاسف نمود خاک نشینی فقرا بہ از صدر نشینی اغنیا، ہرگز مولوی عبدالحی صاحب قصد ایں امر نا مبارک نکنند و برنان پارہ قناعت ساختہ للہ فی اللہ درس طالبان علم فرمایند واوقات بذکر ومراقبہ محمود دارند و دریں جا ہرگز ہرگز بعلاقہ نشوند۔ ترک وتجرید در سازیم وہر نفس را نفس آخریں انگاریم، برائے خدا باشیم بطور بزرگان خود وسلف صالح خود زیدہ امیدوار عفو گستاخی است وبشنیدن خبر نیک آنجا دل خوش می شود بانچہ لائق شاہ درویشی نیست مشوش معذور خواہند داشت زیادہ چہ۔

ترجمہ: حضرت سلامت۔ اللہ تعالیٰ آپ کو فقیروں کے سر پر فقیروں کے اختیار کے ساتھ سلامت رکھے۔ تسلیمات کثیرہ کے بعد عرض ہے کہ اس وقت ایک شخص نے بتایا ہے کہ ہم فقیروں کے مدرسہ میں کفار فرنگ کی نوکری اور مفتی کا عہدہ قبول کرنے کا ذکر ہوتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ جس

نے فقر کو علم کا شرف اور علم کو بنی آدم کے لیے شرف بنایا، اس خبر سے اس
فقیر کو بہت افسوس ہوا فقرا کی خاک نشینی اغنیا کی صدر نشینی سے بہتر ہے۔
عبدالحی صاحب اس نامبارک کام (مفتی کا منصب قبول کرنے) کا ہرگز
ارادہ نہ کریں۔ نان پارہ پر قناعت کریں۔ للّٰہ فی اللہ طالبان علم کو درس
دیں۔ ذکر و مراقبہ میں مشغول رہیں اور اس جگہ ہرگز ہرگز تعلق (ملازمت)
نہ کریں۔ ہم لوگ ترک و تجرید اختیار کریں اور ہر سانس کو آخری سانس
سمجھیں۔ خدا کے لیے اپنے بزرگوں اور سلف صالحین کے طریقہ پر رہیں۔
میں گستاخی کی معافی کا امیدوار ہوں، وہاں (مدرسہ عزیزی) کی اچھی خبر
سننے سے دل خوش ہوتا ہے اور جو بات درویشی کی شان کے لائق نہیں ہے
اس کے سننے سے تشویش ہوتی ہے۔ معذور رکھیں زیادہ کیا لکھوں۔

(فتاویٰ عزیزی (فارسی) جلد: اول، ص: 91)

شاہ عبدالعزیز کے دلائل: شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شاہ غلام علی مجددی کے اس احتجاج کا تفصیلی جواب دیا اور اپنے موقف (انگریزی ملازمت قبول کرنے) کی تائید میں شرعی دلائل پیش کیے۔ شاہ صاحب کے دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہے: (شاہ عبدالعزیز کے اس تفصیلی جواب کا فارسی متن اور اس کا ترجمہ ضمیمہ نمبر 1 میں ملاحظہ ہو)

1۔ قرآنی آیت قال الملک ائتونی میں اس بات کی دلیل ہے کہ منصب کو طلب کرنا اور اس امر کا اظہار کرنا کہ میں اس کے لیے اہل ہوں، جائز ہے۔

2۔ کافر کے ہاتھ سے کوئی منصب قبول کرنا بھی جائز ہے، جب یہ معلوم ہو کہ اقامت حق اور سیاست حق اس کے بغیر ممکن نہیں۔

3۔ اس طرح کی ملازمت میں کفار کی صحبت، کفری رسوم کی موافقت کے ذریعے اسلامی حدود میں مداہنت یا ان کی خوشامد، جھوٹ اور دیگر مفاسد میں مبالغہ آرائی جو کہ اہل ثروت کے مصاحبین کرتے ہیں، نہ ہو تو شریعت میں اس کی اجازت ہے۔

4۔ کفار کے ساتھ اس قسم کا معاملہ (وہ امور جو شریعت محمدی کے مطابق ہو کسی دوسرے کے

بغیر سنانا) جو کہ احکام شرعیہ کی اشاعت میں معاون ہے، موافق شرع جائز ہے۔

5۔ مناصب قبول کرنا، از روئے طریقت بھی درست ہے، کیونکہ مکمل ترک و تجرد ولایت کی شرط نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے اولیائے کرام ایسے گزرے ہیں جو اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔

انگریزی ملازمت میں علما کی شمولیت: تقدیم و تاخیر کی بحث سے قطع نظر انیسویں صدی کی ابتدا میں شمالی ہند کے علاقوں پر انگریزوں کے قبضہ و تسلط، بالخصوص سقوط دہلی کے بعد علما نے سرعت سے انگریزی ملازمت کو اختیار کرنا شروع کیا، اس حوالے سے شاہ عبدالعزیز جیسی مرکزی شخصیت کی تبدیلی فکر کے بعد تو ساری رکاوٹیں بھی ختم ہوگئیں اور اس رجحان میں مزید تیزی آگئی۔ بقول مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی:

> ''دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علما و ثقات کا عام مسلک یہ تھا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے، لیکن پھر آہستہ آہستہ نرم پڑتے گئے، چنانچہ دہلی کے کئی خاندانی آدمیوں نے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کا مولوی عبدالحی اپنے خویش کو ملازمت میرٹھ کی اجازت دے دینا اس دروازے کی آخری بندش کا ٹوٹنا تھا۔''
>
> (باغی ہندوستان، ص:148)

انگریزی ملازمت کو قبول کرنے میں نہ تو علامہ فضل حق خیرآبادی یا ان کے خاندان کا تفرد تھا نہ چند علما کا اختصاص، بلکہ بلاتفریق مسلک و مشرب ہر طبقے کے کثیر علما نے اس کو قبول کیا۔ مختصر تلاش و تحقیق کے بعد ایسے علما کی ایک فہرست یہاں دی جارہی ہے۔ مزید تحقیق و تلاش سے اس فہرست میں اضافہ ہوسکتا ہے۔☆

مولانا مملوک العلی نانوتوی	(ف:1851)	صدر مدرس (عربی): دہلی کالج، مدرس: اجمیر کالج، ڈپٹی انسپکٹر مدارس
مولانا احسن نانوتوی	(ف:1895)	پروفیسر (عربی و فارسی) بنارس و بریلی کالج

☆ انگریزی ملازمت قبول کرنے والے علما کی یہ فہرست زمانی ترتیب پر مشتمل نہیں ہے۔ ان علما کا مختصر تعارف ضمیمہ نمبر 2 میں ملاحظہ کریں۔

مولانا مظہر نانوتوی	(ف:1885)	مدرس: اجمیر کالج و آگرہ
مولانا منیر نانوتوی		مدرس: بریلی کالج
مولانا ذوالفقار علی دیوبندی	(ف:1904)	مدرس: بریلی کالج، ڈپٹی انسپکٹر مدارس
مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی	(ف:1907)	ڈپٹی انسپکٹر مدارس
مولوی عبدالحی بڑھانوی	(ف:1828)	مفتی عدالت: میرٹھ
مولوی امیر احمد سہسوانی	(ف:1888/89)	ملازم: آگرہ
مولوی نور الحسن کاندھلوی	(ف:1868/69)	تحصیل دار: دیوبند
مولوی عبدالاحد	(ف:1920)	تھرڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول بدایوں، ہیڈ ماسٹر "رسالہ نمبر 15 بنگال" انبالہ
مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	(ف:1912)	ڈپٹی انسپکٹر مدارس، کانپور و الہ آباد، ڈپٹی کلکٹر (موجودہ صوبہ اتر پردیش)
قاضی نجم الدین کاکوروی	(ف:1814)	اول قاضی القضاۃ: کلکتہ
مولانا فضل امام خیرآبادی	(ف:1829)	صدر الصدور: دہلی
مفتی صدر الدین آزردہ	(ف:1868)	صدر الصدور: دہلی
مولانا امام بخش صہبائی	(ف:1857)	صدر مدرس (فارسی): دہلی کالج
قاضی امام الدین کاکوروی	(ف:1824)	قاضی: بنارس، صوبہ بہار
مفتی عنایت احمد کاکوروی	(ف:1863)	منصف صدر امین: کول، بریلی
قاضی علیم الدین	(ف:1842)	مفتی عدالت، قاضی دائر و سائر، صدر اعلیٰ
قاضی حکیم الدین	(ف:1853)	سررشتہ دار، صدر امین، صدر الصدور
قاضی سعید الدین	(ف:1846)	قاضی دائر و سائر
مولانا فضل رسول بدایونی	(ف:1872)	سررشتہ دار: کلکٹری صدر دفتر سہسوان
مفتی انعام اللہ گوپاموی	(ف:1857/58)	سرکاری وکیل الہ آباد
مفتی لطف اللہ علی گڑھی	(ف:1916)	سررشتہ دار امین: بریلی

مفتی خلیل الدین خان (ف:1864/65) سفیر اودھ بدربار گورنر جنرل

مولوی مسیح الدین خان (ف:1882) میر منشی گورنر جنرل بہادر، سفیر شاہ اودھ

مولوی ریاض الدین (ف:1878) مفتی ومنصف: آگرہ

مولوی رضی الدین خان (ف:1857/58) مفتی وصدر امین: آگرہ، دہلی، صدر الصدور الہ آباد

مولوی ذکاء اللہ خاں دہلوی (ف:1910) استاذ: دہلی کالج، پروفیسر: الہ آباد کالج، ڈپٹی انسپکٹر مدارس: بلند شہر ومراد آباد

مولوی اشرف صادق پوری (ف:1908) اسسٹنٹ پروفیسر: بنارس کالج

مولوی امجد علی صادق پوری (ف:1923) پروفیسر: الہ آباد کالج

مفتی شہاب الدین (ف:1840) مفتی وصدر الصدور: مغربی ہند

قاضی وحید الدین خان (ف:1856/57) قاضی: عظیم آباد پٹنہ

مولوی محمد بخش (ف:1873) صدر الصدور: بدایوں

مولوی مجید الدین خان (ف:1853/54) صدر اعلیٰ (سول جج) اجمیر

مفتی اسد اللہ الہ آبادی (ف:1882/83) مفتی عدالت: فتح پور، قاضی القضاۃ: آگرہ، صدر الصدور: جون پور

قاضی ارتضیٰ علی گوپاموی (ف:1835/36) قاضی: مدراس

قاضی عطا رسول چریا کوٹی قاضی: الہ آباد

مولانا سید عبد الفتاح (ف:1905) مفتی عدالت: ضلع خاندیش، پروفیسر عربی و فارسی الفنسٹن کالج

مولوی علی بخش خان (ف:1884) صدر الصدور: بدایوں

مولوی احمد حسن خاں (ف:1881) صدر الصدور: بریلی

چند توجہ طلب نکات: انگریزی ملازمت کے سلسلے میں اس تفصیل کو جاننے کے بعد جو باتیں ہمیں سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں:

1-علما کا عموماً انگریزی ملازمت اختیار کرنا ان کی معاشی مجبوری بھی تھی اور سیاسی بھی، کیونکہ سقوط دہلی کے بعد جس طرح ملک کی سیاسی اور معاشرتی صورت حال تھی اس میں انگریزی پنجۂ اقتدار سے آزادی کا حصول ایک خواب تھا، کیوں کہ ماضی کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، ایسے ماحول میں مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی رہنمائی کے لیے ضروری تھا کہ وہ انگریزی ملازمت قبول کریں- ایسا کرنا حکومت کے ساتھ تعاون سے زیادہ مسلمانوں سے تعاون تھا- اگر علما نے اجتماعی طور پر سارے مناصب ٹھکرا دیے ہوتے تو پھر مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی طور پر کیا صورت حال ہوتی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے-

2-انگریزی ملازمت کو قبول کرنے میں عملی اور فکری طور پر علما کی اکثریت شامل تھی- فرق یہ تھا کہ کچھ علما نے اس کام میں عملی سطح پر پہل کی اور کچھ نے بعد میں اپنے موقف کو تبدیل کر کے انگریزی ملازمت اختیار کر لی یا کم از کم اس کی قبولیت کا شرعی فتویٰ جاری کر دیا-

3-انگریزی ملازمت کو عملی اور فکری طور پر قبول کرنے کو اگر انگریزی اقتدار کی بحالی اور استحکام میں تعاون تصور کیا جاتا ہے تو اس تعاون میں صرف علامہ فضل حق خیرآبادی شامل نہیں تھے بلکہ بہ استثنائے چند ہندوستان کے سارے علما اس میں شریک تھے-

4-انگریزی ملازمت قبول کرنے والے صرف علامہ فضل حق کے ہم فکر و ہم مسلک علما نہیں تھے، شاہ اسماعیل اور سید احمد رائے بریلوی کے ہم خیال علما کی بھی ایک بڑی تعداد تھی، مثلاً مولوی عبدالحی بڈھانوی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولوی امیر احمد سہسوانی وغیرہ-

5-جس طرح موجودہ عہد میں ہندستانی حکومت کے زیر اقتدار کسی سرکاری منصب کو قبول کرنے پر حکومت کی ہم نوائی، اس سے وفاداری اور محبت کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا اسی طرح انگریزی سرکار میں محض کسی منصب کو قبول کرنے سے انگریزوں کی طرفداری کا الزام رکھنا غلط انداز فکر ہے-

انگریزی ملازمت اور انگریز نوازی میں فرق: انگریزی ملازمت اور انگریزوں سے محبت و حمایت دو الگ الگ چیزیں ہیں- انگریزوں سے حمایت و تعاون کرنے کے لیے ان کی ملازمت کو قبول کرنا ضروری نہیں- تاریخ کا مطالعہ اس فرق کو اجاگر کرتا ہے- یہ تاریخی سچائی ہے کہ

بہت سے علما انگریزی ملازمت اختیار کرنے کے باجود زندگی بھر ان سے نفرت کرتے رہے بلکہ معرکۂ ستاون میں ان کے خلاف پورے جوش وولولے کے ساتھ حصہ بھی لیا اور ایسے بے شمار علما تھے جنھوں نے انگریزی ملازمت نہ کرنے کے باجود پوری زندگی ان سے محبت ووفاداری کا مظاہرہ کیا بلکہ ان کی حکومت کو مستحکم کرنے میں بھرپور تعاون بھی دیا۔ ایسے علما کی ایک لمبی فہرست ہے۔ تاہم ان میں خاص طور پر میاں نذیر حسین دہلوی، مولانا سمیع اللہ دہلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولوی محبوب علی اور مولوی کرامت علی جونپوری کا نام لیا جاسکتا ہے۔

● میاں نذیر حسین دہلوی کے تعلق سے مولوی جعفر تھانیسری نے ''تواریخ عجیب'' میں ذکر کیا ہے کہ:

> ''مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولت انگلشیہ کے ہیں واسطے خدمت گویندہ گری وہابیوں کے دہلی سے راول پنڈی طلب ہوئے۔'' (تواریخ عجیب (کالا پانی)، ص:81)

مولوی جعفر تھانیسری کا یہ اقبالیہ بیان بھی قابل مطالعہ ہے:

> ''عین بغاوت 1857 کے عام فتنہ کے وقت بجائے بغاوت اور فساد کے، وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں کو باغیوں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے گھروں میں چھپا رکھا۔'' (مرجع سابق، ص:84)

''تواریخ عجیب'' کے مرتب اور محشی پروفیسر ایوب قادری نے اس اقتباس کے تحت میاں جی کی سوانح ''الحیات بعد الممات'' سے یہ حاشیہ لگایا کہ:

> ''شیخ الکل میاں نذیر حسین اور ان کے صاحبزادے شریف حسین وغیرہ نے مسز لیسنس (Mrs. Leesons) کو 1857 میں ساڑھے تین ماہ اپنے گھر میں چھپا رکھا اور پھر بحفاظت تمام برٹش کیمپ میں پہنچایا اور نقد انعام حاصل کیا۔'' (مرجع سابق، حاشیہ، ص:84)

● مولانا سمیع اللہ دہلوی مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے، انھوں نے انگریزوں کی ملازمت تو نہیں کی، لیکن انگریزوں کے ہمیشہ معتمد علیہ رہے۔ مملوک علی نانوتوی کے دوسرے

شاگرد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے موصوف کی سوانح عمری لکھی ہے جو 1909 میں مطبع انوار الاسلام حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب سے ایک اقتباس پروفیسر ایوب قادری نے اپنی کتاب ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' میں نقل کیا ہے:

''16 ستمبر 1884 کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک (جو برطانوی استعمار کے خلاف تھی) کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلے میں ان کو سی ایم جی کا خطاب ملا۔''

(مولانا محمد احسن نانوتوی، ص:184)

● مولانا محمد حسین بٹالوی نے بھی کبھی انگریزی ملازمت نہیں کی تاہم انگریزوں کے بڑے وفادار رہے۔ ان کے تعلق سے نواب صدیق حسن خاں بھوپالی لکھتے ہیں:

''1857 میں مولوی محمد حسین سرگروہ موحدین لاہور، بجواب و سوال و مسئلہ اور اس فتوے کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانان ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد جنگ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا بمقابلہ اس حاکم کے کہ جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے اور از روئے شریعت اسلام عموماً خلاف وممنوع ہے اور وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اس بادشاہ کے کہ جس نے آزادی مذہب دی ہے، ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔'' (ترجمان وہابیہ ص:120، بحوالہ برطانوی مظالم کی کہانی عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری کی زبانی، ص:733)

اس فتوے کے تعلق سے پروفیسر ایوب قادری نے لکھا ہے:

''جماعت اہل حدیث کے سرگروہ مولوی محمد حسین بٹالوی (1256ھ/ 1338ھ) نے سرکار انگریزی سے موافقت اور وفاداری کا ثبوت اس

طرح دیا کہ جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ ''الاقتصاد فی مسائل الجہاد''
تصنیف کیا اس کتاب کے ترجمے اردو انگریزی اور عربی میں ہوئے انگریزی
اور اردو ترجمے سر چارلس ایلیکسن اور سر جیمس لائل، گورنران پنجاب کے نام
معنون کیے گئے ہیں۔'' (تواریخ عجیب (کالا پانی) حاشیہ، ص:85)

مذکورہ فتوے کے حوالے سے مولانا مسعود عالم ندوی نے ذکر کیا ہے:

''معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی
سے انھیں جاگیر بھی ملی۔'' (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ص:20)

● مولوی محبوب علی سید احمد رائے بریلوی کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کے تحریک جہاد کے سرگرم رکن بھی، تاہم آخری زمانے میں اپنے مرشد کی تحریک جہاد کو غلط بلکہ فساد سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ سر سید احمد خاں نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''شاید اس مضمون کے پڑھنے والے اس عجیب بات کے سننے سے بھی
خوش ہوں کہ مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو 1857 میں
باغیوں کے سرغنہ بخت خاں نے عین ہنگامۂ غدر میں طلب کیا اور ان سے
یہ درخواست کی کہ آپ اس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت
ایک فتویٰ پر اپنے دستخط کریں۔ مگر مولوی محبوب علی نے صاف انکار کیا اور
بخت خاں سے کہا کہ ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں، ہم اپنے
مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور طرہ بریں یہ ہوا
کہ جو ایذا بخت خاں اور اس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میموں اور
بچوں کو دی تھی اس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت ملامت کی۔'' (ہنٹر پر
ہنٹر، ص:32، بحوالہ: برطانوی مظالم کی کہانی عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری
کی زبانی، ص:718)

● مولوی کرامت علی جونپوری بھی سید احمد رائے بریلوی کے مرید و معتقد تھے، موصوف نے بھی کبھی انگریزی ملازمت نہیں کی لیکن انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد کی سختی سے مخالفت کرتے

رہے۔ ''تذکرۂ علمائے ہند'' مؤلفہ مولوی سید رحمان علی کے مرتب پروفیسر ایوب قادری نے لکھا ہے کہ:

''مولوی کرامت علی بن شیخ امام بخش جونپور میں پیدا ہوئے، شیخ احمد علی چریا کوٹی، مولانا احمد اللہ اناؤی اور مولانا قدرت اللہ ردولوی سے تحصیل علم کی، علم قرأت وتجوید سید ابراہیم مدنی سے حاصل کیا، سید احمد شہید کے مرید ہوئے، بنگال میں اسلام کی اشاعت کی، مولوی شریعت اللہ کی تحریک کا شدت سے رد کیا۔ انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔'' (تذکرۂ علمائے ہند، ص:396)

یہاں مشتے نمونہ از خروارے چند علما کا ذکر کیا گیا، جن میں اکثر نے انگریزی ملازمت تو نہیں کی لیکن ہمیشہ عملی اور فکری حیثیت سے انگریزی اقتدار کو مستحکم کرنے میں اپنی حصہ داری پیش کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تحقیق وتفتیش سے ایسے ہی علما کی انگریز نوازی سامنے آتی رہی ہے جو سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے عملی طور پر وابستہ رہے یا کم از کم نظریاتی حیثیت سے اس جماعت سے متفق تھے۔ خود سید صاحب اور شاہ اسماعیل دہلوی کی سیرت پر لکھی جانے والی اولین اور معاصر کتابیں نہ صرف سید صاحب اور ان کی تحریک کے تعلق سے انگریز مخالفت کی تردید کرتی ہیں، بلکہ ان میں شامل متعدد واقعات انگریزی سرکار کی معاونت کا اشارہ بھی دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ سید صاحب اور شاہ اسماعیل کی قیادت میں 1826 سے 1831 تک سرحد پر جتنی بھی چھوٹی بڑی جنگیں ہوئیں وہ سب کی سب قبائلی پٹھانوں اور سکھوں سے ہوئیں۔ تاریخ کی کسی بھی مستند کتاب میں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ مذکورہ پانچ سالوں میں سید صاحب کے قافلے سے انگریزوں کی کوئی معمولی جھڑپ بھی ہوئی ہو۔

دوسری طرف علامہ فضل حق خیرآبادی کی شخصیت تھی، جنھوں نے انگریزی ملازمت اختیار کی اور بقول پروفیسر ایوب قادری ''سید رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریک کی مخالفت کے آغاز کا سہرا بھی ان کے سر رہا۔'' اس کے باوجود علامہ اور ان کے مسلک ومنہاج پر چلنے والوں نے ہمیشہ انگریزوں سے نفرت کا اظہار کیا بلکہ معرکۂ ستاون میں بھرپور حصہ بھی لیا۔ ''مقالات سرسید''

کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہنگامہ 1857 میں پورے جوش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب کے سب علمائے کرام شامل تھے جو عقیدتاً حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسماعیل کے شدید ترین دشمن تھے اور جنھوں نے حضرت شاہ اسماعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے شاگردوں کو لکھنے کی وصیت کی ہے۔''
>
> (مقالات سرسید، حصہ شانز دہم، حاشیہ ص:252)

علامہ خیرآبادی کے تعلق سے مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا محمد حسین بٹالوی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (1256ھ/1338ھ) نے سرکار انگریزی کی اطاعت کو واجب قرار دیا اور حد یہ کہ وقت کے بعض مشہور حنفی علما (مولانا فضل حق خیرآبادی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) کو (رسالہ اشاعت السنۃ میں) سرکار سے بغاوت کے طعنے دیے۔''
>
> (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ص:21)

ان حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی ملازمت قبول کرنا اور ہے اور انگریز نوازی اور، جس کے لیے منصب کو قبول کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ تاریخی شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے جب تک اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا، علامہ خیرآبادی اور ان جیسے علما کی حب الوطنی پر سوالیہ نشان کھڑا کرنے کے لیے ایسی کمزور بیساکھیوں کی ضرورت پڑتی رہے گی۔

علامہ فضل حق خیرآبادی اور ملازمت: علامہ فضل حق خیرآبادی نے تیرہ سال کی عمر میں 1225ھ/1810 میں درس سے فراغت حاصل کیا اور اس کے ساتھ ہی تدریس کا آغاز کر دیا۔ علمی شوکت اور فکری دبدبے کی وجہ سے انھیں جلد ہی شہرت مل گئی۔ اس شہرت نے انگریزی ملازمت کی راہ ہموار کی اور انیس سال کی عمر میں 1231ھ/1816 میں سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملازمت کا آغاز کیا اور سررشتہ دار عدالت دیوانی (کچہری چیف) مقرر ہوئے۔

سولہ سال تک یہ ملازمت کی اور پھر اس عہدے سے 1245ھ / 1831 میں آپ مستعفی ہوگئے۔ اس کے بعد تاریخی طور پر اس بات کا کوئی معاصر ثبوت نہیں ملتا کہ علامہ کبھی بھی براہ راست انگریزی ملازمت میں رہے ہوں۔ حالاں کہ اکثر محققین کی تحریروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ علامہ نے دہلی کے بعد بھی مختلف جگہوں پر انگریزی ملازمت کی ہے۔ تحقیقی رسوخ کی کمی کی وجہ سے بعض محققین نے تو کھل کر بھی اس تاثر کا اظہار کر دیا ہے:

"1831 میں معرکۂ بالاکوٹ کے بعد بھی وہ نہ صرف حکومت کی ملازمت میں تھے بلکہ جھجھر، الور، ٹونک، سہارن پور اور رام پور میں حکومتی عہدے سنبھالتے ہوئے 1848 میں لکھنؤ میں حضور تحصیل کے مہتمم وصدر الصدور ہوگئے۔" (شمیم طارق، غالب اور ہماری تحریک آزادی، ص: 59)

جبکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے کہ ہر جگہ علامہ حکومتی ملازمت میں رہے۔ سر رشتہ دار عدالت دیوانی کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد مختلف ریاستوں کے نوابوں نے قدر دانی علم وفضل کی بنیاد پر انھیں اعزاز واکرام کے ساتھ اپنے یہاں رکھا جہاں علامہ نے درس وتدریس کے ساتھ بعض اوقات ریاست کے انتظامی امور میں بھی اپنی علمی اور فکری خدمات پیش کی۔

جھجھر: 1831 میں دہلی کی انگریزی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد 1832 میں والی جھجھر نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر علامہ جھجھر چلے گئے، جہاں نواب نے آپ کے لیے پانچ سو روپے مشاہرہ برائے مصارف خدام مقرر کیا۔

تاریخ جھجھر میں ہے:

"مولوی فضل حق، یہ شخص رہنے والا خیرآباد کا تھا اور آدمی بڑا نامی گرامی اور علم وفضل میں ایک علامہ روزگار تھا کہ ہندوستان میں مثل اس کے دوسرا ہم عصر کم ہوگا۔ جب اس نے عہدہ سر رشتہ داری دہلی کو چھوڑا تو قدر دانی فیض محمد خاں سے وہ جھجھر میں آیا اور ایک مدت مصاحبت نواب میں رہا۔ آخر کار بسبب وارستہ مزاجی اپنی کے نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔"

(تاریخ جھجھر، ص: 212)

جھجھر میں علامہ کے قیام کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے ایوب قادری نے لکھا ہے:

''جھجھر کے قیام میں مولانا خیرآبادی کو مصاحبت دربار سے واسطہ رہا، لیکن خیال یہ ہے کہ تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی رہا ہوگا اور طلبہ نے اکتساب فیض کیا ہوگا۔'' (مولانا فضل حق خیرآبادی: دورملازمت، ص:30)

سہارن پور: علامہ کے تمام تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ جھجھر کے بعد علامہ الور، سہارن پور اور ٹونک میں رہے۔ لیکن وہاں کب اور کتنی مدت تک رہے؟ وہاں ملازمت کی یا نہیں؟ اگر ملازمت کی تو کس کی ملازمت کی اور کس عہدے پر رہے؟ ان تمام اہم سوالوں کے جوابات دینے سے معاصر آخذ قاصر ہیں۔ اس تعلق سے امیر مینائی نے صرف اتنا اشارہ دیا ہے کہ:

''مولانا فضل حق خیرآبادی الور، سہارن پور اور ٹونک سب جگہ معزز و مؤقر رہے۔'' (انتخاب یادگار، ص:292)

اس کے علاوہ علامہ کے مقدمے کے دوران دو گواہان صفائی قادر بخش اور نبی بخش نے ظن وتخمین اور خیال وشنید پر مبنی سہارن پور کی ملازمت کے تعلق سے کہا ہے۔ قادر بخش نے مقدمے کے دوران بیان دیا کہ:

''مجھے ان کے سابق حالات سے زیادہ واقفیت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سہارن پور میں سررشتہ دار تھے۔ لیکن کب، اس کا مجھے علم نہیں۔''

(مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

سہارن پور کے تعلق سے اس کے علاوہ اور کوئی تفصیل اب تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ اس بات کا اظہار علامہ کے اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔

ڈاکٹر سلمہ سیہول لکھتی ہیں:

''علامہ فضل حق کے بڑے بھائی فضل عظیم سہارن پور میں افسر تھے۔ علامہ ملازمت دہلی کے دوران سہارن پور بھائی کے پاس جایا کرتے تھے۔ قیام سہارن پور کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔''

(علامہ محمد فضل حق خیرآبادی، ص:51)

علامہ کے حوالے سے سہارن پور کے تعلق سے جتنی تفصیل مل سکی ہے، اس سے کم از کم یہ حتمی فیصلہ نہیں سنایا جاسکتا کہ علامہ سہارن پور میں انگریزی ملازمت میں تھے، ایسا کرنا علمی اور تحقیقی دیانت کے خلاف ہوگا۔

الور، ٹونک: سہارن پور ہی کی طرح علامہ کے تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ نے ریاست الور اور ٹونک میں ملازمت کی لیکن معاصر ماخذ اس کی تفصیل سے بھی خالی ہیں۔ اس سلسلے میں دو معاصر شواہد ہیں جن سے صرف علامہ کے الور اور ٹونک میں قیام کا پتہ چلتا ہے، وہاں انھوں نے ملازمت کی یا نہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ایک تو امیر مینائی کا بیان کہ ''مولانا فضل حق خیرآبادی الور، سہارن پور اور ٹونک سب جگہ معزز و مؤقر رہے۔'' اور دوسرا علامہ کے ساتھی مفتی صدرالدین آزردہ کا وہ شعر جس میں انھوں نے علامہ کے قیام الور کا ذکر کیا ہے:

''رشکِ تہران و صفاہان شدہ دلی از من
الور از ذات ہمایون تو یوناں باشد

ترجمہ: میری وجہ سے دلی رشک تہران اور صفاہان بن گئی ہے۔ آپ کی بابرکت ذات سے الور یونان ہوگا۔'' (علمائے خیرآباد و بدایوں کے روابط، مشمولہ ماہنامہ مظہر حق ''تاج الفحول نمبر''، ص: 431)

انھی معاصر شواہد کے پیش نظر نادم سیتاپوری نے لکھا ہے کہ:

''مہاراجہ الور نے اپنے یہاں بلا لیا۔'' (غالب نام آورم، ص: 107، بحوالہ علامہ محمد فضل حق خیرآبادی، ص: 50)

اور ٹونک میں قیام کے حوالے سے مفتی انتظام اللہ شہابی نے ذکر کیا ہے کہ:

''مولانا فضل حق نواب وزیرالدولہ کے عہد میں ان کی طلبی پر ٹونک گئے۔''

(حیات علامہ فضل حق خیرآبادی اور ان کے سیاسی کارنامے، ص: 26)

محققین نے مذکورہ تینوں جگہوں کے قیام کی مجموعی مدت 1835 تا 1840 تقریباً پانچ سال بتائی ہے، ان کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ رئیس جھجھر نواب فیض محمد خاں کا انتقال 16 اکتوبر 1835 میں ہوا، اس کے بعد علامہ نے جھجھر کو خیرآباد کہا ہوگا۔ دوسری طرف قدیم ماخذ

سے پتا چلتا ہے کہ ریاست رام پور میں نواب محمد سعید خاں کے تخت نشین ہونے (20 اگست 1840) کے معا بعد دیگر علما اور ادبا کے ساتھ علامہ بھی کتابوں کے ترجمہ و تالیف پر مامور ہوئے۔

1835 تا 1840 کے درمیان الور میں راجہ بنے سنگھ اور ٹونک میں وزیر الدولہ نواب وزیر خاں وہاں کے حاکم اور رئیس تھے، انھیں کی طلبی پر علامہ وہاں گئے بھی تھے، ایسی صورت میں اگر علامہ نے وہاں قیام کے دوران ملازمت بھی کی ہوگی تو ان نوابین الور اور ٹونک کی ہی کی ہوگی۔ الور اور ٹونک میں انگریزی ملازمت کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس خیال کی بھرپور تائید علامہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، جو انھوں نے اپنے مقدمے کے دوران عدالت کو دیا۔ علامہ فرماتے ہیں:

''میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا، میں ان کے ساتھ پانچ سال رہا اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔''

(مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

علامہ 1856 سے آغاز 1857 تک بھی الور میں مہاراجہ الور کے یہاں ملازم تھے، مذکورہ بیان کا آخری حصہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

رام پور: 20 اگست 1840 میں نواب محمد سعید خاں ریاست رام پور میں تخت نشیں ہوئے اور زمام ریاست سنبھالنے کے بعد ہی چند تجربہ کار علما کو قدر دانی علم کی بنیاد پر رام پور بلا لیا اور انھیں کتابوں کے ترجمے و تالیف پر مامور کیا۔ انہی علما میں علامہ خیرآبادی بھی تھے۔ امیر مینائی نے رام پور میں علامہ کے قیام کی مدت 8 سال بتائی ہے، یعنی 1840 سے 1847 تک، پھر 1847 میں ہی علامہ رام پور سے لکھنؤ چلے گئے ان 8 سالوں میں والی رام پور نواب محمد سعید خاں نے ان کے ذمے جو کام سونپے وہ یہ تھے:

1- کتابوں کے ترجمے اور تالیف کا کام۔ یہاں پر ہی آپ نے اپنی معروف کتاب ''ہدیہ سعیدیہ'' عربی زبان میں لکھی اور نواب صاحب کے نام معنون کیا۔ یہ کتاب ہندوستان اور مصر دونوں جگہوں سے شائع ہوئی۔

2- محکمۂ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین (دیوانی و فوجداری) کے حاکم مقرر کیے گئے۔

3- اپنے صاحبزادگان نواب محمد یوسف علی خاں اور نواب محمد کاظم علی خان کی تعلیم و تربیت

کی ذمہ داری۔۔ جب یہ دونوں ریاستی کاموں میں مصروف ہوئے تو پھر ان کے صاحبزادے نواب محمد کلب علی خاں بن نواب محمد یوسف علی خان اور فدا علی خان بن نواب محمد کاظم علی خانؔ کی تعلیم وتربیت علامہ کے سپرد کردی گئی۔

ان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے اکتساب علم وفن کیا۔

حکیم نجم الحسن خاں رام پوری لکھتے ہیں:

''مولوی فضل حق صاحب فاروقی خیرآبادی ابن مولانا فضل امام صاحب کو آپ نے بلاکر نوکر رکھا۔ محکمہ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین پر مامور کیا۔ مولوی صاحب نے ہدیہ سعیدیہ فی حکمۃ الطبیعہ زبان عربی میں نواب صاحب کے نام نامی پر معنون کی ہے۔''

(اخبار الصنادید، جلد دوم، ص:21)

منشی امیر احمد مینائی رقم طراز ہیں:

''اس دارالریاست رام پور میں پہلے محکمہ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں انار اللہ برھانہم کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے اور بندگان حضور پرنور دام ملکھم اقبالھم (نواب کلب علی خاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ سال بہت اعزاز واکرام کے ساتھ رہے تھے، یہاں سے تشریف لے گئے۔'' (انتخاب یادگار، ص:292)

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور میں علامہ کی جو بھی سرگرمیاں تھیں وہ خالص علمی وتدریسی تھیں یا پھر ریاستی امور سے متعلق تھیں۔ ان سرگرمیوں کا تعلق نہ تو سرکار کمپنی کی ملازمت سے تھا اور نہ ہی ان کے اقتدار کے استحکام اور تعاون سے۔

لکھنؤ: 13 فروری 1847 کو سلطنت اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ تخت نشیں ہوئے تو علامہ رام پور سے لکھنؤ بلا لیے گئے۔ واجد علی شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد 9 جولائی 1847

کو سفارت کے عہدے سے مصلح السلطان معزول ہوئے۔ ان کی معزولی کی وجہ پروفیسر ایوب قادری نے قیصر التواریخ کے حوالے سے یہ لکھی ہے:

''وہ خوف سلطانی کی وجہ سے ریزیڈنٹ کے اکثر پیغام بادشاہ تک نہیں پہنچاتے تھے اور ریزیڈنٹ اس بات سے پریشان تھا۔ لہٰذا مصلح السلطان سفارت کے منصب سے معزول ہوئے اور طے پایا کہ کسی دوسرے شخص کو سفیر مقرر کیا جائے۔'' (مولانا فضل حق خیر آبادی: دور ملازمت، ص: 57)

اس طرح علامہ کے علم و فضل اور امتیاز و اختصاص کی بنیاد پر سفارت کے لیے تین افراد کے ساتھ علامہ کا نام بھی تجویز ہوا، مگر حافظ الملک رحمت خاں کے پوتے محمد خاں کو سفارت کا منصب عطا ہوا۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں:

''پہلے آپ کو مملکت اودھ کا سفیر بنا کر کلکتہ بھیجا جا رہا تھا، مگر پھر مرکز ہی میں ''صدر الصدور'' اور ''کچہری حضور تحصیل'' کے مہتمم کا منصب دیا گیا۔''

(سفر اور تلاش، ص: 50)

واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد نومبر 1847 میں ہی سلطنت کی درستی اور اصلاح کا کام شروع ہوا، جس کے نتیجے میں ''کچہری حضور تحصیل'' مقرر کی گئی اور علامہ کو اس کا مہتمم بنایا گیا نیز صدر الصدور کا عہدہ بھی دیا گیا۔ علامہ تقریباً 9 سالوں (1858 کی ابتدا) تک ان عہدوں پر فائز رہے۔ 4 فروری 1856 کو جب سرکار انگریزی نے واجد علی شاہ کو معزول کیا اور اودھ کی خود مختاری کو ختم کر کے اسے کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا تو علامہ بھی لکھنؤ چھوڑ کر الور چلے گئے۔ جہاں راجہ بنے سنگھ نے بقول نجم الغنی خاں ''مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی نامور منطقی کو اپنے یہاں نوکر رکھا۔''

اس طرح علامہ کی لکھنؤ کی ملازمت بھی سلطنت اودھ کی خود مختاری میں شروع ہوئی اور اسی پر ختم ہو گئی، اس ملازمت کا تعلق بھی کمپنی سرکار سے نہیں تھا۔ علامہ کی ملازمت کا آخری پڑاؤ الور تھا۔ جہاں وہ مہاراجہ الور کے ملازم رہے اور جب 1857 میں جنگ کا آغاز ہوا تو دہلی آ گئے۔ اپنی تقریباً 41 سالہ دور ملازمت میں علامہ نے ابتداً سولہ سال دہلی میں انگریزی ملازمت کی، بقیہ

پچیس برسوں تک وہ مختلف والیان ریاست کے یہاں ملازم رہے اور علم وادب کی سرپرستی فرمائی نیز مسند تدریس لگائی-اس لیے تحقیق کے نام پر علامہ کے حوالے سے یہ تاثر دینا کہ علامہ نے پوری زندگی انگریزی ملازمت کی یا ان کے دست نگر رہے، غلط زاویہ فکر ونظر ہے-

علامہ فضل حق خیرآبادی کی انگریزوں سے نفرت: علامہ فضل حق خیرآبادی شروع سے ہی انگریزوں اور کمپنی حکام سے بیزار اور ان کے مخالف رہے جس کا اندازہ متعدد معاصر شواہد اور واقعات سے ہوتا ہے- وقت گزرنے کے ساتھ انھوں نے انگریزوں کے مظالم اور مکروفریب کا جیسے جیسے مشاہدہ کیا ان کی بیزاری اور مخالفت نفرت میں تبدیلی ہوتی چلی گئی اور مخالفت اور نفرت کی وجہ سے علامہ نے معرکۂ ستاون میں پورے جوش وولولے کے ساتھ حصہ لیا- علامہ کے لکھے ہوئے قصائد فتنۃ الہند اور الثورۃ الہندیہ کے علاوہ ہم ان شواہد اور واقعات کو یہاں پیش کرنے جارہے ہیں جو علامہ کی انگریز بیزاری اور نفرت کو اجاگر کرتے ہیں-

● علامہ نے بوجہ مجبوری اپنی زندگی کا آغاز انگریزی ملازمت سے کیا، یہ ملازمت انھیں طبعاً پسند نہیں تھی، اس لیے اس سے نہ صرف مستعفی ہوئے بلکہ دوبارہ انگریزی ملازمت اختیار بھی نہیں کی- علامہ کی انگریزی ملازمت اور انگریزوں کے تعلق سے صحیح رائے کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جسے انھوں نے اپنی ملازمت کے تین برسوں کے بعد 1818 میں اپنے والد مولانا فضل امام خیرآبادی کے نام لکھا ہے- اس خط کا یہ اقتباس قابل مطالعہ ہے:

> هذاوالمملوک بفضل ربه فی رفاع حالٍ وفراغ بالٍ، لایشتکی وصبا ولایلتقی نصباً، غیر ما فی الخدمة من المحنة والمهنة، فانه یظل واقفاً بین یدی الحاکم وینسخ احکامه التی حقها أن ینسخ فی رد النظام، والذی نفسی بیده لولا خشیة العار ومظنة الشنار لارتحلت من هذی الدیار الی غیرها من الامصار، ولاتخذت التوکل معاشاً-
>
> (علامہ کی قلمی بیاض (فوٹو اسٹیٹ)، بشمولہ العلامۃ فضل حق الخیرآبادی مع تحقیق کتابہ الثورۃ الھندیہ)

ترجمہ: میں خدا کے فضل و کرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں، مجھے کسی رنج والم کا شکوہ نہیں ہے، مگر ملازمت میں ذلت وخواری بہت ہے، حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کے وہ احکام املا کرنا ہوتے ہیں جو قابل قبول نہیں ہوتے، قسم خدا کی اگر مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کبھی کا کہیں اور منتقل ہو جاتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا۔

اس خط کے حوالے سے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے لکھا ہے کہ:

''علامہ اواخر 1815 سے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہو گئے تھے۔مگر طبعاً یہ ملازمت ناپسند تھی، اس لیے 1818 میں ایک خط والد ماجد کو لکھ کر اظہار بیزاری کیا۔ منشاء پدری نہ پا کر سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ملازمت کا تلخ گھونٹ پیتے رہے اور والد ماجد کے انتقال کے دوسرے ہی سال 1831 میں اس غیر مطبوع ملازمت سے مستعفی ہو کر کچھ دن بعد ریاست جھجھر سے تعلق قائم کرلیا۔'' (باغی ہندوستان، ص:151)

● علامہ جب سررشتہ دار عدالت دہلی کے 1831 میں مستعفی ہو کر جھجھر چلے گئے تو مرزا غالب نے ''آئینہ سکندری'' کلکتہ کے مدیر کے نام 31 جنوری 1832 کو ایک مراسلہ لکھا اور اس میں اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار کیا:

''آرزو را سرانجام گفتگو دادہ می شود، نہفتہ مباد کہ قدر ناشناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر و یگانہ مولوی فضل حق از سررشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وارہاند حقا کہ اگر پایہ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماند و باز آں پایہ را بسر شتہ داری عدالت دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہدہ دون مرتبہ وے خواہد بود۔''

(کلیات نثر غالب، ص:148)

ترجمہ: اب مدعائے نگارش سنیے! حکام کی بدتمیزی اور قدر ناشناسی کی

بدولت فاضل بے نظیر مولوی فضل حق نے سررشتہ داری عدالت دہلی کی خدمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس خدمت کے ننگ و عار سے چھوٹ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے ہزار درجہ بلند منصب بھی ان کے علم و فضل کے شایانِ شان نہ تھا۔

اس خط کے حوالے سے حکیم سید محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں:

''اگر مولانا سے مرزا غالب کے مراسم اخوت واتحاد کے پیش نظر ہم انھیں مولانا کے جذبات وتاثرات تصور کریں تو بے جانہ ہوگا، خصوصاً اس لیے کہ فرنگی حکومت کے متعلق مرزا غالب نے ایسے الفاظ کہیں اور استعمال نہیں کیے۔'' (فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون، ص:22)

● مولوی نور الحسن کاندھلوی علامہ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں، مولوی صاحب 4 جنوری 1846 کو دیو بند ضلع سہارن پور کے تحصیل دار مقرر ہوئے۔ لیکن ملازمت کے دوران بعض خلاف طبیعت امور کی وجہ سے اس عہدے سے مستعفی ہو گئے، اس پر علامہ نے مولوی نور الحسن کو خط لکھا اور ان کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کی اور دینی غیرت کی وجہ سے ملازمت سے مستعفی ہونے پر مسرت کا اظہار کیا۔

''بدریافت قطع کردن آں اعز سلسلۂ روزگار بحمیت دین بغایت مسرور شدم، بفضل رزاق مطلق روزی بسیار است۔ انشاء اللہ تعالیٰ عن قریب در مظفر نگر وغیرہ اضلاع روزگار صورت ی بندد، نظر بر شانِ رزاقی باید داشت۔'' (تذکرۂ اسلاف ''حالات مشائخ کاندھلہ''، ص:147، بحوالہ علامہ محمد فضل حق خیر آبادی، ص:86-185)

ترجمہ: دینی غیرت کی بنا پر اس معزز سلسلۂ روزگار کے ختم کرنے کی اطلاع پر میں انتہائی خوش ہوا، رزاق مطلق جل شانہ کے فضل سے روزگار بہت ہے، انشاء اللہ تعالیٰ عن قریب مظفر نگر اور دوسرے اضلاع میں روزگار کی صورت بن جائے گی، اللہ تعالیٰ کی شانِ رزاقی پر نظر رکھنی چاہیے۔

● عشرت رحمانی نے اپنے دادا نواب احمد یار خاں کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو سانحہ ہنومان گڑھی ☆ کے وقت لکھنو میں کوتوال تھے:

> حضرت امیر المجاہد مولانا امیر الدین علی شاہ کی شہادت نے علامہ فضل حق کو بے حد متاثر کیا اور ان کا دل انگریزی ڈپلومیسی اور جبر و ظلم سے سخت متنفر ہو گیا۔" (جنگ آزادی کے نامور مجاہدین، ص:123، بحوالہ محمد فضل حق خیر آبادی، ص:186)

نواب احمد یار خاں کوتوال کے حوالے سے عشرت رحمانی کے اس بیان سے غلام رسول مہر کی پیش کردہ اس روایت کی تائید ہوتی ہے، مہر صاحب فرماتے ہیں:

> "ایک روایت ہے کہ مولانا نے ہنومان گڑھی کے واقعہ سے متاثر ہو کر لکھنو کی ملازمت چھوڑ دی۔" (1857 کے مجاہد، ص:202)

☆ علامہ جس وقت لکھنؤ میں صدر الصدور اور مہتمم "کچہری حضور تحصیل" تھے، اسی زمانے (7 نومبر 1855) میں یہ سانحہ رونما ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لکھنؤ کے قریب اجودھیا میں مغل بادشاہ بابر نے رام چندر اور سیتا کی رسوئی (باورچی خانہ) کی جگہ ایک مسجد بنا دی، یہ ہندو اکثریتی اور مسلم اقلیتی علاقہ تھا، اس لیے مسلمان مسجد کی حفاظت اور آبادی کی طرف سے غافل ہو گئے، یہاں تک کہ ہندوؤں نے اسے ختم کر کے اس سے متصل ہنومان گڑھی بنالی۔ صدیوں کے بعد 7 نومبر 1855 کو کچھ مسلمانوں نے اس مسجد کے احیا کی کوشش شروع کر دی، ہندوؤں نے مزاحمت کی تو مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کے لیے نکل کھڑی ہوئی جس میں ڈھائی سو سے زائد مسلمان شہید ہو گئے۔ کمپنی سرکار اس زمانے میں سلطنت اودھ پر قابض ہونے کے لیے کوشش کر رہی تھی، اس نے اس ہنگامے کو مزید ہوا دی۔ حاکم اودھ واجد علی شاہ نے اس قضیے کے حل کے لیے چار ثالثوں پر مشتمل ایک مجلس مصالحت تشکیل دی، جس کے ایک رکن علامہ بھی تھے۔ مگر انگریزی سازش سے مجلس مصالحت کا کوئی اجلاس نہ ہو سکا۔ اس دوران کچھ علما نے عدم وجوب جہاد کا فتویٰ دیا، جس میں علامہ شامل نہیں تھے، مگر ایک معاصر مؤرخ سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد زائر نے اپنی کتاب "قیصر التواریخ" میں علامہ کا بھی نام لے لیا۔ معاصر مآخذ نشاندہی کرتے ہیں کہ زائر نے یہ کتاب انگریزوں کی خوشنودی کے لیے لکھی تھی جس کی وجہ سے واجد علی شاہ نے ناراض ہو کر اسے ملازمت سے نکال باہر کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود زائر نے اپنی کتاب میں تمام مفتیوں کے فتوے اور دستخط نقل کیے ہیں، ان میں نہ تو علامہ کا فتویٰ ہے اور نہ دستخط۔ اس کے بعد لکھی جانے والی کتابوں "تاریخ اودھ" وغیرہ کا ماخذ بھی "قیصر التواریخ" ہے۔

● 4 فروری 1856 کو کمپنی سرکار نے والی اودھ واجد علی شاہ کو معزول کیا تو علامہ بھی اپنے عہدے کو چھوڑ کر لکھنو سے الور چلے گئے۔ علامہ کا یہ قدم انگریزی عمل داری سے نفرت اور بیزاری کا بھرپور اظہار تھا، ورنہ اتنے اعلیٰ مناصب کو چھوڑ کر چلے جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ایک تو 1855 کے اخیر میں رونما ہونے والا ہنومان گڑھی کا سانحہ اور مولانا امیر الدین کے ساتھ سیکڑوں مسلمانوں کی شہادت جس کے پیچھے بجا طور پر انگریزی سازش تھی، بقول حکیم سید محمود احمد برکاتی:

"یہ گورے اور کالے انگریز مل کر ایسے حالات پیدا کر دینا چاہتے تھے کہ حدود سلطنت میں بدنظمی ہو، عوام میں بے اطمینانی پھیلے، مختلف طبقات باہم دست و گریباں ہوں اور اس طرح انگریزوں کو واجد علی شاہ کے معزول کر دینے اور اودھ کا الحاق کمپنی سے کر لینے کا جواز پیدا ہو۔"

(فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص:132)

انگریزوں نے اپنی سازش میں کامیابی حاصل کر کے یہ جواز پیدا کر لیا اور اس سانحۂ ہنومان گڑھی کے معاً بعد فروری 1856 میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے انھوں نے اودھ پر قبضہ کر لیا۔ ان دونوں حالات سے متاثر اور بیزار ہو کر علامہ نے لکھنو چھوڑ دیا۔ اگر کوئی شخص انگریزی سرکار کا بہی خواہ یا دست نگر ہوتا تو ایسے موقع پر عہدہ چھوڑنے کی بجائے خوشی سے بغلیں بجاتا کہ اودھ کے کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہو جانے کے بعد اسے ذاتی طور پر پھلنے پھولنے کا موقع میسر آئے گا۔

● علامہ کی سیاسی بصیرت، اہل وطن کی محبت، علم معاشیات میں ان کی مہارت اور کمپنی سرکار کے فیصلوں پر ان کی گرفت کا اندازہ اس درخواست ☆ سے ہوتا ہے جسے انھوں نے جنگ آزادی 1857 سے تقریباً 30 سال قبل (1827 سے پہلے) معزول بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے نام رعایائے شہر کی جانب سے لکھا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب علامہ دہلی کی عدالت دیوانی میں سررشتہ دار تھے، مگر

☆ یہ درخواست پروفیسر نثار احمد فاروقی کو اپنی ایک قلمی بیاض میں دستیاب ہوئی، جس کی تفصیل انھوں نے اپنی کتاب "تلاش غالب" میں لکھی ہے۔ یہ درخواست فارسی میں ہے اور ناقص الآخر ہے، اس کی سب سے پہلی اشاعت سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی، جلد:13، شمارہ:3، جولائی 1962 میں ہوئی۔ یہاں سے حکیم سید محمود احمد برکاتی نے اپنی کتاب "فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون" میں نقل کیا، اس کے بعد متعدد جگہوں پر نقل ہوتی رہی۔

انھوں نے شہریوں کی مشکلات پر توجہ مبذول کرانے کے لیے درخواست دہلی کے ریزیڈنٹ کے نام نہیں لکھی، جبکہ یہ آسان بھی تھا اور بحیثیت سررشتہ دار علامہ کا ریزیڈنٹ سے تعلق اور اثر بھی تھا، بلکہ معزول اور وظیفہ خوار بادشاہ ہند کے نام لکھی، اس سے ایک طرف بادشاہ اور ملک کے لیے علامہ کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف انگریزی سرکار سے بیزاری کا اندازہ بھی۔ بقول حکیم سید محمود احمد برکاتی: ''اس میں کئی سیاسی اور نفسیاتی منافع ومصالح تھے''۔
(سفر اور تلاش، ص:71)

اس طویل فارسی درخواست کا خلاصہ حکیم سید محمود احمد برکاتی نے اس طرح کیا ہے:

''**ملک کی اقتصادی حالت**: یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود ومفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں، تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی کثرت نے بدحال کر دیا ہے۔

ان چاروں طبقوں کی زبوں حالت کے نتیجے میں اہل حرفہ اور ان سب کے نتیجے میں دریوزہ گر تنگی معاش کے شکار ہیں۔

دہلی کی اقتصادی زبوں حالی: دہلی میں ہوڈل وغیرہ بہت سے پرگنے جاگیر میں شامل تھے اور جاگیرداروں کے یہاں ہزاروں آدمی، فوج انتظامی امور اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ اب یہ پرگنے اور دیہات ومواضعات انگریزوں نے ضبط کر لیے ہیں اور لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔ بیواؤں کی معاش چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے اور چکی پیسنے پر موقوف تھی۔ اب رسی کی تجارت حکومت (کمپنی) نے اپنے ہاتھ

میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔ عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے اہل حرفہ اور ساہوکار بے روزگار اور رزق سے محروم ہو گئے ہیں۔

ان سب پر مستزاد اب چارلس منکاف نے یہ حکم دیا ہے کہ غریب زر چوکیداری ادا کیا کریں۔ یہ ٹیکس پہلے کبھی نہیں لیا جاتا تھا۔

دوسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر گلی کے دروازے پر پھاٹک لگایا جائے جس کا کوئی فائدہ معلوم و متصور نہیں ہے۔

تیسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ان پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر ہوں جس سے ہمیں مشکلات کا سامنا ہے۔

چوتھا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر محلے میں ۵/۵ پنچ مقرر کیے جائیں۔''

(فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون، ص: 24 تا 26)

یہ تمام شواہد اس بات کی علامت ہیں کہ علامہ اپنی پوری زندگی انگریزی حکام سے مخالفت و نفرت کرتے رہے اور ان سے استخلاص وطن کے لیے کوشاں رہے۔ جو لوگ محض علامہ کی انگریزی ملازمت کی وجہ سے انھیں انگریز نوازی کا طعنہ دیتے ہیں انھیں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

□□□

ایک نایاب قصیدے کی بازیافت

علامہ فضل حق خیرآبادی معقولات کے امام ہونے کے ساتھ عربی ادب کے ایسے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے کہ ان کی نثر ونظم پر مقامات حریری و ہمدانی اور قصائد جریر وفرزدق کا گمان ہوتا ہے- انھوں نے درجنوں قصائد لکھے اور ہزاروں کی تعداد میں اشعار کہے- علامہ کے ممتاز شاگرد مولانا سید عبداللہ بلگرامی نے علامہ کی کتاب ہدیہ سعیدیہ کے حاشیہ التحفۃ العلمیۃ میں ذکر کیا ہے کہ ان کے عربی اشعار کی تعداد 4 ہزار سے متجاوز ہے- اب تک تحقیق وتلاش سے علامہ کے عربی قصائد کے جو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان سے (علامہ کے قصائد کی تعداد کے حوالے سے) مولانا بلگرامی کے مذکورہ قول کی توثیق ہوتی ہے، جبکہ ابھی تک لاہرپور اور گوپامئو کے ساتھ علامہ کے دیوان اور بیاض کے متعدد قلمی نسخوں کی بازیافت نہیں ہوسکی ہے، خیال ہے کہ ان نسخوں کے منظر عام پر آنے کے بعد علامہ کے قصائد اور اشعار کی معلوم مجموعی تعداد میں اضافہ ہوگا- علامہ کی کتاب زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انھوں نے متعدد موقعوں پر اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے اشعار کا سہارا لیا- یہ اشعار طویل قصیدوں کی صورت میں سامنے آئے ہیں، جن کی تعداد تیس سے متجاوز ہے- ان میں زیادہ تر کا تعلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا سے ہے، جبکہ تین ایسے قصائد سامنے آئے ہیں جن کا تعلق انگریزوں کی مذمت اور معرکۂ ستاون کے احوال کے بیان سے

ہے-اس حوالے سے قصیدہ ہمزیہ اور دالیہ مشہور ہیں جبکہ تیسرا قصیدہ نونیہ ہے، جس کا ابھی تک صرف متن سامنے آیا ہے، اس کتاب میں اس کا ترجمہ شامل کر کے اس کی اہمیت کو دوچند کرنے کی کوشش کی گئی ہے-اسی سلسلے کا چوتھا قصیدہ، قصیدۂ رائیہ ہے، جس کی بازیافت کی گئی ہے-یہ قصیدہ انیسویں صدی کے ربع اول میں نظم کیا گیا ہے، اس کی بازیافت سے ان ناقدین کے الزام کی شد و مد سے تردید ہوتی ہے جو علامہ خیر آبادی پر عائد کرتے رہے ہیں کہ انھوں نے انگریزوں سے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی تو ان کے مخالف ہو گئے-

قصیدۂ رائیہ کا پس منظر: علامہ جب دہلی میں سررشتہ دار عدالت دیوانی تھے تو انھیں انگریزی حکام کے مکروفریب، ظلم واستبداد اور سازشوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس سے انگریزی سرکار اور انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت اور بیزاری میں اضافہ ہوا-اپنے اس دلی جذبات کا اظہار انھوں نے انگریزوں کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھ کر کیا-یہ طویل اور نایاب قصیدۂ رائیہ 235 اشعار پر مشتمل ہے جو تاریخی طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے-اس میں انگریزوں کے جبر، ملک پر ان کے غاصبانہ تسلط اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں پر نفرت و بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے-

بدایوں کے قلمی مجموعہ قصائد میں یہ قصیدہ موجود ہے، جس کا عنوان ہے: **فی هجو النصاریٰ والمتنصرین** (نصاریٰ اور نصرانیت پسندوں کی مذمت میں) ڈاکٹر سلمہ سیہول ☆ کا زیر طبع پی ایچ، ڈی کا عربی مقالہ ''**دیوانِ فضل حق الخیر آبادی: دراسة وتحقيق**'' میں بھی یہ قصیدہ

☆ ڈاکٹر سلمٰی سیہول کا زیر طبع پی، ایچ، ڈی کا عربی مقالہ ''دیوانِ فضل حق الخیر آبادی: دراسة وتحقيق'' میں یہ قصیدہ ہمیں ملا-ڈاکٹر سلمٰی کو 2010 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹر خالق داد ملک کی نگرانی میں مذکورہ موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ ہوئی ہے-موصوفہ اس وقت انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان میں شعبۂ عربی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں-پانچ سو سے زائد فل اسکیپ صفحات پر مشتمل اس فاضلانہ تحقیق کے سرسری مطالعے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلمٰی نے اس مقالے کو لکھنے اور مرتب کرنے میں برسوں ریاضت، محنت، مشقت اور سیاحت کی ہوگی-علامہ کے قصائد پر مشتمل متعدد قلمی نسخوں اور بیاضوں کی بازیافت، ان کا مطالعہ، نقل، اعراب کا التزام، اوزان کا تعین اور نقائص سے پاک دیوان کو مرتب کر دینا، ڈاکٹر سلمٰی کی غیر معمولی تحقیقی صلاحیت کا اشاریہ ہے- (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

منقول ہے۔سلمہ سہول نے علامہ کا یہ قصیدہ بدایوں کے ہی قلمی نسخے سے نقل کیا ہے اور اس قصیدے کو مندرجہ ذیل عنوان کے تحت درج کیا ہے: **ھجاء الإنجليز وتسرّبهم في الهند واستكبار أوائل استيلائهم وتنبّأ بمنتهاه المؤلم** (انگریز اور ہندوستان میں ان کی دراندازی کی ہجو، ان کے ابتدائی تسلط کی مذمت اور اس کے دردناک انجام کا بیان)

بدایوں کے قلمی نسخے میں اس قصیدے کے سنہ و تاریخ کا اندراج نہیں ہے کہ یہ کب نظم کیا گیا، لیکن اس کے مضمون اور مشمولات کے مطالعے سے ڈاکٹر سلمٰی نے اس کے نظم کرنے کی تاریخ انیسویں صدی کا ربع اول متعین کی ہے، جو درست معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی دور ہے جب علامہ دہلی کی عدالت دیوانی میں سررشتہ دار تھے اور اس وقت ان کی عمر 30 سال سے بھی کم تھی۔ ڈاکٹر سلمٰی لکھتی ہیں:

ماعثرت علىٰ تاريخ قرضها الاأن محتواها يدلّ أنها نظمت في الربع الأول من القرن التاسع عشر۔

(اس قصیدے کے نظم کرنے کی تاریخ مجھے نہیں مل سکی، لیکن اس کے مشمولات بتاتے ہیں کہ یہ قصیدہ انیسویں صدی کے ربع اول میں لکھا گیا ہے۔)

ڈاکٹر سلمٰی کا مذکورہ مقالہ اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں خلاصے کے ساتھ یہ پورا قصیدہ پہلی بار منظر عام پر آرہا ہے۔ قصیدے کا خلاصہ حسب ذیل ہے: (مکمل قصیدے کا متن ضمیمہ نمبر 3 میں ملاحظہ ہو)

قصیدے کا خلاصہ: قصیدے کا آغاز شاعر نے عرب شعرا کے طریقے کے مطابق تشبیب

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) موصوفہ نے علامہ کے اس دیوان کو علی گڑھ، لکھنؤ اور بدایوں کے مختلف قلمی نسخوں اور علامہ کی قلمی بیاض کی مدد سے تقابل کرکے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ تسلسل افکار کی وجہ سے جن نسخوں میں تکرار یا نقل میں موجود زوائد اور نقائص تھے وہ ختم ہوگئے۔ اب اس دیوان میں 3370 اشعار ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلمٰی: **ھذا الديوان الأن يشتمل على (3370) بيتاً، وكان في ست مجموعات (7191) بيتاً والأن هذا الواحد يغني القارئ الكريم عن قراءة جميعها۔** (یہ دیوان 3370 اشعار پر مشتمل ہے، جب کہ مختلف نسخوں میں 7191 اشعار تھے۔ اب یہ ایک دیوان قاری کو تمام نسخوں کے مطالعے سے بے نیاز کردے گا۔)

سے کیا ہے:

كَمْ فِيْ هَوَى الْحُوْرِ مِنْ حَوْرٍ وَمِنْ حُوْرٍ　　لَكَمْ فَتًى بِشِفَارِ الشُّفْرِ مَنْحُوْر

ترجمہ: پری چہرہ لوگوں کے عشق میں کتنے نقصان اور کتنی ہلاکت ہے اور کتنے ہی نو جوان خنجر ابرو سے قتل ہو جاتے ہیں۔

پھر عربی شاعری کے طریقے کے مطابق خیالی محبوبہ کی تعریف کی ہے۔اس کی شرم وحیا کا تذکرہ کرتے ہوئے 30ویں شعر میں گریز کرتے ہیں:

لَوْ اَنَّهَا مِنْ خَوَاتِيْنِ الْفَرَنْجِ لَمَاا　　تَعْصَتْ وَكَانَ لِقَاهَا غَيْرَ مَعْسُوْر

ترجمہ: اگر وہ (میری محبوبہ) فرنگی عورتوں میں سے ہوتی تو معاملہ زیادہ دشوار نہ تھا اور اس سے ملاقات نہایت آسانی سے ہو جاتی۔

پھر اس کے بعد 24 اشعار میں ان عورتوں کی بے پردگی، بے حیائی، اخلاق باختگی وغیرہ کا بیان ہے، پھر 53ویں شعر سے 62ویں شعر تک ان عورتوں کے شوہروں کی مذمت کی ہے جنھوں نے خود اپنی ازواج کو اس قدر آزادی دی ہوئی ہے، پھر 63ویں شعر میں اس قوم کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَا وَيْلَ قَوْمٍ اَبَاحُوْا بَوْحَ نِسْوَتِهِمْ　　وَخَيَّرُوْهُنَّ طَوْعاً كُلَّ تَخْيِيْر

ترجمہ: ہلاکت و بربادی ہو اس قوم کی جس نے خود اپنی عورتوں کو بے پردہ کیا ہے اور خود ہی ان کو ہر قسم کی آزادی دی ہے۔

يُصَفِّقُوْنَ وَيَهْتَزُّوْنَ اِنْ رَقَصَتْ　　اَزْوَاجُهُمْ بَيْنَ اَيْدِي الزُّوْرِ فِي الزُّوْر

(شعر 64)

ترجمہ: جب ان کی ازواج مجلس غنا میں سرداروں کے سامنے رقص کرتی ہیں تو یہ تالیاں بجاتے ہیں اور خوشی سے جھومتے ہیں۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس قوم کی مزید خرابیاں بیان فرمائی ہیں، 73ویں شعر میں فرماتے ہیں:

قَوْمٌ يَبُوْلُوْنَ قُوَّاماً وَاِنْ دَخَلُوْا　　فِيْ غَائِطٍ خَرَجُوْا مِنْ غَيْرِ تَطْهِيْر

ترجمہ: یہ وہ قوم ہے جو کھڑے ہو کر پیشاب کرتی ہے اور جب رفع حاجت کو جاتے ہیں تو بغیر پاکی حاصل کیے نکل آتے ہیں۔

اس قوم کی بد خلقی، احسان فراموشی اور ظلم و زیادتی کا بیان کرتے ہوئے 92ویں شعر میں فرماتے ہیں:

فَمَا بِسَاحَاتِهِمْ لَاجٍ يَلُوْذُ وَلَا رَاجٍ يَفُوْزُ وَلَا جَارٍ بِمَنْصُوْر

ترجمہ: ان کے پاس نہ تو کسی مسافر کو جگہ ملتی ہے، نہ کوئی ان کی عطا کا امیدوار کامیاب ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے پناہ کا طالب کامران ہوتا ہے۔

اس کے بعد تین اشعار میں ان کے مدارس کی مذمت کی ہے، 96ویں شعر میں فرماتے ہیں:

فَلَيْسَ مَقْصُوْدُهُمْ تَرْوِيْجَ مَعْرِفَة بَلْ كُلُّ ذٰلِكَ تَمْهِيْدٌ لِتَنْصِيْر

ترجمہ: ان مدارس سے ان کا مقصود علم و معرفت کی اشاعت نہیں ہے بلکہ یہ تمام کاوشیں لوگوں کو نصرانی بنانے کی ایک تمہید ہے۔

اس کے بعد ان کے کچھ عقائد کا بیان ہے، جس میں حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا ماننا اور انجیل میں تحریف وغیرہ کی طرف اشارات کیے ہیں۔ اس کے بعد ان کے نظام عدالت کی خرابیوں کا بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

لَا يَعْتَنُوْنَ بِعَدْلٍ بَلْ بِتَغْرِيَةِ الـ ـمُرَافِعِيْنَ بِتَسْوِيْدِ الطَّوَامِيْر
(شعر 108)

ترجمہ: عدل و انصاف کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ جو ان کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتا ہے اس کو کاغذوں کو سیاہ کر کے تکلیف و ایذا پہنچاتے ہیں۔

آگے فرماتے ہیں کہ "یہ لوگوں کے درمیان اس طور پر فیصلہ کرتے ہیں جس سے لوگوں کا سراسر خسارہ اور نقصان ہی ہوتا ہے، جو لوگ ان کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں ان سے یہ مقدمے کی سماعت کے نام پر پیسے اینٹھ لیتے ہیں، اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ فیصلہ کرنے کی بھی قیمت متعین کر دی جائے۔"

آگے 116ویں شعر میں فرماتے ہیں کہ "چوروں اور ڈاکوؤں سے فدیہ لے کر ان کو بغیر حد

وتعزیر کے آزاد کردیتے ہیں۔"

اگلے شعر میں فرماتے ہیں کہ" گویا یہ خود چوری کے فروغ میں حصے دار ہیں اور ان کا ایک حصہ متعین ہے۔" پھر ان کے عہد حکومت کی خرابی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فِيْ عَهْدِهِمْ سُدَّ بَابُ الصِّدْقِ وَانْفَتَحَتْ أَبْـوَابُ كِـذْبٍ وَبُهْتَـانٍ وَتَـزْوِيْـرٍ
(شعر 120)

فَلَيْـسَ يَظْفَـرُ إِلَّا مُدَّعِيْ كَذِبٍ وَلَا يُـصَـدَّقُ إِلَّا شَـاهِـدُ الـزُّوْرِ
(شعر 121)

يَعُوْدُ كُلُّ صَدُوْقٍ نَـادِمـاً حَصِـرا وَالْعَـدْلُ يُـرْمَـى بِتَـزْوِيْـرٍ وَتَشْهِيْـرٍ
(شعر 122)

ترجمہ: (120) ان کے عہد میں سچائی کا دروازہ بند ہو گیا اور جھوٹ، بہتان اور دھوکہ دھڑی کے دروازے کھل گئے۔ (121) ان کی عدالت میں صرف جھوٹ کا دعوے دار ہی فتح یاب ہوتا ہے اور صرف جھوٹی گواہی دینے والے ہی کی تصدیق کی جاتی ہے۔ (122) ان کی عدالت سے ہر سچا انسان نادم اور شرمندہ ہو کر واپس آتا ہے اور عدل سے ان کا مقصود صرف دھوکے بازی ہے۔

اس کے بعد 128 ویں شعر سے انگریزوں کی جانب سے عائد کردہ ٹیکس کا بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

يُقَـلِّرُوْنَ خَـرَاجـاً بَعْدَ أَنْ مَسَحُوا الْـ أَرَاضِ مَـا بَيْـنَ مِـمْـحَـالٍ وَمَمْطُوْرِ

ترجمہ: وہ زمینیں جو قحط زدہ تھیں یا بارش سے سیراب ہوئی تھیں ان سب پر قبضہ کر کے ان پر ٹیکس نافذ کر دیا۔

آگے فرماتے ہیں کہ (129) وہ زمینیں جو انسان نے خود سیراب کی ہیں اور وہ زمینیں جن کو بارش نے سیراب کیا ہے ان کے ٹیکس کے معاملے میں یکساں ہیں۔ (130) ان کے مظالم کی وجہ سے گاؤں اور شہر بے آب و گیاہ اور ویران ہو گئے۔ (131) جو ٹیکس انھوں نے نافذ کیا ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے گاؤں والوں کی زمینیں اور گھر ظلماً ان سے خرید لیتے ہیں (132) کسانوں نے اپنی زمینوں میں جو کچھ بویا ہے اس میں کسانوں کے حق کی قطعاً رعایت نہیں کرتے لہٰذا

کسانوں کو سوائے محرومی و حسرت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

آگے فرماتے ہیں:

قَدْ أَذْهَبَتْ بَرَكَاتِ الْأَرْضِ بَيْتُهُمْ فَلَيْسَ فِي الْحَرْثِ مِنْ رَيْعٍ وَتَوْفِيرِ

(شعر 134)

ترجمہ: ان کی (بری) نیتوں سے زمین کی برکت ختم ہوگئی، اب کھیتی میں نمو اور کثرت باقی نہ رہی۔

مَا فِي الْفَلَاحَةِ لِلزُّرَّاعِ مِنْ فَلَحٍ فَلَا يُرَى فِيْ قُرَاهُمْ غَيْرُ تَنْغِيصِ

(شعر 135)

ترجمہ: اب کسانوں کی کھیتی میں کوئی کامیابی اور فائدہ نہ رہا، کسانوں کی ضیافت کے لیے بہت تھوڑا تھوڑا دیتے ہیں۔

پھر شعر 143 تک ان کی بعض اخلاقی برائیوں اور ظلم وستم کا بیان کیا ہے، 144 ویں شعر میں کہتے ہیں کہ اس بیان سے تم یہ مت سمجھ لینا کہ یہ بہت بہادر ہیں بلکہ یہ تو بہت بزدل اور کمزور ہیں۔ اس کے بعد 153 ویں شعر تک ان کی بزدلی کا بیان ہے، 154 ویں شعر میں کہتے ہیں کہ تمہیں یہ دھوکہ نہ ہو کہ اگر یہ ایسے ہی بزدل ہیں تو ان کا تسلط کیسے قائم ہو گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ:

فَإِنَّ ذَاكَ مَنُوْطٌ بِالْمَقَادِيْرِ

ترجمہ: دراصل یہ سب معاملات مقدرات کے ہیں۔

اس لیے کہ:

اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ يُؤْتِيْ مَنْ يَشَاءُ وَمَا قَدْرٌ لِعَبْدٍ بِلَا قَدْرٍ بِمَقْدُوْرِ

(شعر 155)

ترجمہ: یہ ملک اور سلطنت اللہ عزوجل ہی کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، بغیر تقدیر کے بندے کی کوئی طاقت و قوت نہیں ہے۔

پھر چند اشعار میں مقدرات کا بیان ہے کہ کیسے بہت سے نا اہل حکومت و اختیار تک پہنچ جاتے ہیں، 159 ویں شعر میں ان اسباب کی طرف آتے ہیں جن کے تحت انگریزوں کو ہندوستان

پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا، فرماتے ہیں:

لَمَّا خَلَا الْهِنْدُ عَنْ وَالٍ يَقُوْمُ [بِهَا] أَثَارَ فِيْهَا فَسَادًا كُلُّ غِدِّيْرِ

ترجمہ: جب ہندوستان کسی ایسے حاکم سے خالی ہوگیا جو اس کی باگ ڈور سنبھالتا تو اس ملک میں غداروں اور فساد پھیلانے والوں نے فساد پھیلایا۔

بَغٰى عَلٰى مَلِكِهَا عُمَّالُهٗ وَطَغَوْا فَكَلَّفُوْهُ بِتَشْرِيْرٍ وَتَغْرِيْرِ

(شعر 160)

ترجمہ: ہندوستان کے بادشاہ پر اس کے نوکروں اور وظیفہ خواروں نے بغاوت اور سرکشی کی تو اس کو علاحدہ ہونے اور دور ہونے پر مجبور کر دیا۔

آگے فرماتے ہیں کہ "پھر اس کے ملک کو بغاوت کے ذریعے آپس میں تقسیم کر لیا، قتال کیا اور فساد پھیلایا۔"

اس کے بعد چار اشعار میں اس وقت کے بادشاہ شاہ عالم ثانی کی کمزوری وغیرہ بیان کی ہے، فرماتے ہیں:

لَمْ يَبْقَ فِي الْمُلْكِ مِنْ مَلِكٍ يُطَاعُ سِوٰى مُؤَمَّرٍ إِمَّرٍ لِلْبُلْهِ مَأْمُوْرِ

(شعر 164)

ترجمہ: اس ملک میں کوئی ایسا بادشاہ باقی نہیں رہا جس کی اطاعت کی جاتی سوائے ایک ایسے بادشاہ (شاہ عالم ثانی) کے جو ضعیف الرائے اور بے وقوفوں کے مشوروں کا پابند تھا۔

پھر 168 ویں شعر سے شاہ عالم ثانی کے وزیروں کے غدر، بغاوت، خیانت، لالچ، بزدلی، بے غیرتی اور بے دینی وغیرہ کا بیان شروع کیا ہے، جو 193 ویں شعر تک جاری رہا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:

تَا حَالُهُمْ وَالنَّصَارٰى حَوْلَهُمْ حَوِلٌ يَسْعَوْنَ فِي الْبَيْنِ فِيْ سَعْيٍ وَتَوْغِيْرِ

(شعر 194)

ترجمہ: یہ ان (وزرا) کا حال تھا ایسے وقت میں جب نصاریٰ ان کے گرد حیلوں کا گھیرا بنا رہے تھے اور فساد و افتراق، چغلی اور حقد و حسد کی کوششوں میں مصروف تھے۔

فَخَامَرُوْا مُلْكَهُمْ بَلْ خَامَرُوْا مَعَهُمْ　　يُخَمِّرُوْنَ نُهَاهُمْ أَيَّ تَخْمِيْر

(شعر 195)

ترجمہ: لہٰذا انصاری ان کے ملک میں داخل ہو گئے، بلکہ ان کے ساتھ خلط ملط ہو گئے اور ان کی عقلوں پر پتھر ڈال دیے۔

پھر آگے انگریز کی چالاکیوں اور وزرا کی نااہلیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

فَمَلَّكُوْهُمْ قِيَادَ الْأَمْرِ وَائْتَمَرُوْا　　لَهُمْ رِجَاءً لِتَأْيِيْدٍ وَتَأْزِيْر

(شعر 205)

ترجمہ: تو انھوں نے اپنے ملک کی باگ ڈور انگریزوں کے حوالے کردی اور خود انگریزوں کے اطاعت شعار ہو گئے، اس امید پر کہ وہ ان کے ذریعے تائید اور تقویت حاصل کریں۔

وَمَكَّنُوْا مِنْ مَلَاكِ الْمُلْكِ قَادَتَهُم　　وَمَكَّنُوْا جَيْشَهُمْ فِي الْقَصْرِ وَالسُّوْر

(شعر 206)

ترجمہ: اور اپنے ملک کا اقتدار انگریز قائدین کے حوالے کردیا اور انگریز محل اور شہر پناہ سب پر متمکن ہو گئے۔

وَهٰؤُلَاءِ تَوَلَّوْهُمْ لِمَصْلِحَةِ الْـ　　إِفْسَادِ ثُمَّ تَوَلَّوْا بَعْدَ تَوْدِيْر

(شعر 207)

ترجمہ: ان انگریزوں نے فساد برپا کرنے کی مصلحت سے ان وزرا کے ساتھ تعلقات بڑھائے اور ان کو دھوکہ دینے کے بعد ان سے منھ پھیر لیا۔

وَنَكَّرُوْا بَعْدَ طُوْلِ الْعَهْدِ أَنْفُسَهُم　　وَبَدَّلُوْا كُلَّ تَبْهِيْلٍ بِتَوْغِيْر

(شعر 208)

ترجمہ: ایک طویل مدت تک انگریزوں نے عہد باندھنے کے بعد خود کو بدل لیا اور تمام تر نرمی کو حقد و حسد سے بدل دیا۔

فَإِنَّمَا ظَفَرُوْا بِالْهِنْدِ إِذْ ظَفَرُوْا　　بِالْكَيْدِ وَالزُّوْرِ لَا بِالْأَيْدِ وَالزُّوْر

(شعر 209)

ترجمہ: انگریزوں نے ہندوستان کو طاقت اور قوت کے زور پر فتح نہیں کیا بلکہ اس کو دھوکہ اور جھوٹ سے فتح کیا۔

فَلَمَّا اسْتَكَانُوْا قُبَيْلَاتُمْ إِذْ مَلَكُوْا ۔۔۔ لَمْ يُلْفَ فِيْهِمْ سِوَى عَاتٍ وَّمُتَّهِرِ

(شعر 210)

ترجمہ: کچھ پہلے تک ان انگریزوں نے عجز وانکساری اختیار کی مگر جب ہندوستان پر قبضہ ہوگیا تو اب ان میں متکبر ومغرور لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ملے گا۔

لا يَقْدِرُوْنَ ذَوِي الْأَقْدَارِ إِذْ قَدَرُوْا ۔۔۔ بَلْ يَقْدِرُوْنَ عَلَيْهِمْ كُلَّ تَقْدِيْرِ

(شعر 211)

ترجمہ: جب ان کا اقتدار مکمل ہوگیا تو وہ اب قدر ومنزلت والے کی کوئی قدر نہیں کرتے، بلکہ ان پر ہر طرح کی تنگی اور سختی روا رکھتے ہیں۔

أُولُو الْحَسَابَةِ فِيْ حُسْبَانِهِمْ سُفَّلٌ ۔۔۔ وَالدُّوْنُ أَهْلٌ لِإِحْسَابٍ وَّتَوْقِيْرِ

(شعر 212)

ترجمہ: حسب والے شریف لوگ ان کی نظر میں ذلیل وحقیر ہیں اور ذلیل وحقیر لوگ ان کی نظر میں عطا وکرم اور توقیر کے حق دار ہیں۔

اس کے بعد پھر انگریزوں کے ظلم کی ایک جھلک دکھائی ہے، فرماتے ہیں:

''ان کے ٹیکس نے کسانوں کو ہلاک کر ڈالا اور وہ کٹی ہوئی فصل کی طرح ہوگئے اور سرسبزی وشادابی کے بعد ان کو ایذا پہنچائی گئی۔'' (شعر 215)

''ان کی عدالت کا معنی ظلم ہے، وہاں گناہ کی کوئی تعزیر نہیں اور مال حرام لینا وہاں کوئی گناہ نہیں۔'' (شعر 216)

''فقر کے بعد وہ مال دار ہوگئے اور مکر وحیلے کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ اہل حرفت کو محرومی اور تنگی رزق میں مبتلا کر دیں۔'' (شعر 217)

''تو اب ایک بوڑھے کے لیے سوت کاتنے میں کوئی نفع نہیں رہ گیا اور نہ ہی کپڑا بننے والے کے لیے کپڑا بننے کی کوئی اجرت ہے۔'' (شعر 218)

''انگریزوں کی چکی آٹا پیسنے والے کے اوپر چلی تو اس کی امیدیں ہلاکت کی چکی میں پس گئیں۔'' (شعر 219)

''انھوں نے ہندوستان کو سونے اور دینار سے خالی کر دیا اور اس کے لیے انھوں نے کسی فقیر اور بھوکے کو بھی نہ چھوڑا۔'' (شعر 220)

آگے فرماتے ہیں: ''ان کے یہاں مساکین زکوۃ کے مستحق نہیں ہیں بلکہ یہ تو صرف فساق وفجار اور بدکاروں ہی کو عطا کرتے ہیں۔'' (شعر 224)

اس کے بعد بڑے فیصلہ کن انداز میں پیشن گوئی کرتے ہیں:

''یہ تو ان کے قبضے کا ابتدائی زمانہ ہے، ابھی تو اس کی انتہا اور انجام باقی ہے، اس انجام میں یقیناً بڑی عظیم مصیبتیں ہیں۔'' (شعر 227)

''میں نے ان کے کارناموں میں سے کچھ ہی ذکر کیے ہیں، ان کے ایسے کتنے ہی قابل فخر کارنامے نقل نہیں ہوئے۔'' (شعر 228)

''میں نے ان کے حسن وجمال کے بیان میں اجمال سے کام لیا ہے، ان کی خوبیوں کی تفصیل کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔'' (شعر 229)

''ان کی طبیعت اور عادت کے بارے میں مَیں نے اپنی اس گفتگو میں کوئی چیز اپنی طرف سے گھڑی نہیں ہے، بلکہ میرے خبر دینے کی سچائی میرے اختیار سے ملحوظ نہیں ہوئی۔'' (شعر 231)

''مجھے (ان باتوں میں) ذرا بھی شک وتردد نہیں ہے، میری ان خبروں میں صرف وہی شخص شک کر سکتا ہے جس کو ان خبروں پر حیرت ہو۔'' (شعر 232)

''لیکن میں تو ان کی حالت بیان کرنے میں اقتصار سے کام لے رہا ہوں، اگر وہ دیکھ لیں، میں زیر عتاب آ جاؤں اور میری معذرت کا دائرہ تنگ ہو جائے۔'' (شعر 233)

''تو وہ مجھے معذور رکھیں گے اگر چہ جس نے غلطی کی ہو اور وہ معذرت طلب کر رہا ہو اس کو معاف کرنا ان کی عادت نہیں ہے۔'' (شعر 234)

''اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ظلم کے تاریک اندھیروں سے خوش خبری کی کرن پیدا فرمائے۔'' (شعر 235)

توجہ طلب نکات: انیسویں صدی کے ربع اول میں انگریزوں کی ہجو میں کہا جانے والا یہ طویل قصیدہ مندرجہ ذیل نکات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے:

الف۔ علامہ فضل حق خیرآبادی ابتدا سے ہی انگریزوں کے مخالف اور ان سے بیزار تھے۔

ب: اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں بوجہ مجبوری علامہ خیرآبادی کمپنی سرکار کی ملازمت سے وابستہ ہوئے۔

ج۔ کمپنی سرکار کی ملازمت سے وابستگی کے باوجود علامہ انگریزوں سے متنفر اور ان کے مخالف رہے۔

د۔ اپنی زندگی کی ابتدا سے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ و تسلط کو وطن اور اہل وطن کے لیے برا جانا۔

□□□

قصیدہ نونیہ پر ایک نظر

دہلی میں جنگ آزادی کے خاتمے (19 ستمبر 1857) کے بعد ان تمام لوگوں پر کمپنی سرکار کی طرف سے مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جنھوں نے اس جنگ میں ان کے خلاف حصہ لیا تھا، اس صورت حال سے پریشان ہو کر مجاہدین اپنی جانوں کو بچانے کے لیے روپوش اور فرار ہونے لگے- علامہ بھی اپنے مختصر کنبے اور اقارب کے ساتھ 24 ستمبر 1857 کو اپنا سب کچھ چھوڑ کر دہلی سے نکل پڑے اور دشمنوں کی نظر سے بچتے اور چھپتے ہوئے تقریباً ڈھائی مہینوں کی دشواریوں کے بعد نومبر میں اپنے وطن خیرآباد پہنچے- علامہ نے دہلی کی تاراجی اور تباہی، انگریزوں کی بربریت اور ان کے مکروفریب کے جو مناظر دیکھے، بے سروسامانی اور کسمپرسی میں جس طرح اپنی دہلی کو چھوڑا اور جن جان لیوا حالات کا سامنا کرتے ہوئے وہ اپنے وطن پہنچے، ان مشاہدات پر درد و کرب میں ڈوب کر ایک قصیدہ کہا، جو انگریزوں سے ان کی بے انتہا نفرت اور بیزاری کا آئینہ دار ہے- یہ قصیدہ نونیہ ہے جو 235 اشعار پر مشتمل ہے، اس کا مطلع ہے:

(پورا قصیدہ اور اس کا ترجمہ ضمیمہ نمبر 4 میں ملاحظہ ہو)

مَانَاحَ أَوْرَقُ فِيْ أَوْرَاقِ أَشْجَانِ   إِلَّا وَهَيَّجَ أَشْجَانِيْ وَأَفْجَانِي

ادھر کبوتر شاخ کے پتوں پر بولا اُدھر اس کی (درد بھری) آواز نے میرے پنہاں غموں کو

ابھار کر مجھے رنجیدہ و غمگین کر دیا۔

قصیدے کے چند اشعار اس طرح ہیں:

فَلَوْ اِذِ اغْتَصَبُوْا كُلَّ الْمَمَالِكِ فِيْ　　　طُغْوَى وَعَدْوَى وَفِيْ كُفْرٍ وَكُفْرَانِ

جس ملک پر بھی انھوں نے غاصبانہ قبضہ کیا اس میں ظلم وستم، شر وفساد، احسان فراموشی اور ناشکری کرنے میں حد سے گزر گئے۔(شعر 49)

بَنَوْا أَرَاذِلَ هَدْمًا لِلنَّبَالِ كَمَا　　　بَنَوْا مَدَارِسَ تَخْرِيْبًا لِصِبْيَانِ

باکمال لوگوں کو مٹانے کے لیے انھوں نے کمین وذلیل لوگوں کو نوازا اسی طرح بچوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے دانش گاہیں تعمیر کروائیں۔(شعر 50)

وَوَكَّلُوْا طَمَعًا فِيْ نَشْرِ مِلَّتِهِمْ　　　فِيْ أَرْضِنَا كُلَّ أُسْقُفٍ وَمَطْرَان

ہماری زمین پر اپنے دین کی نشر واشاعت کے لیے انھوں نے اپنے مذہبی رہنماؤں کو مقرر کر دیا۔(شعر 52)

غَرُّوْا أُغِرَّاءَ أَرْذَالًا بِعَوْسِعَةٍ　　　وَضَيَّقُوْا عَيْشَ أَشْرَافٍ وَغُرَّانِ

ان گوروں نے نا تجربے کار، کج فہم، کوتاہ ہمت نوجوانوں کو دولت وثروت کے ذریعے دھوکے اور فریب میں ڈال دیا اور ہر شریف النفس کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔(شعر 55)

رَأَوْا سَلَاطِيْنَ أَرْضِ الْهِنْدِ قَدْ وَهَنُوْا　　　بِمَا لَهَوْا بِالْمَلَاهِيْ كُلَّ لِهْيَانِ

جب ان نصاریٰ نے دیکھا کہ سرزمین ہند کے بادشاہ و امرا موسیقی اور لہو ولعب میں پڑ کر اپنی طاقت وقوت کھو چکے ہیں۔(شعر 63)

فَحَاوَلُوْا حِوَلَ الْأَدْيَانِ مِنْ حِوَلٍ　　　حَالَتْ فَآلَتْ إِلَى خُسْرٍ وَبُطْلَانِ

تو انھوں نے مکر وفریب سے دین وملت کو تبدیل کرنے کا عزم کیا اور دین تبدیل ہوئے اور دائمی خسارے کی طرف لوٹے۔(شعر 64)

اس قصیدے کے حوالے سے ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں:

''میری ذاتی رائے ہے کہ مقدمے اور مابعد کے رویے سے قطع نظر جو میرے خیال میں مولانا نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کے

لیے اختیار کیا تھا وہ ''جنگ آزادی'' سے پورے پورے متاثر تھے۔انھوں
نے اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا ہو کہ نہ لیا ہو، لیکن وہ جذباتی طور پر
جنگ آزادی سے قطعی ہم آہنگ تھے اور فرنگیوں کی مخالفت میں کسی سے
پیچھے نہ تھے،اس کا ثبوت مولانا کا وہ قصیدہ فراہم کرتا ہے۔''

(غالبیات: چند عنوانات، ص:114)

اس قصیدے کا سب سے پہلا ذکر علامہ فضل حق خیر آبادی کے حوالے سے ''الثورۃ الہندیہ'' میں سامنے آیا۔علامہ فرماتے ہیں:

''ان دونوں (قصیدہ ہمزیہ اور دالیہ) میں سے پہلے 'نون' کے قوافی میں
بھی قصیدہ لکھا تھا جو در یتیم کی طرح فرید و یگانہ ہے۔اس کا ہر شعر مضبوط و
مرتفع قصر کی طرح ہے۔اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے
ہیں۔اس کے اتمام کی نوبت نہیں آئی۔مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل
کا موقع نہیں دیا۔اس کا مطلع یہ ہے:

مَـاَنَـاحَ أَوْرَقُ فِـيْ أَوْرَاقِ أَفْـجَانِ
إِلَّا وَهَـيَّـجَ أَشْـجَـالِيْ وَأَشْـجَانِـي

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں
شامل کر کے ختم کروں گا جسے مکارم اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔''

(باغی ہندوستان، ص:85)

مگر اپنی خواہش کے مطابق علامہ اس قصیدے کی تکمیل نہ کر سکے۔ڈاکٹر سلمہ سیہول نے اپنے زیر طبع پی ایچ ڈی کے عربی مقالے ''دیوان فضل حق الخیر آبادی: دراسة و تحقیق'' میں ذکر کیا ہے:

''ما اتمّها الشاعر لانه مات خلال نفيه بجزيرة أندمان''
(شاعر اس قصیدے کو مکمل نہیں کر پائے کیونکہ وہ جزیرہ انڈمان میں اپنی
جلاوطنی کے دوران انتقال فرما گئے۔)

اس قصیدہ نونیہ کا دوسری بار ذکر کالی داس گپتا رضا نے اپنی کتاب ''غالبیات: چند عنوانات''
میں اس سرنامے کے ساتھ کیا ہے:

''مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک تاریخی قصیدہ''

کالی داس گپتا رضا کو اپنے کتب خانے میں عربی کی ایک قلمی کتاب میں سات چھوٹے بڑے رسائل کے ساتھ علامہ کے سولہ قصائد بھی ملے، ان میں ایک یہ قصیدہ بھی تھا۔ لیکن شاید عربی سے کم یا عدم واقفیت کی بنا پر انھوں نے اس کا متن شائع نہیں کیا اور ایک عربی عالم کی مدد سے کتاب میں اس کا ترجمہ شامل کر لیا۔ قصیدے کے پورے متن سے جب ہم نے کالی داس گپتا رضا کے شائع کردہ ترجمے کو ملایا تو یہ ترجمہ نہ صرف ناقص نکلا بلکہ اکثر جگہ غلط بھی، کالی داس گپتا کا شائع کردہ ترجمہ قصیدے کے شعر نمبر 43 سے اس طور پر شروع ہوتا ہے کہ کہیں پہلے مصرعے کا ترجمہ ہے تو دوسرے کا نہیں اور کہیں دوسرے مصرعے کا ہے تو پہلے کا نہیں، اسی طرح درمیان میں بھی متعدد اشعار کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔

کالی داس گپتا نے اس قصیدے کے حوالے سے یہ بھی نہیں ذکر کیا کہ اس میں کتنے اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے کتب خانے میں مذکورہ قلمی کتاب کے اندر یہ قصیدہ ناقص ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس عالم کے ذریعے انھوں نے قصیدے کا ترجمہ کرایا ہے، انھوں نے ان کی عربی سے عدم واقفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قصیدے کا ناقص ترجمہ کر کے اپنی جان چھڑالی ہو۔ گو کہ کالی داس گپتا رضا نے ترجمے کی صحت کی ذمہ داری مترجم کے سر ڈال دی ہے، لیکن ان کے ذریعے قصیدے کا ناقص ترجمہ اور اس کے تفصیلی کوائف نیز متن سامنے نہ آنے کی وجہ سے یہ اہل علم کے درمیان علمی و تحقیقی حیثیت سے حوالہ نہ بن سکا۔

تیسری مرتبہ اس قصیدے کا ذکر ڈاکٹر سلمہ سیہول کی کتاب ''علامہ محمد فضل حق خیر آبادی'' میں سامنے آیا۔ موصوفہ نے اپنی مذکورہ کتاب میں پہلی بار اس قصیدے کا 235 اشعار پر مشتمل پورا متن شائع کیا، لیکن ترجمہ بزبان اردو۔ ڈاکٹر سلمہ کے پی ایچ ڈی کے زیر طبع عربی مقالے میں بھی یہ قصیدہ شامل ہے، جسے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے قلمی نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ قصیدہ لکھنؤ کے قلمی نسخے میں بھی موجود ہے، لیکن اس میں 234 اشعار درج ہیں۔

ڈاکٹر سلمہ نے اس قصیدے کے نظم کرنے کا سال 1276ھ قیاس کیا ہے، جب علامہ جزیرۂ انڈمان میں قید و بند کی سزا کاٹ رہے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلمہ کی دلیل علامہ کی وہ عبارت ہے جسے انھوں نے الثورۃ الہندیہ کے اخیر میں اس قصیدے کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان دونوں (قصیدہ ہمزیہ اور دالیہ) میں سے پہلے 'نون' کے قوانی میں بھی قصیدہ لکھا تھا — مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا"۔ اس عبارت کی وجہ سے ڈاکٹر سلمہ نے اس قصیدے کے عدم تکمیل کی وجہ "قید کے دوران جزیرے میں علامہ کی موت" بتائی ہے۔

ڈاکٹر سلمہ کے برخلاف کالی داس گپتا رضا نے اس کے نظم کرنے کا سنہ 1857 مقرر کیا ہے، ان کی دلیل یہ ہے:

> "چونکہ قصیدے میں دلی کی تاراجی کے بعد مولانا کا دلی سے نکل کر منزل پر پہنچنے کا حال درج ہے، اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قصیدہ ستمبر 1857 کے تیسرے یا چوتھے ہفتے اور دسمبر 1857 (خیر آباد کو روانگی) کی درمیانی مدت میں کہا گیا ہے۔ اگر قصیدہ خیر آباد پہنچ کر کہا گیا ہوتا تو اس میں خیر آباد کے سفر کا حال بھی درج ہوتا، اس لیے قصیدے کی تاریخ فکر اکتوبر یا نومبر 1857 مقرر کی جاسکتی ہے۔"
>
> (غالبیات: چند عنوانات، ص:116)

یہاں دونوں کے دلائل سے مکمل اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ الثورۃ الہندیہ میں علامہ نے ذکر کیا کہ ان دونوں (قصیدہ ہمزیہ اور دالیہ) میں سے پہلے 'نون' کے قوانی میں بھی قصیدہ لکھا تھا — مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا اور یہ کہ رہائی ملی تو اس کی تکمیل کروں گا۔ پھر قصیدہ ہمزیہ اور دالیہ کے لکھنے کے بعد علامہ نے یہ عبارت لکھی کہ

> "یہ دونوں قصیدے رجب 1276ھ میں بحالت اسیری جزیرۂ وبائی، تمام ہوئے۔" (باغی ہندوستان، ص:119)

اس سے ڈاکٹر سلمہ نے یہ اندازہ لگالیا کہ علامہ نے حالت اسیری میں ہی ان دونوں قصائد سے پہلے جزیرۂ انڈمان میں قصیدۂ نونیہ لکھا اور اسی حالت میں وہاں انتقال فرما گئے، اس لیے اس

کی تکمیل نہ کر سکے۔ ڈاکٹر سلمہ کے قیاس سے اس لیے اتفاق نہیں ہوتا کہ:

(الف) اگر علامہ نے قصیدہ نونیہ لکھنے کا آغاز جزیرے میں کیا تھا، یہاں تک کہ 235 اشعار لکھ بھی لیے، پھر مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا، یہاں تک کہ اسی حالت میں انتقال فرما گئے۔ تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر اس کے بعد قصیدۂ ہمزیہ اور دالیہ لکھنے کا موقع کیسے نکل آیا؟

(ب) اگر یہ مان لیا جائے کہ جب مصائب سے چھٹکارا ملا تو آپ نے قصیدۂ نونیہ کو ناقص چھوڑ کر قصیدہ ہمزیہ اور دالیہ لکھنا شروع کر دیا تو بھی چول نہیں بیٹھتی، کیونکہ یہ خلاف عقل بات ہے کہ اگر مصائب و آلام سے چھٹکارا مل گیا ہوتا تو جس چیز کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی اسی کی کی جاتی، بالخصوص ایسی حالت میں جب قصیدہ نونیہ بقول علامہ ''در یتیم کی طرح فرید و یگانہ'' ہو اور پھر اس کا موضوع بھی وہی ہو جو بعد میں لکھے جانے والے قصائد (ہمزیہ و دالیہ) کا تھا۔

(ج) اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر قصیدہ نونیہ جزیرہ انڈمان میں لکھا گیا ہوتا تو وہاں سے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعے آنے والے قصائد ہمزیہ اور دالیہ اور رسالہ غدریہ کے ساتھ قصیدۂ نونیہ بھی ہوتا اور وہ بھی باغی ہندوستان کا حصہ بنا ہوتا۔ معاملہ ایسا نہیں تھا اس لیے جن لوگوں نے بھی علامہ کے بھیجے ہوئے تحریری سرمائے کا ذکر کیا ہے یا جنھوں نے بھی اس سرمایے کی نقول حاصل کی، ان میں کسی نے بھی قصیدۂ نونیہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ قصیدہ علامہ نے اپنے ایام جلا وطنی میں جزیرۂ انڈمان میں لکھا تھا تو ہم تک کس ذریعے سے پہنچا، جبکہ وہاں سے آنے والے دستیاب کاغذات میں اس کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں ملتا۔

مذکورہ تمام شواہد بتاتے ہیں کہ یہ قصیدہ ہندوستان میں ہی لکھا گیا ہے۔

اب رہی بات کالی داس گپتا رضا کی تو ان کی یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ یہ قصیدہ دہلی کی تاراجی کے بعد ستمبر تا دسمبر 1857 کے درمیان لکھا گیا، لیکن یہ درست نہیں کہ یہ قصیدہ خیرآباد پہنچنے سے قبل لکھا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ علامہ نے اس قصیدے میں خیرآباد کے سفر کا تفصیلی حال نہیں لکھا ہے، لیکن خیرآباد پہنچنے کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے، علامہ فرماتے ہیں:

حَتّٰی قَدِمْتُ نَجِیْحًا سَالِمًا اٰمِنًا　　　فَارْتَاحَ أَهْلِیْ وَجِیْرَانِیْ بِقِدْ مَانِیْ

(جب میں صحیح سلامت اپنے اہل و عیال سے آ ملا تو میرے گھر والوں اور پڑوسیوں نے میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔)

اس ذکر کے ساتھ یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ علامہ نے یہ قصیدہ خیر آباد پہنچنے کے بعد ہی لکھا ہوگا۔ پھر یہ بات زیادہ باوزن اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ علامہ خیر آباد پہنچے (نومبر 1857) کے بعد تقریباً ساڑھے تین سے چار ماہ (مارچ 1858) تک وہاں مقیم رہے اور پھر مارچ میں ہی بیگم حضرت محل کے ساتھ سیتا پور سے بونڈی ضلع بہرائچ کی طرف نکل گئے اور اودھ کے معرکوں میں سرگرم ہو گئے۔ دہلی سے خیر آباد پہنچنے کے بعد علامہ نے ساڑھے تین سے چار ماہ جو قیام کیا، اسی مدت میں انھوں نے یہ قصیدہ کہا ہوگا، کیونکہ یہ نہ مصائب و آلام کا زمانہ تھا اور نہ خاص مصروفیات کا۔ مارچ 1858 کے بعد ہی علامہ یکے بعد دیگرے مشکلات سے دوچار ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ اودھ کے معرکوں سے شروع ہو کر ان کی گرفتاری، مقدمہ، ہندوستان کی جیلوں میں قید و بند، جلا وطنی اور پھر ان کی موت پر تمام ہوا۔ غالباً انھی حالات کی طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے کہ:

> ''نون کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا، مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا۔''

اس وضاحت کے ساتھ اس قصیدے کے نظم کرنے کی تاریخ نومبر 1857 تا مارچ 1858 متعین کی جا سکتی ہے۔ مارچ 1858 کے بعد کی تاریخ اس لیے متعین نہیں کی جا سکتی کہ اس قصیدے کا جو آخری شعر لکھا گیا ہے وہ خیر آباد کی آمد پر ختم ہوا ہے، اس کے بعد انھیں موقع نہیں مل سکا کہ اپنی خواہش کے مطابق بعد کے حالات لکھ کر اس کی تکمیل کر پاتے۔

□□□

قصیدۂ رائیہ اور نونیہ: چند نئے حقائق

قصیدۂ رائیہ اور قصیدہ نونیہ کے ذریعے علامہ فضل حق خیرآبادی کے تعلق سے کئی چونکا دینے والے نئے گوشے اور حقائق سامنے آئے ہیں۔ قصیدۂ رائیہ نے اگر اس بات کا تعین کر دیا ہے کہ علامہ خیرآبادی اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے ہی انگریزوں کے مخالف تھے اور انھیں ان سے بے انتہا نفرت اور کراہت تھی تو قصیدہ نونیہ نے جنگ آزادی میں ان کی حصہ داری کے مزید ثبوت فراہم کر دیے ہیں۔ قصیدہ نونیہ میں علامہ نے اپنے اور انگریزوں کے تعلق سے جن تاریخی حقائق کو بیان کیا ہے وہ اب تک سامنے نہیں آ سکے تھے، اس قصیدے کے ذریعے ان محققین کے موقف کو مزید توانائی ملتی ہے جو علامہ خیرآبادی کی معرکۂ ستاون میں نمایاں شرکت کو تسلیم کرتے ہیں۔

علامہ خیرآبادی کو پکڑنے کے لیے انگریزی سرکار کی طرف سے انعام: تاریخی حیثیت سے یہ بات مسلم ہے کہ 1857 کی جنگ ختم ہونے کے بعد 19 تا 24 ستمبر تک علامہ اپنے گھر محلہ شیر افگن بارہ دری میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ بھوکے پیاسے بند رہے یا چھپے رہے اور پھر یہ بھی متحقق ہے کہ علامہ 24 ستمبر کو دہلی سے نکل گئے اور انگریزی حکام، ان کے سپاہیوں اور جاسوسوں سے بچتے بچاتے کئی ہفتوں کی جان لیوا مشکلات کے بعد اپنے وطن خیرآباد پہنچے۔ علامہ کا گھر میں مقید رہنا اور روپوشی کی حالت میں دہلی چھوڑ کر وطن جانا بجائے خود اس بات کا اشاریہ ہے

کہ انھوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا، تاہم معاصر شواہد سے ان دونوں عمل کی توجیہ علامہ کے محققین اب تک پیش نہیں کر سکے تھے- ان دونوں عمل کی توجیہ پہلی بار قصیدہ نونیہ کے ذریعے سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ دیگر مجاہدین کے ساتھ علامہ فضل حق نے بھی جنگ آزادی میں سرگرم اور نمایاں حصہ لیا، لیکن یہ جنگ ہندوستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی- انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد مجاہدین کی دھر پکڑ، ان پر مظالم اور گرفتاری و مقدمہ کا سلسلہ شروع کیا، چونکہ علامہ نے اس جنگ میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، اس لیے جنگ ختم ہونے کے بعد انگریزی حکام نے دہلی میں یہ اعلان کر دیا کہ جو بھی مولوی فضل حق کو ڈھونڈھ کر ان کے سامنے لائے گا اسے بیش قیمت انعام سے نوازا جائے گا- علامہ فرماتے ہیں:

وَدَّعْتُ دِهْلِيْ وَدَاعَ الرُّوْحِ قَالِبَهَا   كُرْهًا وَ وَدَّعْتُ خُلَّانِيْ وَ خُلْصَانِيْ

میں نے دکھے دل سے شہر دہلی کو ایسے ہی چھوڑا جیسے روح جسم سے جدا ہوتی ہے اور اپنے مخلص دوستوں اور احباب کو الوداع کہا- (شعر 221)

کیونکہ:

وَ قَدْ أَشَاعَ النَّصَارَى فِي الْقُرَى عِدَةَ الْـ   نُحْلِ الْجَزِيْلِ لِمَنْ يَسْعَى لِيَشْدَانِيْ

انگریزوں نے بستیوں میں اعلان کر دیا کہ مجھے ڈھونڈ کر لانے والوں کو بڑے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا- (شعر 223)

جنگ میں شرکت کے حوالے سے علامہ کی یہ جہت پہلی بار سامنے آئی ہے جو اس بات کا نا قابل تردید ثبوت ہے کہ انھوں نے انگریزی سرکار کے خلاف جنگ میں نہ صرف حصہ لیا ہوگا بلکہ مرکزی کردار بھی ادا کیا ہوگا- اس جنگ میں اگر علامہ کی معمولی حصہ داری ہوتی تو پھر اس شدت سے انگریزی حکومت کو ان کی تلاش نہیں ہوتی- کیونکہ جنگ میں حصہ لینے والے اور بھی مجاہدین تھے، لیکن ان کو پکڑنے کے لیے انگریزی حکام نے بیش قیمت انعام کا اعلان نہیں کیا، یہ سلوک صرف علامہ کے ساتھ کیا گیا، جس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ انگریزی اقتدار کے لیے خطرہ بن گئے تھے- علامہ کی گرفتاری کے بعد ان کے مقدمے کے دوران عدالت نے "نقل فیصلہ" کے تحت غالبًا اسی خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے:

"وہ (فضل حق) خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔" (مسل مقدمہ مولوی فضل حق)

بالآخر انگریزی حکومت کے خلاف "اس خطرناک ترین آدمی" کو جلاوطنی کی سزا سنائی گئی اور رہائی کی متعدد کوششوں کے باوجود اسے رہا نہیں کیا گیا، بلکہ چیف کمشنر اودھ لکھنؤ نے وزیر ہند کے نام علامہ کی بھیجی ہوئی رہائی کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے لکھا کہ "اگر مولوی فضل حق کے سلسلے میں کچھ بھی رعایت کی گئی تو وہ اس کی سختی سے مخالفت کریں گے۔"

یہاں ضمنی طور پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے بعض محققین نے علامہ کی رہائی کے مسئلے کو بھی ایشو بنا کر یہ استدلال کیا ہے کہ:

"گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد انگریزوں کا ان کے لیے پروانۂ رہائی جاری کرنا اس حقیقت کی دلیل ہے کہ وہ مطمئن ہو چکے تھے کہ مولانا کو سنائی گئی سزا غلط ہے۔" (غالب اور ہماری تحریک آزادی، ص:35)

استدلال کا یہ انوکھا انداز غالب شناس محقق جناب شمیم طارق کا ہے، جنھوں نے علامہ کی عدم شرکت کو ثابت کرنے کے لیے جو کچھ بھی خامہ فرسائی کی ہے ان کے مصادر و مراجع مولانا عرشی اور مالک رام کی تحقیقات ہیں۔ حالانکہ مالک رام نے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی کے موقف کے خلاف اپنی تحقیق میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ علامہ کی رہائی کی کوششوں کے باوجود حکومت انگلشیہ نے انھیں رہائی نہیں دی تھی۔ مالک رام کی اس بات سے اختلاف کی گنجائش بھی نہیں نکلتی، کیونکہ اب تک کی تحقیقات سے ایسا کوئی دستاویزی ثبوت سامنے نہیں آسکا ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ علامہ کو پروانۂ رہائی ملا تھا، لیکن شمیم طارق کا "اسلوب تحقیق" ملاحظہ ہو کہ مولانا شیروانی کے موقف کے خلاف مالک رام اور مولانا عرشی کی تحقیقات پر حرف حرف ایمان لانے کے باوجود محض علامہ کی جنگ آزادی میں عدم شرکت کو ثابت کرنے کے لیے مولانا شیروانی کا موقف اختیار کر لیا، جبکہ شیروانی صاحب کا دعویٔ رہائی دستاویزی دلیل کا محتاج ہے۔ ان بوالعجبیوں کو دیکھ کر یہ شکوہ زبان پر آ ہی جاتا ہے کہ ان محققین نے علامہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اپنے مفروضہ اور مقلدانہ

نظریات کے اثبات میں جہاں کہیں سے جو کچھ ملا اسے پیش کر دیا-

یہاں یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حکومت نے علامہ کی رہائی کا پروانہ جاری کر دیا تھا تو بھی اس رہائی کو جنگ آزادی میں عدم شرکت کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا- اگر یہ محققین اس استدلال پر اصرار کرتے ہیں تو انھیں اپنے اس مفروضہ موقف سے بھی رجوع کرنا ہوگا کہ سید احمد رائے بریلوی کی تحریک انگریزوں کے خلاف تھی، کیونکہ 1864 میں مقدمہ انبالا میں اس تحریک کے جن سپہ سالاروں کو حکومت نے علامہ کی طرح کالا پانی کی سزا دی انھیں کچھ سالوں کے بعد رہا کر دیا، ان میں خاص طور پر میاں عبدالغفار، مولوی عبد الرحیم صادق پوری اور مولوی جعفر تھانیسری قابل ذکر ہیں- ان میں موخر الذکر ''سوانح احمدی'' کے مصنف، تحریک کے خاص رکن اور راز دار مولوی جعفر تھانیسری تو اس شان سے رہائی پا کر 1883 میں ہندوستان تشریف لائے کہ ان کے پہلو میں ایک عدد بیوی، آٹھ بچے اور جیب میں آٹھ ہزار روپے نقد تھے- اگر مذکورہ محققین کے نزدیک کسی کی رہائی کا مطلب بے گناہی ہے تو علامہ فضل حق ہی کیوں، انھیں اس تھیوری میں سید احمد رائے بریلوی کی تحریک کے ان تمام سپہ سالاروں کو شامل کرنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے، جن کی انگریز دشمنی کو ثابت کرنے کے لیے قلم کی پوری توانائی صرف کی جاتی رہی ہے-

علامہ فضل حق کا مجاہدین کی تعریف کرنا: ادبیات جنگ آزادی 1857 کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ بھی انگریزوں کے بہی خواہ تھے اور انگریزی سرکار کے خلاف اس جنگ کو غلط سمجھتے تھے انھوں نے عموماً اس جنگ کو غدر، ہندوستانیوں کے حملے کو بغاوت، نمک حرامی، فتنہ و فساد اور جنگ میں حصہ لینے والوں کو فسادی، نمک حرام، غدار اور باغی جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے- ایسے لوگوں میں سر سید احمد خاں، مولوی محمد حسین بٹالوی، مولوی محبوب علی (مرید و خلیفہ سید احمد رائے بریلوی) اور مولوی کرامت علی جونپوری (مرید سید احمد رائے بریلوی) وغیرہ کا نام پیش کیا جاسکتا ہے- جبکہ جو لوگ انگریزوں کے مخالف اور ان سے متنفر تھے نیز اپنے وطن کی آزادی کے خواہاں تھے، انھوں نے اس جنگ کو درست اور جائز قرار دیتے ہوئے اسے جہاد الی الحق سے تعبیر کیا اور جنگ میں حصہ لینے والوں کو مجاہدین، جواں مرد، دلیر اور جاں باز جیسے الفاظ سے یاد کیا- ایسے لوگوں میں علامہ فضل حق خیر آبادی کی ذات سب سے زیادہ نمایاں ہے- علامہ نے قصیدہ نونیہ میں

جنگ آزادی میں عملی شرکت کرنے والوں کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

وَ جَاء دِهْلِيْ غُزَاةٌ مُخْلِصُوْنَ غَزَوْا　　　رَجَاءَ فَضْلٍ مِنَ الْمَوْلٰى وَ رِضْوَانِ

دہلی میں کچھ مخلص مجاہدین بھی آئے جنھوں نے محض رضائے الٰہی کی امید میں جہاد کیا۔

(شعر 117)

وَلَا طَعَامٌ لَهُمْ غَيْرَ الْحُبُوْبِ وَلَا　　　لِبْسٌ لَهُمْ غَيْرَ أَطْمَارٍ وَ خُلْقَانِ

(مگر) اِن کے پاس سوائے چند دانوں کے کوئی کھانا نہیں تھا اور سوائے چند پرانے کپڑوں کے لباس (جنگ) نہیں تھے۔ (شعر 118)

سُلْحَانُهُمْ أَقْوَسٌ أَوْ أَسْيَفٌ صَدِئَتْ　　　لِطُوْلِ مَا لَزِمَتْ بُطْنَانَ أَجْفَانِ

ان کے ہتھیاروں میں کجی اور ٹیڑھا پن تھا، ان کی تلواریں عرصۂ دراز سے میانوں میں رہنے کے باعث زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ (شعر 119)

لٰكِنَّهُمْ نَجَدُوْهُمْ نَجْدَةً رَمَتْ　　　مِنْ حِزْبِهِمْ كُلَّ جَبَّانٍ بِجَبَّانِ

مگر جواں مردی و دلیری کی وجہ سے یہ انگریز فوج پر غالب آئے اور انھوں نے اپنے ان ہی ہتھیاروں سے میدان جنگ میں ہر بزدل کا مدفن بنا دیا۔ (شعر 120)

كَم مَرَّةً حَمَلُوْا فِيْهِمْ كَأَنْ حَمَلَتْ　　　أُسْدٌ جِيَاعٌ عَلٰى أَجْدٍ وَ حُمْلَانِ

بارہا وہ انگریز فوج پر اس طرح حملہ آور ہوئے جیسے بھوکے شیر اونٹنی اور بکری کے بچوں پر حملہ کرتے ہیں۔ (شعر 121)

إِنْحَازَ جُنْدُ النَّصَارَى كُلَّمَا حَمَلُوْا　　　وَلَمْ يَكُنْ لِلنَّصَارَى طَوْقُ حُمْلَانِ

جب بھی ان جانبازوں نے نصاریٰ کی فوج پر حملہ کیا اس نے شکست کھائی ان میں حملہ کرنے کی سکت بھی نہ رہی۔ (شعر 122)

قَدْ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ الْحَقِّ وَاتَّبَعُوْا　　　رِضْوَانَهُ وَ اسْتَحَقُّوْا رَوْضَ رِضْوَانِ

انھوں نے راہِ حق میں جہاد کیا اور رضائے الٰہی کے طریقے پر گامزن رہ کر جنت کے مستحق ہوئے۔ (شعر 123)

فَكَفَّرَ الْبَعْضُ بِالْأَجْرَاحِ مَا اجْتَرَحُوْا　　　وَرَاحَ بَعْضٌ إِلٰى رَوْحٍ وَ رَيْحَانِ

ان مجاہدین میں سے بعض نے اپنے زخموں کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور بعض واصل الی الحق ہو گئے۔ (شعر 124)

علامہ خیرآبادی کے یہ اشعار بجا طور پر انگریزی حکومت کے خلاف ان کے ذہن وفکر اور جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

زندگی کی ابتدا سے انتہا تک علامہ فضل حق کی انگریز مخالفت کا ثبوت: علامہ فضل حق خیرآبادی نے قصیدۂ رائیہ کو انیسویں صدی کے ربع اول میں نظم کیا، جب دہلی پر انگریز قابض ہو چکے تھے اور شاہ عالم ثانی کی بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ یہ علامہ کی زندگی کا ابتدائی دور تھا، اس وقت ان کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی اور وہ دہلی کی عدالت دیوانی میں سررشتہ دار تھے۔ دوسرا قصیدہ، قصیدہ لونیہ ہے جس کو علامہ خیرآبادی نے 1857 کی جنگ کے بعد لکھا، جب ہندوستانیوں کی استخلاص وطن کی کوششوں کو ناکام کر کے انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ علامہ کی زندگی کا آخری دور تھا اور ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی۔ اگر چہ دونوں قصائد مختلف حالات اور الگ الگ دور میں لکھے گئے اور ان دونوں کے لکھنے کے درمیان تقریباً چالیس سال سے زائد کا فرق بھی ہے، لیکن ان دونوں قصائد کے مطالعے سے حیرت انگیز طور پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ دونوں کے موضوعات (انگریزوں کی مذمت) میں یکسانیت کے ساتھ مضامین میں بھی حد درجہ مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انگریزوں کے غاصبانہ تسلط، پوشیدہ عزائم، غلط پالیسی، آمرانہ رویہ اور جابرانہ نظام حکومت کے تعلق سے علامہ کی جو منفی رائے ان کی زندگی کے آخری ادوار میں تھی وہ جنگ میں پسپائی اور حالات کے زیر اثر نہ تھی بلکہ زندگی کے آغاز سے ہی تھی، جس کا اظہار انھوں نے زندگی کی ابتدا میں بھی کیا اور اسی کا اعادہ آخر میں بھی کیا۔

دونوں قصائد کے مضامین میں یکسانیت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

انگریزوں کا اصل مقصد عیسائی بنانا: علامہ نے قصیدہ رائیہ کے شعر نمبر 96 میں ذکر کیا ہے کہ انگریزوں کا مقصد سارے دین وملت کے لوگوں کو عیسائی بنانا ہے اور چالیس برسوں کے بعد قصیدہ لونیہ کے شعر نمبر 46 میں بھی اسی ذکر کا اعادہ کیا۔ فرماتے ہیں:

فَلَيْسَ مَقْصُوْدُهُمْ تَرْوِيْجَ مَعْرِفَةٍ　　　بَلْ كُلُّ ذٰلِكَ تَمْهِيْدٌ لِتَنْصِيْرِ

ان مدارس سے ان کا مقصود علم و معرفت کی اشاعت نہیں ہے بلکہ یہ تمام کاوشیں لوگوں کو نصرانی بنانے کی ایک تمہید ہے۔ (قصیدہ رائیہ)

وَتِلْكَ أَنَّ النَّصَارَى كَانَ نِيَّتُهُمْ　　　تَنْصِيْرَ مَنْ فِي الْوَرَى مِنْ أَهْلِ أَدْيَانِ

وہ حادثہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا مقصد سارے دین وملت کے لوگوں کو عیسائی بنانا ہے۔ (قصیدہ نونیہ)

مدارس کا قیام اور ان کا مقصد: علامہ نے قصیدہ رائیہ کے شعر نمبر 93 میں ذکر کیا ہے کہ انگریزوں نے ہندستانی بچوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے مدارس و دانش گاہیں تعمیر کروائیں جہاں انگریزی پادریوں کے ذریعے گمراہی و بے دینی، جھوٹ اور بہتان ترازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چالیس سال کے بعد اسی بات کا اعادہ قصیدہ نونیہ کے شعر نمبر 50/51 میں بھی کیا گیا ہے۔

بَنَوْا مَدَارِسَ طَمْساً لِلْعُلُوْمِ كَمَا　　　سَمُّوْا مَجَاهِيْلَ جَهْلاً بِالنَّحَارِيْرِ

انھوں نے مدارس بنائے تا کہ علوم کا خاتمہ کر دیں، جس طرح انھوں نے اپنی جہالت کی بنا پر جاہلوں کا نام ماہرین رکھ دیا۔ (قصیدہ رائیہ)

بَنَوْا أَرَاذِلَ هَدْماً لِلنُّبَالِ كَمَا　　　بَنَوْا مَدَارِسَ تَخْرِيْباً لِصِبْيَانِ

باکمال لوگوں کو مٹانے کے لیے انھوں نے کمین و ذلیل لوگوں کو نوازا اسی طرح بچوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے مدارس و دانش گاہیں تعمیر کروائیں۔

بِدَرْسِ رَسْمِ الْهُدَى هَمُّوْا لِدَرْسِ لَغًى　　　مِمَّا افْتَرَى الْقَسُّ مِنْ زُوْرٍ وَبُهْتَانِ

ان مدارس و دانش گاہوں میں رشد و ہدایت کو مٹا کر گمراہی و بے دینی، جھوٹ، بہتان ترازی کی تعلیم دی جاتی جو ان کے پادریوں کے دلوں کی اپج ہے۔ (قصیدہ نونیہ)

کسانوں اور دیگر اہل حرفت وصنعت پر مظالم: علامہ نے قصیدہ رائیہ کے شعر نمبر 217/218/219 میں ذکر کیا ہے کہ انگریزوں نے سوت کاتنے والی تنگ دست عورتیں ہوں یا غریب لوہار اور کاریگر، ہر ایک کی روزی کے راستے مسدود کر دیے ہیں۔ چالیس سال کے بعد اسی بات کو قصیدہ نونیہ کے شعر نمبر 56/57 میں بھی دہرایا گیا ہے:

قَدْ أَحْرَقُوْا وَاعْتَنَوْا بِالْإِحْتِرَافِ لِكَيْ　　　يُلْقُوْا أُولِي الْحِرَفِ فِي حَرْفٍ وَتَقْتِيْرِ

فقر کے بعد وہ مال دار ہو گئے اور مکر و حیلے کی طرف متوجہ ہوئے تا کہ اہل حرفت کو محرومی اور تنگی رزق میں مبتلا کر دیں۔

فَلَيْسَ فِي الْغَزْلِ جَدْوَى لِلْعَجُوزِ وَلَا لِحَائِكٍ أُجْرَةٌ فِي النَّسْجِ وَالنَّيْرِ

تو اب ایک بوڑھے کے لیے سوت کاتنے میں کوئی نفع نہیں رہ گیا اور نہ ہی کپڑا بننے والے کے لیے کپڑا بننے کی کوئی اجرت ہے۔

دَارَتْ رَحَاهُمْ عَلَى الطَّحَّانِ فَانْقَلَبَتْ رَجَاهُ مِنْهَا طَحِيْنًا فِيْ رَحَى الْجُوْرِ

انگریزوں کی چکی آٹا پیسنے والے کے اوپر چلی تو اس کی امیدیں ہلاکت کی چکی میں پس گئیں۔

(قصیدہ رائیہ)

وَقَتَّرُوْا رِزْقَ كُلِّ مِنْ غَوَازِلَ أَوْ نُكْدٍ يَحُكْنَ وَصُنَّاعٍ وَأَقْيَانِ

سوت کاتنے والی تنگ دست عورتیں ہوں یا غریب لوہار اور کاریگر ہوں، ان انگریزوں نے ہر ایک کی روزی کے راستے مسدود کر دیے۔

لَمْ يَتْرُكُوْا مِنْ فَلَاحٍ فِي الْفَلَاحَةِ بَلْ دَقُّوْا رَحَى كُلِّ دَقَّاقٍ وَ طَحَّانِ

حتیٰ کہ کسانوں کی کھیتی باڑی میں بھی کوئی نفع نہیں چھوڑا بلکہ غریب آٹا پیسنے والے کی چکی تک چکنا چور کر دی۔ (قصیدہ نونیہ)

ٹیکس مقرر کرنا: علامہ نے قصیدہ رائیہ کے شعر نمبر 128/129/130 میں بیان کیا ہے کہ گوروں نے ہر چیز پر ٹیکس لگا دیا ہے۔ اسی بات کا اعادہ قصیدہ نونیہ کے شعر نمبر 61 میں بھی کیا کہ انھوں نے کس طرح اونٹ، ہاتھی، بیل وغیرہ جانوروں کے راستوں میں چلنے پر بھی ٹیکس مقرر کر دیا ہے۔

يُقَدِّرُوْنَ خَرَاجاً بَعْدَ أَنْ مَسَحُوا الْـ أَرَاضِ مَا بَيْنَ مِمْحَالٍ وَمَمْطُوْرٍ

وہ زمینیں جو قحط زدہ تھیں یا بارش سے سیراب ہوئی تھیں ان سب پر قبضہ کر کے ان پر ٹیکس نافذ کر دیا۔

فَيَسْتَوِيْ فِي الْأَتَاوَى فِيْ جِبِلَّتِهِمْ زَرْعٌ مَجُوْدٌ وَقُطْرٌ غَيْرُ مَقْطُوْرٍ

وہ زمینیں جو انسان نے خود سیراب کی ہیں اور وہ زمینیں جن کو بارش نے سیراب کیا ہے ان کے ٹیکس کے معاملے میں یکساں ہیں۔

أَقْوَتْ قُرَى وَبِلَادٌ مِنْ مَظَالِمِهِمْ وَبَلْقَعَتْ وَتَخَلَّتْ مَا بِهَا طُوْرِيْ

ان کے مظالم کی وجہ سے گاؤں اور شہر بے آب و گیاہ اور ویران ہو گئے۔ (قصیدہ رائیہ)

قَدْ أَوْجَبُوْا مَغْرَمًا فِي السَّيْرِ فِيْ طُرُقٍ　　　عَلَى جِمَالٍ وَ أَفْيَالٍ وَ ثِيْرَانِ

ان گوروں نے اونٹ، ہاتھی، بیل وغیرہ جانوروں کے راستوں میں چلنے پر بھی ٹیکس مقرر کر دیا۔

(قصیدہ نونیہ)

عدالت کا نظام اور رشوت وغیرہ: علامہ فضل حق خیرآبادی نے قصیدہ رائیہ کے شعر نمبر 109/110/111 میں لکھا ہے کہ انگریزوں کے فیصلے فریقین کے مال کو چھین لیا کرتے اور انھیں نقصان وخسارے کی بنا پر رشوت کی لعنت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی بات کو چالیس برسوں کے بعد قصیدہ نونیہ کے شعر نمبر 62 میں بھی نظم کیا گیا ہے۔

يَقْضُوْنَ عِنْدَ خِصَامِ النَّاسِ بَيْنَهُمْ　　　بِمَا يُؤَدِّيْ إِلَى بَخْسٍ وَتَخْسِيْرٍ

یہ لوگوں کے درمیان اس طور پر فیصلہ کرتے ہیں جس سے لوگوں کا سراسر خسارہ اور نقصان ہی ہوتا ہے۔

وَيَأْخُذُوْنَ مِنَ الْخَصْمَيْنِ مَالَهُمَا　　　أَجْراً عَلَى سَمْعِ إِقْرَارٍ وَتَقْرِيْرٍ

جو لوگ ان کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں، ان سے یہ مقدمے کی سماعت کے نام پر پیسے اینٹھ لیتے ہیں۔

وَأَيُّ مَظْلِمَةٍ أَدْهَى وَأَعْظَمُ مِنْ　　　بَيْعِ الْقَضَاءِ بِتَقْوِيْمٍ وَتَسْعِيْرٍ

اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ فیصلہ کرنے کی بھی قیمت متعین کر دی جائے۔

(قصیدہ رائیہ)

قَضَاؤُهُمْ يَسْلُبُ الْخَصْمَيْنِ مَالَهُمَا　　　فَيَبْتُلُوْنَهُمَا سُحْتًا بِخُسْرَانِ

ان کے فیصلے فریقین کے مال کو چھین لیا کرتے اور انھیں نقصان وخسارے کی بنا پر رشوت کی لعنت میں مبتلا کر دیتے۔ (قصیدہ نونیہ)

کمینے سردار ہوئے، سردار ذلیل ہوئے: علامہ نے قصیدہ رائیہ کے شعر نمبر 212 میں بتایا کہ کس طرح انگریزی سازشوں کے وجہ سے عزت وشرف والے ذلیل ہو گئے، طاقت ور کمزور ہو گئے، مالدار مفلس و نادار ہو گئے، کمینے اور ذلیل لوگ عزت وشرف والے بن گئے۔ اسی کرب کا

اظہار چالیس برسوں کے بعد علامہ نے قصیدہ نونیہ کے شعر نمبر 81 میں بھی کیا ہے۔فرماتے ہیں:

أُولُوالْحَسَابَةِ فِيْ حُسْبَانِهِمْ سُفَلٌ وَالسُّفْلُوْنَ أَهْلٌ لِإِحْسَابٍ وَتَوْقِيْرٍ

حسب والے شریف لوگ ان کی نظر میں ذلیل وحقیر ہیں اور ذلیل وحقیر لوگ ان کی نظر میں عطاوکرم اور توقیر کے حق دار ہیں۔(قصیدہ رائیہ)

ذَلَّ الْعَزِيْزُ وَ عَزَّ الْعَزُّ وَالْفَقَرُ الْـ غَنِيُّ وَ ابْتَزَّ وَاعْتَزَّ (الرَّدَى) الدَّانِيْ

عزت وشرف والے ذلیل ہو گئے، طاقت ور کمزور ہو گئے، مالدار مفلس و نادار ہو گئے، کمینے اور ذلیل لوگ عزت وشرف والے بن گئے۔(قصیدہ نونیہ)

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے خلاف علامہ فضل حق خیرآبادی کی فکر اور ان کے موقف میں ابتدا سے انتہا تک کبھی لچک نہیں آئی، انھوں نے اپنی زندگی کے آغاز میں انگریزوں سے جس نفرت وبیزاری کا اظہار کیا وہ آخری سانس تک قائم رہی اور اس کا اظہار وہ متعدد سطحوں سے مختلف ادوار میں کرتے رہے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بعض محققین علامہ کے قصیدۂ ہمزیہ کے شعر نمبر 163 اور 164 کو بنیاد بنا کر معرکۂ ستاون میں ان کی عدم شرکت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان اشعار میں علامہ فرماتے ہیں:

> ''میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا۔میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا، یہ میں نے بڑا جرم کیا، جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لیے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا، میں شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادت مندوں نے جام شہادت نوش کیا۔اے پروردگار! میرے قصور کو معاف کر۔''
>
> (باغی ہندوستان، ص:103)

پہلی بات تو یہ کہ انگریزوں کی مخالفت ونفرت اور جنگ میں عملی وفکری شرکت کے ثبوت میں درجنوں شواہد سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ان دو اشعار کے ظاہری الفاظ کی بنیاد پر جنگ میں علامہ کی عدم شرکت کا فیصلہ صادر کرنا خلاف تحقیق طرز عمل ہے۔دوسری بات یہ کہ محققین کو یہ

دیکھنا چاہیے کہ قائل کس پس منظر اور کن حالات میں کس کے روبرو یہ باتیں کہہ رہا ہے۔ یہ باتیں اس شکست خوردہ شخص کی ہیں جو استخلاص وطن کی کوششوں میں ناکام ہو چکا ہے، قید و بند کی اذیتوں نے اس کے جسم اور روح کو درد و کرب سے گھائل کر رکھا ہے، شاہانہ ناز و نعم اور اپنی اولاد و اقارب سے دور بیماری اور مجبوری میں سزا کاٹ رہا ہے۔ ایسے مصائب و آلام میں ان بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے وہ اپنے رب کے حضور اپنی بندگی، کوتاہی اور عجز و درماندگی کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے مغفرت کا خواست گار اور رحمتوں کا طلب گار ہے۔ کیونکہ جب بندہ مسلسل مشکلات اور مصائب سے دوچار ہوتا ہے تو نارسائی کا کرب اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی مجبوری و مقہوری، کوتاہی اور گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی نعمتوں کا سزاوار ہو۔ اللہ رب العزت سے حاجت برآری کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ بندے اور معبود کے درمیان ان باتوں کی حیثیت ایک راز کی ہوتی ہے۔ اسے دلیل اور حجت کے طور پر پیش کرنا ناپختہ ذہن و فکر کی علامت ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو علامہ نے اسی قصیدے کے شعر نمبر 177/178/179 میں بھی اپنے رب کے حضور کچھ یوں بھی کہا ہے:

> ''(اے پروردگار!) مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا، بلکہ بداعمالی میں ہی مبتلا رہا۔ میری عمر لہو و لعب میں بے کار گزری اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا۔ کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا۔''
>
> (باغی ہندوستان، ص:105)

کیا ان باتوں کو بھی دلیل بنا کر یہی کہا جائے گا کہ علامہ خیرآبادی نے پوری زندگی کوئی نیکی اور ثواب کا کام نہیں کیا اور پوری زندگی انھوں نے لہو و لعب میں رہ کر بے کار گزار دی؟

□□□

مرکزِ علم وفن خیر آباد کی سیر

ہندوستان میں جن خانوادوں نے اپنی علمی، فکری، قلمی، تدریسی اور دینی خدمات سے "مرکز علم وفن" کی بنیاد ڈالی، ان میں خانوادۂ خیر آباد امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اس خانوادے میں حضرات وخواتین کی ایک معقول تعداد گزری ہے جس کا علمی فیضان متحدہ ہندوستان کے بڑے حلقے تک پہنچا۔ خصوصیت کے ساتھ اس خانوادے کی یکے بعد دیگرے تین نسلوں میں تین شخصیتیں ایسی بھی گزری ہیں جن کے علم وفضل اور خدمات نے خیر آباد اور خانوادۂ خیر آباد کو "مرکز ثقل" بنا دیا۔ ہندوستان کے جس خطے میں یہ لوگ گئے معقولات ومنقولات کی تحصیل کے لیے طالبان علم وفن کھنچے چلے آئے اور علم وفن کی مسند آراستہ ہو گئی۔ یہ تین نمایاں ترین حضرات یہ تھے:

1۔ مولانا فضل امام خیر آبادی (ف: 1240ھ/1824) سرسید نے جنھیں "مہبط انوار فیوض قدسی، قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول ومنقول، سند اکابر روزگار اور موسس اساس ملت ودین" کے خطاب سے یاد کیا☆۔ مولانا کے سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ جس زمانے میں "ایک جانب شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا اور دوسری طرف اسی دہلی میں مولانا فضل امام کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا۔"☆☆

☆ آثار الصنادید، جلد دوم، ص: 87 ☆☆ باغی ہندوستان، ص: 138

2- دوسرے مولانا فضل حق خیرآبادی بن مولانا فضل امام، جو بقول مرزا غالب ''فخر ایجاد وتکوین'' تھے- حکیم سید محمود احمد برکاتی نے مختصر لفظوں میں مولانا کا بڑا جامع تعارف کرایا ہے:

''الٰہیات، علم کلام، منطق اور فلسفے کے امام وقت تھے، برعظیم کے معقولین میں ابتدا سے اب تک ان کا کوئی مثیل ونظیر نہیں ہے — نصف صدی تک مسلسل تدریس کرتے رہے اور تلامذہ کی ایک معقول تعداد نے آپ سے کسب کمال کیا — علم میں اس علومقام کے ساتھ مولانا کی حیات کا ایک تابناک باب یہ ہے کہ آپ ایک مدبر سیاسی اور مجاہد بھی تھے-'' ☆

3- اور تیسرے مولانا عبدالحق خیرآبادی (1224ھ/1316ھ) جنھیں والد ماجد مولانا فضل حق خیرآبادی نے اپنی اسیری کے ایام (جزیرۂ انڈمان) میں ''ہندوستان میں اپنی یادگار'' کہا تھا- مولانا عبدالحق کے فضل وکمال اور درس وتدریس کا یہ عالم تھا کہ ان کی شہرت ہندوستان سے نکل کر بیرون ہند تک پہنچ گئی تھی- اس بات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب مولانا اس دنیا سے وصال فرما گئے تو نہ صرف ہندوستان کے مدارس نے ماتم کیا بلکہ بیرون ہند کے علما نے بھی سوگ منایا- سلطان مسلمین بادشاہ ترکی نے بھی ایک ہفتے تک مدرسہ اظہریہ میں تعطیل رکھی اور ملکی وغیرملکی جرائد نے مقالات لکھے- ☆☆

خانوادۂ خیرآباد کے اسی علمی امتیاز اور کشش نے دل میں خیرآباد کی زیارت کا شوق پیدا کیا، تاکہ اس خاندان کی موجودہ نسل اور ان کے حالات سے آگہی ہو، جو افراد یہاں دفن ہیں ان کی قبروں کے نشانات ہیں یا نہیں، یہ دیکھا جائے، علامہ فضل حق خیرآبادی کی وہ عالی شان حویلی جس کا ذکر بزرگوں سے سنا وہ اس وقت کس حال میں ہے، اس کی زیارت کی جائے اور اس خاندان کے ذخیرۂ علمی وفکری کا کچھ سراغ مل جائے تو اسے بھی حاصل کیا جائے- کیونکہ سیکڑوں صفحات کے مطالعے کے باوجود علامہ فضل حق کے خانوادے کے موجودہ حالات اور ان کے باقی ماندہ آثار ونشانات کا علم نہ ہوسکا، جن محققین اور اہل قلم نے کہیں اختصار کے ساتھ ذکر بھی کیا ہے تو ان کی معلومات بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے دہے کی ہے- ان معلومات کے بعد تقریباً چار پانچ دہائیاں گزر چکی ہیں اور سبھی حالات اب یکسر تبدیل ہوگئے ہیں-

---

☆ فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص: 19 ☆☆ باغی ہندوستان، ص: 317

کتب خانہ قادریہ میں خانوادۂ خیرآباد کے علمی نوادر: خیرآباد اور خانوادۂ خیرآباد کے موجودہ حالات کو جاننے کے لیے ہم نے 15 مئی 2011 کو رخت سفر باندھا اور محب گرامی مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری کے ہمراہ بذریعہ کار دہلی سے روانہ ہوئے اور اسی دن شام کو ہم خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں پہنچ گئے۔ 15 مئی کی رات اور 16 مئی کو ہم نے خانقاہ میں قیام کیا۔ دوران قیام خانوادۂ عثمانیہ کی تقریباً پانچ سو سالہ قدیم لائبریری "کتب خانہ قادریہ" کی زیارت کی۔ یہ اپنی طرز کی نادر لائبریری ہے جہاں مختلف علوم وفنون کی ہزاروں کم یاب کتابوں کے ساتھ سیکڑوں نایاب مخطوطات بھی موجود ہیں، خصوصیت کے ساتھ تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے جتنے بھی علمی اور مسلکی معرکے ہوئے ہیں ان پر تمام قیمتی مواد اور کتابیں محفوظ ہیں۔ معروف محقق پروفیسر محمد ایوب قادری جس زمانے میں "تذکرۂ علمائے ہند" مولفہ مولوی رحمٰن علی (ف: 1335ھ/1905) کے ترجمہ، ترتیب اور حاشیے کا کام کر رہے تھے تو قدیم تذکروں کی تلاش میں 1960 میں بدایوں بھی پہنچے اور کتب خانہ قادریہ دیکھا۔ تذکرۂ علمائے ہند کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

> "شیخ عبد الحمید السالم میاں سجادہ نشیں درگاہ قادریہ بدایوں اور مولوی عبد المجید اقبال میاں کی عنایت سے مدرسہ قادریہ کا نادر کتب خانہ دیکھنے کو ملا جس میں تقریباً دس ہزار کتابیں ہوں گی، جن میں سے چار ہزار کے قریب تو صرف مخطوطات ہیں۔" (تذکرۂ علمائے ہند، ص: 27)

حضرت صاحب سجادہ شیخ عبد الحمید محمد سالم میاں قادری نے کتب خانہ قادریہ کی 1985 میں ترتیب وتجدید کی، اس کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا اسید الحق قادری نے جامعہ ازہر مصر سے تعلیمی فراغت کے بعد 2007 میں اس کی توسیع وتزئین کا کام کیا۔ چونکہ خانوادۂ عثمانیہ بدایوں اور خانوادۂ خیرآباد کے درمیان تقریباً دو سو سالوں سے افادہ واستفادہ کا رشتہ رہا ہے ☆ اس لیے

☆ سیف اللہ المسلول علامہ فضل رسول عثمانی بدایونی (1289ھ/1213ھ) علامہ فضل حق خیرآبادی کے معاصر تھے، ان دونوں کے درمیان خلوص ومحبت اور دوستانہ مراسم تھے، دین وسنیت کی اشاعت اور اعتقادی انحراف کے خلاف تحریک میں ایک دوسرے کے معاون تھے۔ سیف اللہ المسلول مولانا فضل رسول بدایونی کی مشہور زمانہ تصنیف "المعتقد المنتقد" پر علامہ فضل حق خیرآبادی نے تقریظ بھی لکھی ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کتب خانہ قادریہ میں خیرآبادیات کے تعلق سے قلمی نوادر، قدیم مطبوعات اور عربی قصائد موجود ہیں، میری گزارش پر مولانا اسید الحق نے جن چند نوادر کی زیارت کرائی ان کا اجمالاً یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔☆:

1- امتناع النظیر: علامہ فضل حق خیرآبادی کی معروف تصنیف ہے۔ یہ قلمی نسخہ بڑی تقطیع کے 284 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ف:1358ھ/1939) نے جب اس کی اشاعت کا ارادہ کیا تو مختلف قلمی نسخوں کے ساتھ اس قلمی نسخے سے بھی استفادہ کیا۔

2- تحقیق الفتوی فی ابطال الطغویٰ: یہ بھی علامہ فضل حق خیرآبادی کی مشہور تصنیف ہے یہ قلمی نسخہ چھوٹے سائز میں 212 صفحات پر مشتمل ہے، جسے علامہ کے شاگرد رشید تاج الفحول مولانا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے۔

3- ہدیہ سعیدیہ: یہ بھی علامہ خیرآبادی کی معروف تصنیف ہے۔ یہ قلمی نسخہ متوسط تقطیع میں 204 صفحات پر مشتمل ہے، کاتب کا نام نہیں جبکہ سال کتابت 1289ھ درج ہے۔

4- حاشیہ قاضی مبارک: علامہ فضل حق خیرآباد کا یہ مشہور زمانہ حاشیہ جو معقولات پر علامہ کے علمی اور اجتہادی مرتبے کا تعین کرتا ہے، یہ نسخہ مولانا سناء الدین عثانی کے ذخیرۂ علمی کا ہے، جو 1302ھ میں مولانا عبد القیوم قادری بدایونی تلمیذ تاج الفحول مولانا عبد القادر بدایونی کے زیر مطالعہ رہا۔

5- مجموعۂ قصائد علامہ فضل حق: اس مجموعے میں علامہ خیرآبادی کے 14 عربی قصائد ہیں جن میں اشعار کی مجموعی تعداد 1652 ہے۔ یہ قصائد 1269ھ اور 1270ھ کے درمیان نقل

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) اسی رشتۂ خلوص ومحبت کی وجہ سے سیف اللہ المسلول نے اپنے صاحبزادے تاج الفحول مولانا عبد القادر عثانی بدایونی (1253ھ/1319ھ) کو معقولات کی تحصیل کے لیے علامہ خیرآبادی کی درس گاہ میں لکھنؤ اور الور بھیجا۔ علامہ کے شاگردوں کی طویل فہرست میں وہ چار حضرات جو عناصر اربعہ سمجھے جاتے ہیں ان میں ایک مولانا عبد القادر بدایونی بھی ہیں۔

☆ کتب خانہ قادریہ میں خیرآبادی نوادر کے تعلق سے مزید تفصیل مولانا اسید الحق قادری کی کتاب "خیرآبادیات" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کیے گئے ہیں- ان 14 قصائد میں ایک کے علاوہ بقیہ 13 قصائد مولانا سناء الدین عثمانی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں- حاشیہ اور بین السطور میں حل لغات بھی ہے جو بقول مولانا اسید الحق ان کے پر دادا حضرت تاج الفحول کے قلم کا ہے-

6- فتویٰ تردید حیدر علی ٹونکی: علامہ فضل حق خیر آبادی کا یہ فتویٰ مولانا حیدر علی ٹونکی کی بعض عبارات سے متعلق ہے- اس میں پندرہ سوالات پر مشتمل استفتا ہے، جس پر علامہ کا تفصیلی جواب ہے جو دہلی، رام پور اور مرادآباد وغیرہ کے 30 سے زائد علما کی تصدیقات سے مزین ہے- یہ قلمی نسخہ دس صفحات پر مشتمل ہے جس پر علامہ کی مہر بھی ہے- یہ فتویٰ مطبع ہدایہ دہلی سے 1269ھ میں شائع بھی ہوا تھا-

7- مجموعۂ مکاتیب: اس میں کل سات خطوط ہیں، علامہ فضل حق خیر آبادی نے حیدر علی ٹونکی سے متعلق پندرہ سوالات پر مشتمل جس استفتا کا جواب دیا تھا اس میں چھٹے سوال کے جواب پر علامہ خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ اور علامہ فضل رسول بدایونی کے درمیان سلسلۂ مکاتبت شروع ہوا- اس میں تین خطوط مفتی آزردہ کے ہیں، دو علامہ خیر آبادی اور ایک علامہ فضل رسول کے نام- تین علامہ خیر آبادی کے ہیں مفتی آزردہ کے نام اور ایک خط علامہ فضل رسول کا ہے علامہ خیر آبادی کے نام-

خیرآباد کی قدامت و اہمیت: کتب خانہ قادریہ میں خیر آبادی نوادر کی زیارت کے بعد 17 مئی 2011 کو صبح 9 بجے بذریعہ کار ہم بریلی اور شاہجہاں پور ہوتے ہوئے خیر آباد کی طرف روانہ ہوئے- خیر آباد اودھ کے قصبات میں اپنی قدامت اور علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے- خیر آباد ضلع سیتاپور، اتر پردیش میں واقع ہے- یہ قصبہ سیتاپور سے 6 کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق کی جانب اور لکھنو سے تقریباً 75 کلومیٹر کی مسافت پر مغرب میں دہلی لکھنو ہائی وے پر ہے-

خیر آباد کی قدامت کے تعلق سے سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی نے لکھا ہے کہ:

> ''اس قصبہ کی تاریخ بہت قدیم ہے، تلاش و جستجو سے انکشاف ہوا ہے کہ راجہ بکرماجیت کے دور سے قبل یہاں آبادی موجود تھی، اس وقت اس کا نام

''چتر ریتھا'' تھا، پھر راجہ بکر ماجیت کے عہد میں منسا دیوی کی مناسبت
سے ''منسا چتر'' کے نام سے موسوم ہوا—— عہد اسلامی میں سب سے
پہلے حضرت یوسف غازی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقا کے ساتھ تشریف لائے،
آپ کی آخری آرام گاہ یہیں ہے —— البتہ ملا عبدالقادر بدایونی نے
منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس قصبے کو سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود
نے آباد کیا—— اس سے پہلے آبادی میں نظم وضبط نہیں باقی رہا تھا،
سلطان ابراہیم نے پوری توجہ صرف کر کے اس کو باقاعدہ آباد کیا اور اغلب
خیال ہے کہ اس وقت سے اس کا نام ''خیرآباد'' ہو گیا جو اب تک قائم
ہے''۔(خیرآباد کی ایک جھلک، ص:8/9)

سلطان ابراہیم کے بعد خیرآباد مختلف شعبوں میں مسلسل ترقی کرتا رہا، یہاں کثرت سے بزرگان دین بھی تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے، ان بزرگوں میں خاص طور پر خلیفۂ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا، حضرت عثمان غزنوی اور ان کے بعد مخدوم شاہ مینا لکھنو کے مرید حضرت مخدوم شیخ سعدالدین (ف:922ھ) تشریف لائے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ مخدوم صاحب کی تشریف آوری سے خیرآباد کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور یہ قصبہ خاص اہمیت کا حامل بن گیا۔ جب مغلوں کا دور آیا تو خیرآباد کی مختلف خصوصیات کے سبب اسے ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ اسی دور میں حضرت بڑے مخدوم کے خلیفہ حضرت مخدوم سید نظام الدین اللہ دیہ عرف چھوٹے مخدوم صاحب (ف:993ھ) کے روحانی مقام سے اکبر اعظم اور فیضی ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے تھے۔ فیضی کی عقیدت کا تو یہ عالم تھا کہ حضرت کے وصال کے بعد ان کا عالی شان مزار تعمیر کرایا جو آج بھی موجود ہے۔

مغلیہ عہد میں ہی جب صوبہ اودھ نے مرکز سے علاحدہ ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو نوابان اودھ کی ایک الگ سلطنت قائم ہو گئی، مگر انھوں نے بھی خیرآباد کی مرکزیت کو سلامت رکھا۔ اس کے بعد انگریزی سرکار کا دبدبہ ہندستان پر قائم ہونے لگا تو اودھ کی سلطنت کو بھی ان لوگوں نے ضبط کر لیا۔ خیرآباد کی شہرت وعظمت اور اس کے بعد کے معاملات کے تعلق سے ''گزیٹیر ضلع

سیتاپور'' میں لکھا ہے کہ:

''پرانے زمانے میں خیر آباد بڑا مشہور مقام تھا، کیونکہ صدیوں تک مسلمان صوبہ داروں کا صدر مقام رہا اور عہد اکبری میں صوبہ اودھ کی سرکار کا صدر مقام تھا، ضبطی اودھ کے بعد اس نام سے کمشنری رہی اگرچہ کمشنر شروع ہی سے سیتاپور میں رہتا تھا۔'' (ضلع گزیٹیر سیتاپور، ص:162)

عہد اسلامی سے مغلیہ عہد (ضبطی اودھ) تک خیر آباد مسلسل ترقی کرتا رہا، لیکن 1857 کے بعد انگریزی عہد حکومت آتے ہی اس کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ سید نجم الحسن رضوی نے خیر آباد سے انگریزوں کی کدورت کے دو اسباب بیان کیے ہیں:

ایک تو مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی کا انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینا اور دوسرا یہاں کے ایک صوبے دار راجہ ہر پرشاد کا ملکہ نیپال سے مل کر علم بغاوت بلند کرنا۔ یہ دو ایسے سنگین جرائم تھے جن کی پاداش میں انگریزوں نے خیر آباد کی مرکزیت کا خاتمہ کر دیا اور یہاں بے روزگاری کو فروغ دینا شروع کیا جس کی وجہ سے جو خیر آباد کبھی دوسرے مقامات کے لیے مرکز رشک بنا ہوا تھا وہ ویرانے میں تبدیل ہونے لگا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ خیر آباد، آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا قصبہ ہونے کے باوجود اپنی علمی، ادبی، سیاسی اور روحانی عظمتوں کی وجہ سے مرکزی مقام رہا ہے، اس خطے سے علم و معرفت کے چشمے جاری ہوئے، علوم عقلیہ ونقلیہ کے دریا بہے، شعر وسخن کی بزم میں آراستہ ہوئیں اور اسی سرزمین پر ایسے مشاہیر علما، ادبا، شعرا اور حکما پیدا ہوئے جنھوں نے ملک کیر سطح پر اپنے علم وفن کا لوہا منوایا۔ لیکن خانوادۂ خیر آباد بالخصوص علامہ فضل حق خیر آبادی کی ذات گرامی نے اپنے علم وفضل، معقولات ومنقولات کی تعلیم وتدریس اور معرکۂ ستاون میں اپنی عملی وفکری شرکت کی وجہ سے اس قصبے کو پوری دنیا میں متعارف کرا دیا۔ مولانا سید میاں میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے وہ قصبے جو مردم خیزی میں مشہور ہیں، ان میں ضلع سیتاپور کا قصبہ خیر آباد بھی ہے۔ اب چودھویں صدی کے ربع آخر میں اس کی حالت کچھ بھی ہو مگر حلقہ درس وتدریس سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں

کہ گزشتہ صدی کے آخر تک خیرآباد کو خیرالبلاد لکھا جاتا تھا۔''

(علمائے ہند کا شاندار ماضی، حصہ: چہارم، ص:949)

بدایوں سے 9 بجے روانہ ہو کر تقریباً 2 بجے دن ہم دہلی لکھنو نیشنل ہائی وے کے اس مقام پر پانچ گئے جہاں سے مغرب کی جانب خیرآباد کے لیے سڑک جاتی ہے۔ ہائی وے سے خیرآباد تقریباً 2 کلومیٹر ہے۔ 2001 میں حکومت کی جانب سے کی گئی مردم شماری کے مطابق یہاں کی کل آبادی 38364 ہے۔ جبکہ تعلیمی شرح 49 فیصدی ہے۔ چونکہ مردم شماری دس سال قبل کی ہے اس لیے ان دس سالوں میں یقیناً وہاں کی شرح آبادی میں اضافہ ہوا ہوگا۔ جیسے ہی ہماری کار خیرآباد کے حدود میں داخل ہوئی ہم نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یہ قصبہ ہندوستان کے عام قصبوں سے بالکل الگ ہے، یہاں جگہ جگہ اس کی پرانی عظمتوں کے نشانات دکھائی دیے۔ کہیں پرانی حویلیوں کے باقی ماندہ آثار نظر آئے۔ کہیں بلند و بالا برجیاں اور کہیں عالی شان مساجد کے کنگرے دکھائی دیے، ان کے علاوہ کئی بزرگوں کی درگاہیں اور مقبرے بھی جابجا نظر آئے۔ ان حویلیوں، مسجدوں، درگاہوں اور سرکاری و نیم سرکاری دفتروں کی عمارتوں کی طرز تعمیر کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ اگلے وقتوں میں یہ قصبہ کن اہمیتوں اور عظمتوں کا حامل ہوگا۔

فضل حق چوک اور فضل حق مارگ: علامہ فضل حق خیرآبادی کی 1857 میں ہندوستان کی آزادی کے لیے بے مثال جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود حکومتی سطح پر ان کے نام سے منسوب کوئی یادگار قائم نہیں کی جا سکی۔ ایسے مجاہدین کے تئیں کچھ تو مؤرخین کی بے اعتنائی اور کچھ حکومت ہند کی چشم پوشی نے ان کی قربانیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ان دونوں طبقوں کی شعوری یا غیر شعوری تساہلی کا ہی نتیجہ ہے کہ نئی نسل علامہ خیرآبادی اور ان جیسے مجاہدین کے ناموں تک سے واقف نہیں۔ اس بات کا احساس مختلف وقتوں میں حکومتوں کو بھی رہا، لیکن یہ احساس عملی پیش قدمی کی راہ ہموار نہ کر سکا۔ 23 فروری 1985 کو اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ جزیرۂ انڈمان گئے تو علامہ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ:

''نوجوان نسل کے استفادے کے لیے ایک ایسی جامع تاریخ تیار کی جانی چاہیے جو ان تمام سیاسی لیڈروں کے حالات زندگی پر مشتمل ہو جنھوں

نے انڈمان نیکوبار میں قید کی سزا کاٹی تھی۔ 1857 میں جن لوگوں کو
یہاں قید کر کے رکھا گیا ہے، ان سب کے نام معلوم نہیں ہیں، لیکن پہلی
جنگ آزادی کے سورما مولانا فضل حق خیر آبادی و مولوی لیاقت علی الہ
آبادی جیسے چند نام ایسے ہیں جن کی یاد لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ
رہے گی۔ ان کی پرزور حب الوطنی کے بے لوث جذبے تمام لوگوں
بالخصوص نوجوان نسل کو اس سے فیضان حاصل کرنا چاہیے۔"

(روزنامہ "قومی آواز" (لکھنؤ ایڈیشن) شمارہ:24 فروری 1985)

حکومتی سطح پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں ان کی قربانیوں کے فیضان کو عام کرنے اور نئی نسل کو ان سے واقف کرانے کے لیے تو کچھ نہیں کیا جاسکا، البتہ علامہ خیر آبادی کے پرپوتے مرحوم مولوی حکیم ظفر الحق خیر آبادی (ف: 11 ستمبر 1977) اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے مرحوم عین الحق انور خیر آبادی کی برسہا برس کی انتھک کوششوں سے خیر آباد میں ہی علامہ کے نام سے ایک چوک اور سڑک منسوب کی گئی۔ اس پختہ سڑک کا نام "مولانا فضل حق مارگ" ہے جو قصبہ خیر آباد سے نیشنل ہائی وے تک دو کلومیٹر لمبی ہے۔ "مولانا فضل حق مارگ" کا افتتاح 16 ستمبر 2000 کو صوبہ اتر پردیش کے گورنر سورج بھان نے کیا تھا۔

فضل حق چوک ہوتے ہوئے پروگرام کے مطابق ہم سلسلہ چشتیہ کی قدیم خانقاہ آستانہ حافظیہ پہنچے، جہاں بانی خانقاہ حضرت حافظ سید محمد علی شاہ (ف:1266ھ/1850) خلیفہ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی مدفون ہیں۔ آستانے کے صاحب سجادہ حضرت سید محمد فرقان میاں ہمارے منتظر تھے، ان سے ملاقات کے بعد ہم نے ظہر کی نماز ادا کی، پھر مولانا اسید الحق کی رہنمائی میں آستانے پر فاتحہ خوانی کی اور ماحضر تناول کیا۔ سید فرقان میاں ہمارے مقصد آمد سے واقف تھے، اس لیے ہماری خواہش پر علامہ فضل حق کے موجودہ وارثین میں سے کسی کو بلانے کے لیے خادم آستانہ کو بھیجا۔ کچھ دیر کے بعد تیس بتیس سال کے ایک جوان تشریف لائے، تعارف سے معلوم ہوا کہ یہ مولوی حکیم ظفر الحق کے حقیقی پوتے محمد نوح الحق ہیں۔ ان سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو خانوادۂ خیر آباد کے موجودہ حالات اور ان کے وارثین کے بارے میں معلومات ہوئی۔

علامہ فضل حق کے موجودہ وارثین: قصبہ خیر آباد میں تقریباً باون محلے آباد تھے، اب ان

میں سے کچھ محلوں کا وجود ختم ہو چکا ہے- ان محلوں میں ایک محلہ "میاں سرائے" ہے، جہاں علامہ فضل حق خیر آبادی کا خانوادہ شروع سے اب تک آباد ہے- علامہ نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی زوجہ بی بی وزیرن سے تین صاحبزادیاں، بی بی سعید النساء حرماں، بی بی نجم النساء، بی بی محمور النساء اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی تھے- مولانا عبدالحق نے بھی دو شادیاں کی تھیں، پہلی زوجہ سے ایک صاحبزادی بی بی عائشہ تھیں جبکہ دوسری زوجہ سے ایک صاحبزادے مولانا اسد الحق ہوئے- مولانا اسد الحق کی ایک صاحبزادی بی بی رقیہ اور دو صاحبزادے عزیز الحق اور مولوی حکیم ظفر الحق تھے- مولوی حکیم ظفر الحق نے تین شادیاں کیں، پہلی زوجہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، جب کہ دوسری اور تیسری زوجہ سے کثرت سے اولادیں ہوئیں- حکیم صاحب کی مؤخر الذکر دونوں زوجہ میں سے کسی ایک سے چھ صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے محمد صدر الحق (جن کی اولاد پاکستان میں ہے) اور محمد عین الحق انور خیر آبادی ہوئے، جن کا وصال 31 دسمبر 2005 میں خیر آباد میں ہوا- محمد عین الحق "مچھر- بٹھار اجکیہ ودھیالیہ" (ضلع سیتا پور کے ایک اسکول) میں ٹیچر تھے- علامہ کے موجودہ وارثین میں ان ہی کے تین صاحبزادے محمد نوح الحق، محمد معین الحق اور محمد سیف الحق اور ان کے دیگر اہل خانہ اس وقت محلہ میاں سرائے خیر آباد میں موجود ہیں- محمد نوح الحق نے بی اے، ایل ایل بی کیا ہے اور اپنے والد محمد عین الحق کے وصال کے بعد ان ہی کی جگہ مذکورہ اسکول میں ٹیچر ہو گئے ہیں، جب کہ ان کے دوسرے بھائی عین الحق تجارت سے وابستہ ہیں اور چھوٹے ابھی اسکول میں زیر تعلیم ہیں-

جہاں تک اس خانوادے کے موروثی علم وفضل کی بات ہے تو اب اس خاندان عالی شان میں ایسا کوئی نہیں رہا جو معقولات ومنقولات کی مسند آراستہ کر سکے اور مسلمانوں کی دینی، مذہبی اور ملی قیادت کر سکے- اس خانوادے کے نسلی امتیاز کے خاتمے کی جو بنیادی وجہ محققین اور مؤرخین نے بتائی ہے وہ ہے معاشی زبوں حالی- دراصل اس خاندان میں موروثی طور پر علم وفضل کے ساتھ امارت و ریاست بھی رہی، بادشاہان وقت، امرائے ریاست اور نوابین کی ہم نشینی، مختلف ادوار میں اعلیٰ مناصب پر تمکن اور علمی وفنی امتیازات نے اس خاندان کی شاہانہ سطوت کو مزید جلا بخشا- لیکن 1857 میں علامہ فضل حق خیر آبادی پر جرم بغاوت ثابت ہونے کے بعد ان کا عالی شان دیوان

خانہ محل سرا، متعدد دیہات، نادر کتب خانہ اور دیگر تمام املاک انگریزی حکومت نے ضبط کر لیے۔
ایک عرصۂ دراز کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی کی دلداری کے پیش نظر 16 فروری 1687 کو ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کے دستخط سے ''شمس العلما'' کا خطاب اور کچھ دیہات واپس ملے، لیکن مولانا عبدالحق اس وقت رامپور میں تھے، اس لیے خیرآباد کا ایک باشندہ یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا بن کر وہ دیہات اپنے قبضے میں کر لیے۔ مولانا عبدالحق کی نازک مزاجی، سیر چشمی اور مستغنی طبیعت نے عذرداری کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور خاموش رہے، یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد یار علی نے متعدد لوگوں کے ہاتھوں وہ تمام دیہات بیچ ڈالے۔ اس طرح اس خاندان کی معاشی تنگ دستی کا دور شروع ہوا۔ شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی کی وفات (23 شوال 1316ھ) کے بعد فرمانروائے رام پور نے ان کے صاحبزادے مولانا اسدالحق کو مدرسہ عالیہ رام پور کا پرنسپل مقرر کر دیا، لیکن اس عہدے پر فائز ہوئے آپ کو ایک سال ہی گزرا تھا کہ اپنے والد کی وفات کے ڈھائی سال بعد 7 ربیع الاول 1318ھ کو وصال فرما گئے اور بقول مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی ''مولانا اسدالحق کے ساتھ اس خاندان خیرآباد سے نسلی طور پر علم کا خاتمہ بھی ہو گیا۔'' (باغی ہندوستان، ص:331)

مولانا اسدالحق کے بعد ان کے صاحبزادے حکیم مولوی ظفرالحق نے اپنی توجہ فن طب کی طرف رکھی اور اپنے موروثی علم کو اہمیت نہیں دی اور ساری زندگی عسرت و تنگی میں گزار دی۔ ان کی زندگی میں سرکار نظام حیدرآباد سے پچاس روپے اور پرانے تعلق کی بنیاد پر ریاست رامپور سے تیس روپے ماہانہ آتے رہے، بعد میں یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔۔۔ حکیم صاحب کے صاحبزادے محمد عین الحق خیرآبادی نے اپنی مرتب کردہ ہندی کتاب ''پرتھم سوتنتر تا آندولن 1857'' میں ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر سید محمود ممبر آف پارلیمنٹ کی کوششوں سے 1981 میں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ماہانہ ایک سو پچاس روپے Political Sufferer pension جاری کیا، جس سے انھیں کچھ راحت ملی، آگے چل کر یہ بھی ختم ہو گیا۔ حکیم صاحب کی وفات (1977) کے بعد ایسا کوئی نہیں رہا جسے برائے نام ہی ''مولوی'' کہا جا سکے۔ اب علامہ فضل حق خیرآبادی کے موجودہ وارثین نعمت علم سے محروم معمولی نوکری اور تجارت پر گزر بسر کر رہے ہیں۔

مولانا فضل امام اور مولانا عبدالحق خیرآبادی کے مزارات پر: خانوادۂ خیرآباد کے مشاہیر علما تعلیم وتدریس اور ریاستی ومرکزی حکومتوں میں اعلیٰ مناصب کی وجہ سے بیشتر خیرآباد سے باہر رہے۔ تاہم ان لوگوں نے خیرآباد سے ہمیشہ اپنا وطنی تعلق باقی رکھا اور ان میں سے اکثر وصال کے بعد خیرآباد میں ہی دفن ہوئے۔ خانوادۂ خیرآباد کا کوئی آبائی قبرستان نہیں ہے اس لیے خیرآباد کی مختلف جگہوں پر اس خانوادے کے افراد آرام فرما ہیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے دادا مولانا ارشد ہرگامی خیرآباد کے ایک محلے میں مدفون ہیں جب کہ علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام اور صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی محلہ میاں سرائے میں حضرت مخدوم سعد کے مزار کے شمال مغربی گوشے میں دفن ہیں۔ اسی طرح خاندان کے دیگر افراد بھی مختلف حصوں میں آرام فرما ہیں۔ مشاہیر خانوادہ میں جو لوگ خیرآباد سے باہر دفن ہوئے ان میں علامہ فضل حق خیرآبادی اور علامہ کے پوتے مولانا اسدالحق خیرآبادی بطور خاص قابل ذکر ہیں، اول الذکر اسیر انڈمان ہو کر وہیں انتقال فرمائے اور وہیں سپرد خاک ہوئے جبکہ موخر الذکر کا وصال رامپور میں ہوا اور وہیں باغ مزار میاں خواجہ احمد میں ان کی آخری آرام گاہ بنی۔

خانوادۂ خیرآباد پر جب علمی، سیاسی اور معاشی زوال آیا تو ان کے علمی اور خاندانی آثار کی بھی حفاظت کا سامان نہ ہو سکا۔ 1975 میں نادم سیتاپوری جب ''فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون'' مؤلفہ حکیم سید محمود احمد برکاتی کا مقدمہ لکھ رہے تھے تو بڑے کرب کے ساتھ اپنی اس تشویش کا اظہار کیا تھا کہ:

> ''بہت سے افراد خاندان یہیں رہے اور آخری آرام گاہ تو بیشتر افراد خاندان کی خیرآباد ہی قرار پائی، یہ اور بات ہے کہ چند روز کے بعد خیرآباد میں کوئی یہ بتانے والا باقی نہ رہے گا کہ مولانا فضل امام خیرآبادی اور شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی کی قبریں بڑے مخدوم صاحب کے مزار کے شمال مغربی گوشے میں کہاں پر تھیں؟''
>
> (فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص:5)

اسی تشویش کا اظہار نادم سیتاپوری سے پہلے مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے بھی کیا تھا کہ:

''اب یہ قبریں شکستہ ہیں، ممکن ہے کچھ دنوں بعد آثار بھی باقی نہ رہیں۔ اس وقت بھی ان کے جاننے والے خال خال ہیں، کاش کوئی قدر دان علم بزرگ ان کے نام کے پتھر لگا کر ان فضلا کے آثار قبور کو مٹنے سے بچا لیتے۔''

(باغی ہندوستان، ص:141)

مذکورہ دونوں عبارتیں ہمارے ذہن میں تھیں اس لیے اس تشویش کے ساتھ کہ ان دونوں صاحبان علم وفضل کے مزارات کے نشانات شاید مل جائیں، آستانہ حافظیہ سے اجازت لے کر ہم مولانا فضل امام اور مولانا عبدالحق خیرآبادی کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے، لیکن یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ بڑے مخدوم صاحب کے مزار کے شمالی گوشے میں نہ صرف یہ کہ دونوں کی قبریں پختہ حالت میں موجود ہیں بلکہ ان پر کتبے بھی لگے ہوئے ہیں۔ ان کتبوں سے معلوم ہوا کہ ان قبروں کی مرمت علامہ کے پر پوتے مولوی حکیم ظفر الحق کے صاحبزادے محمد عین الحق خیرآبادی نے کروائی تھی اور انھوں نے ہی کتبہ بھی لگوایا تھا۔

علامہ فضل حق کی حویلی: مزارات پر کچھ دیر رکنے کے بعد ہم اس جگہ پر گئے جہاں کبھی ''نیا محل'' کے نام سے مشہور علامہ فضل حق خیرآبادی کا عالی شان محل سرا ہوا کرتا تھا۔ یہ جگہ بڑے مخدوم صاحب کے مزار سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر مغرب کی جانب ہے۔ یہ دیکھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا کہ جس جگہ کبھی سمرقند و بخارا کا علم آکر جمع ہو گیا تھا اور جہاں بیٹھ کر کبھی روم وشام، شیراز و اصفہان، ماوراء النہر اور ترکستان کے طالبان علم دولت علم ومعرفت سے سرفراز ہوا کرتے تھے وہاں اب گردش ایام کی وجہ سے خاک اڑ رہی تھی۔ ہند و پاک کے نامور مؤرخ سید رئیس احمد جعفری ندوی (1968/1912) نے اس محل سرا کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''خیرآباد میں مولانا (فضل حق) نے ایک نہایت شاندار اور رفیع المنزلت حویلی تعمیر کرائی تھی، یہ سنگ سرخ کی ایک مستحکم اور خوشنما عمارت تھی۔ بہت بڑا پھاٹک جس میں سے بیک وقت دو ہاتھی گزار سکتے تھے، آگے بڑھیے تو وسیع دالان، خوب صورت فوارہ، دائیں بائیں خوشنما برآمدے، سنگ مرمر کی ایک نہایت سبک اور نظر فریب بارہ دری۔ ان مرحلوں کو

طے کر کے آگے بڑھیے تو زنان خانہ اپنی وسعت اور کشادگی میں ایک چھوٹا سا محل اور پھر پائیں باغ۔ اس حویلی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک کسی امیر کبیر کا کرشک ہے اور بات بھی ایسی ہی تھی۔" (نام راج سے رام راج تک، ص:193/194، بحوالہ: ماہنامہ "العاقب" لاہور کا "مولانا فضل حق خیرآبادی و جنگ آزادی 1857 نمبر"، ص:322، جولائی تا ستمبر 2009)

آگے فرماتے ہیں:

"یہاں کے بام و در حکمت و معرفت کی صداؤں سے گونجا کرتے تھے۔ یہ صحن چمن گل کدہ نہ تھا بلکہ خیابان علم و فن تھا۔ یہ بارہ دری، یہ برآمدے، یہ کمرے، یہ ایوان، یہ دالان در دالان، یہ ڈیرے، جہاں اصحاب فضل و کمال کے قافلے اترا کرتے تھے۔ جہاں ارباب فن و ہنر سر کے بل حاضر ہوتے تھے۔ جہاں وقت کے امرا اور حکام سر جھکا کر آستاں بوسی کیا کرتے تھے۔ جہاں علم کا دریا لگتا تھا، حکمت کی گرہ کشائیاں ہوتی تھیں اور اجتہاد و تحقیق کے مرحلے طے ہوتے تھے۔" (مرجع سابق، ص:323)

معرکۂ ستاون میں علامہ فضل حق پر جرم بغاوت ثابت ہو جانے کے بعد انگریزی حکومت نے ان کی تمام جائداد و املاک، کتب خانہ اور یہ محل سرا ضبط کر لیا اور انگریزی سرکار سے نمک خواری کے صلے میں سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری کو دے دیا، انھوں نے رئیس کمال پور (ضلع سیتاپور) راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ یا سات ہزار کی معمولی قیمت پر فروخت کر دیا۔ عرصۂ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور ان کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اس حویلی کو اپنی جگہ پر باقی رکھا، لیکن بارش کی کثرت اور مکینوں کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ حویلی شکستہ ہو کر کھنڈر میں تبدیل ہونے لگی تو راجہ نے ایک انجینئر کو اس کی مرمت کے لیے بھیجا، اس نے تیس پینتیس ہزار روپے خرچ بتائے تو راجہ نے مجبوراً حویلی کے قیمتی پتھروں کو کھدوا کر کمال پور منگوا لیا اور کچھ سامان تعلق داران اودھ کے مشہور طبیب حکیم سید انور حسین خیرآبادی کو دے دیا اور وہاں صرف عالی شان سنگین دروازہ بطور

یادگار باقی رہنے دیا۔

علامہ پر سب سے پہلے 1985 میں پی ایچ ڈی کرنے والی خاتون ڈاکٹر قمر النساء نے اپنی عربی تھیسس کے مطبوعہ ایڈیشن میں اس دروازے کا عکس شائع کیا ہے۔ علامہ کے اولین سوانح نگار مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے ''باغی ہندوستان'' مطبوعہ 1947 میں لکھا تھا کہ:

> ''(یہ دروازہ) آج بھی صاحب مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔'' (باغی ہندوستان، ص:231)

لیکن مفتی سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی نے ''خیر آباد کی ایک جھلک'' مطبوعہ 1969 میں ذکر کیا ہے کہ

> ''آہ! علامہ فضل حق کے دولت کدہ کا وہ سنگین پھاٹک جو اپنے مکین کی عظمت کا مرثیہ خواں تھا، 1966 کی بارش نے اس کا نشان بھی مٹا دیا ہے۔''
> (خیر آباد کی ایک جھلک، ص:125)

جب حویلی کے پتھروں کو کھدوا کر راجہ سورج بخش سنگھ نے کمال پور منگوا لیا، پھر اس کے بعد اس شکستہ حویلی یا اس جگہ کا کوئی محافظ نہیں رہا، عرصہ دراز تک یہ جگہ یوں ہی پڑی رہی، یہاں تک کہ خیر آباد میونسپلٹی ریکارڈ کے مطابق 1884 میں خیر آباد میں میونسپلٹی قائم ہوگئی اور علامہ کی حویلی کی یہ جگہ ''نزول لینڈ'' ☆(Nazul Land) میں شامل ہوگئی اور انگریزی حکومت اس پر قابض ہوگئی۔ آزادی ہند کے بعد علامہ فضل حق کے پرپوتے مولوی حکیم ظفر الحق کو اپنی اس آبائی جگہ کی حکومت

☆وہ سرکاری زمین جو میونسپلٹی کے دائرے کے اندر آتی ہے یا جس پر میونسپلٹی کا قبضہ ہوتا ہے، وہ زمین یا تو ''نزول'' ہوگی یا میونسپلٹی نے اسے خریدا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ میونسپلٹی کے قبضے والی زمین نزول کہلائے گی جب تک یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ میونسپلٹی نے اسے خرید کر اس پر قبضہ کیا ہے۔

"Nazul land" means Government land situated within the area of a Municipality, land vested in or in possession of municipality must therefore be either (a) nazul or (b) acquired by purchase. The presumption is that the lend is nazul unless it can be shown that it has been acquired by purchase.

سے بازیافت کرانے کا خیال آیا اور انھوں نے مقدمہ دائر کردیا- اسی درمیان علامہ کے مسلکی مخالف ایک مولوی صاحب نے علامہ کی اس زمین سے متصل ایک جگہ خریدی اور رفتہ رفتہ علامہ کی زمین پر بھی قابض ہو گئے اور وہاں ایک مدرسہ بنام ''مدرسہ الجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم'' قائم کردیا- ادھر حکیم صاحب نے اپنی زمین کی بازیافت کے لیے جو مقدمہ دائر کیا تھا وہ جیت گئے، مگر چونکہ مذکورہ مولوی صاحب اس زمین پر قابض ہو چکے تھے اور حکیم ظفر الحق کے مقابلے میں اثرات اور وسائل کے اعتبار سے زیادہ مستحکم تھے، اس لیے مقدمہ جیتنے کے باوجود حکیم ظفر الحق کو وہ جگہ حاصل نہ ہو سکی- حکیم صاحب نے ایک بار پھر مقدمہ دائر کیا، لیکن خلاف واقعہ مولوی صاحب نے یہ دعویٰ کردیا کہ انھوں نے مذکورہ جگہ حکومت سے خریدی ہے- یہ مقدمہ اب تک عدالت میں زیر غور ہے اور بظاہر اس کی بازیافت کی امید بھی نظر نہیں آتی-

ان تفصیلات کو جان کر ہم نے ایک سرد آہ بھری، شکستہ دل اپنی گاڑی کی طرف لوٹے، خیرآباد کو الوداع کہا اور ''مولانا فضل حق مارگ'' سے ہوتے ہوئے لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئے-

□□□

ضمیمہ (۱)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ایک فتویٰ

جواب: از مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب-

شاہ صاحب عرفان مراتب سلمکم اللہ تعالیٰ - بعد از سلام مسنون الاسلام مکشوف خاطر عاطر باد کہ رقیمہ کریمہ وصول عزت شمول نمود آنچہ تردد بخاطر شریف از مذکور نوکری فرنگیان وقبول خدمت آنها از ایشان کہ درین مدرسہ از چند روز می شود لاحق گردید بوضوح انجامید بعض این خبر صحیح است وبعض ناصحیح، اصل حقیقت اینست کہ مولوی رعایت علی خان مختار کار فرنگی بسیار مستعد اند مکرر باین جانب نوشتند کہ شخصے را از علماء متدین کہ مرتشی نباشد واطلاع بر مسائل فقہ داشتہ باشد نزد این جانب باید فرستاد تا بندہ در ہر واقعہ وحادثہ بموجب روایات فقہ حکم می کردہ باشم ازین جانب نوشتہ شد کہ صاحب نوکر ومجبور فرنگیان اند مبادا آنہا تکلیف حکم نامشروع دہند تا این شخص را کہ بالفرستیم اختلاط صحبت فرنگیان ضرور افتد وموجب مداہنت در امور اسلام شود ایشان از ان طرف بتاکیدات تمام قطعی نمودند کہ اصلاً آن شخص را اختلاط فرنگیان نخواہد شد نہ آنرا تکلیف حکم نامشروع دادہ خواہد شد بلکہ در مکان جداگانہ در شہر بالاستقلال سکونت خواہند ورزید وآنچہ موافق شرع محمدی باشد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بے دغدغہ وبے وسواس حکم نماید بعد از ورود این قسم رقایم ایشان تامل وتفکر نمودہ شد کہ این قسم معاملہ با کفار کہ امداد در ترویج احکام شرعیہ باشد موافق شرع جائز است یا نہ حضرت حق عزوجل این

آیۃ درخاطر انداخت وقَالَ الْمَلِکُ ائْتُوْنِی بِهٖ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا کَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ-قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ - قال البیضاوی فیه دلیل علی جواز طلب التولیة واظهار انه مستعد لها والتولی من ید الکافر اذا علم انه لا سبیل الیٰ اقامة الحق و سیاسته الا بالاستظهار تعلق اہلست آنچہ تعلق بشریعت دارد واما آنچہ تعلق وطریقت دارد پس ترک وتجرید واختیار فقر وترک مکاسب در طریقت......می شود کہ باختیار خود التزام این ترک کردہ باشد وبدست شخصے عہد بستہ وتاوقتیکہ التزام این فقر وعہد برین از شخص بوقوع نیامدہ باشد باوجود تعلق بعلائق قیام بخدمات مشغولی باطن وذکر وفکر مراقبہ ومشاہدہ حاصل می شود بالجملہ کسب وتعلق رخصت است از محرمات طریقت نیست والا قضاۃ ودیگر اہل مکاسب را تلقین طریقت جائز نمی شد وحال آنکہ بسے ازین فرقہ اولیائے کبار گشتہ اند بمرتبہ کمال وتکمیل رسیدہ چہ جائے کسے کہ ہنوز مبتدی باشد آرے ترک وتجرید دریں طریقت عزیمت است ....باز غور کردہ شود کہ دریں از ہیچ محذوری از صحبت کفار ومداہنت در حدود اسلام یا موافقت بآنہا در رسوم کفر یا خوشامد آنہا ومبالغہ در کذب ودیگر مفاسد کہ مصاحبان اغنیا را بہم می رسد اصلا موجود نیست پس در اباحت آن در شریعت وطریقت ہیچ شبہ نماندہ مانند ایں کہ خلفا واصحاب مختارین واولیا را دیدہ وشنیدہ ایم کہ معلم گری وتعلیم اطفال یہودی کردند ومبشر بہ بشارات عمدہ بودند چہ جائے کسے کہ ہنوز دریں وادی قدمے نہ نہادہ وزمام اختیار خود را در دست ترک وتجرید ندادہ بنا برایں امور مرقومہ تجویز کردہ شد کہ مولوی عبدالحی صاحب از ینجا روند اگر مفاسد مظنونہ وموہومہ نباشد فبہا والا برخاستہ بیایند چون این قدر معلوم شد خاطر شریف را بدرجہ انزعاج نباید داد واین قدر اجمالاً ذہن نشین باید ساخت کہ ایں جانب ہم عمرے دریں مذکورات صرف کردہ واز آبا واجداد ہمیں وضع را دیدہ وشنیدہ یکا یک بے حجت شرعی وبے تجویز در باب طریقت حرکتے نا ملایم کہ دریں ہر دو راہ مستہجن ومستقبح باشد، ان شاء اللہ تعالیٰ نہ برائے خود ونہ غیر خود تجویز خواہد کرد، زیادہ چہ نویسد والسلام والاکرام۔

ترجمہ: جواب: ازمولانا شاہ عبدالعزیز صاحب۔

شاہ صاحب عرفان مراتب سلمکم اللہ تعالیٰ۔سلام مسنون کے بعد قلب معطر پر واضح ہو کہ

نامہ مبارک کہ عزت بخش ہوا اور فرنگیوں کی نوکری اور ان کے یہاں منصب فتویٰ قبول کرنے، جیسا کہ کچھ دنوں سے اس مدرسہ میں ہو رہا ہے، کے حوالے سے آپ کی طبیعت شریف میں جو تردد لاحق ہے، اس نے اسے واضح کیا ہے- اس واقعہ کا کچھ حصہ صحیح ہے اور کچھ غیر صحیح- اصل واقعہ یہ ہے کہ مولوی رعایت علی خاں جو فرنگیوں کے یہاں مختار کے منصب پر ہیں، بہت ہی مستعد شخص ہیں، انھوں نے مجھے بار بار لکھا کہ دین دار علما میں سے کوئی ایسا شخص جو رشوت خور نہ ہو اور فقہی مسائل کی معلومات رکھتا ہو، اس کو یہاں بھیجا جائے تا کہ ہر واقعہ اور کیس میں بندہ فقہی روایات کے مطابق حکم لگا سکے- اس طرف سے یہ لکھا گیا کہ جناب انگریزوں کے نوکر اور شخص مجبور ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں خلاف شرع فیصلہ دینا پڑے- کیونکہ یہ شخص جسے میں بھیجوں اسے فرنگیوں کی صحبت ضرور لاحق ہوگی اور یہ اسلامی امور میں مداہنت کا موجب ٹھہرے گا- آں موصوف نے ادھر سے مکمل زور دیتے ہوئے یہ لکھا کہ اس شخص کو فرنگیوں کی صحبت کا اتفاق بالکل ہی نہیں پڑے گا نہ انھیں خلاف شرع فیصلہ دینا ہوگا- بلکہ وہ شہر کے اندر ایک الگ مکان میں مستقلاً قیام پذیر رہیں گے اور جو کچھ شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق ہوگا بغیر کسی وغدغہ اور بغیر کسی وسوسے کے حکم سنا دیں گے- موصوف کے اس قسم کے خط کے آنے کے بعد غور وفکر کیا گیا کہ کفار کے ساتھ اس قسم کا معاملہ جو کہ احکام شرعیہ کی اشاعت میں معاون ہے، موافق شرع جائز ہے، بہ ایں طور کہ حق عز وجل نے اس آیت کو دل میں ڈال دیا-

وَقَالَ الْمَلِکُ ائْتُوْنِی بِہٖ اَسْتَخْلِصْہُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ- قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ- (یوسف:54,55)

(بادشاہ نے کہا یوسف کو میرے پاس لاؤ میں اسے اپنے لیے رہا کر دوں گا- تو جب یوسف نے بادشاہ سے گفتگو کی، بادشاہ نے کہا اب تم ہمارے یہاں مقیم وامین ہو- یوسف نے کہا: مجھے زمین کے خزانوں کا نگراں بنا دو، یقیناً میں محافظ اور ذی علم ہوں-)

بیضاوی نے کہا ہے کہ ''اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ منصب کو طلب کرنا اور اس امر کا اظہار کرنا کہ میں اس کے لیے اہل ہوں، جائز ہے- اسی طرح کافر کے ہاتھ سے کوئی منصب قبول کرنا بھی جائز ہے جب یہ معلوم ہو کہ اقامت حق اور سیاست حق اس کے بغیر ممکن نہیں-'' پ

مذکورہ آیت کے شریعت سے تعلق کا بیان تھا- رہا اس آیت کا طریقت سے تعلق تو ترک و تجرید، اختیار فقر اور ترک ذریعۂ معاش، طریقت میں درست ہے، کیونکہ اپنے اختیار سے اس ترک کا التزام کیا گیا ہے اور ایک شخص کے ہاتھ پر عہد لیا گیا ہے اور جب تک کہ اس فقر و عہد کا التزام کسی شخص سے وقوع پذیر نہ ہو، علائق دنیوی میں مشغولیت کے باوجود باطنی مشاغل، ذکر و فکر، مراقبہ و مشاہدہ حاصل ہوگا- بالجملہ کسب و تعلق رخصت ہے، محرمات طریقت سے نہیں ہے- ورنہ قاضی اور دیگر ارباب پیشہ کو طریقت کی تلقین جائز نہ ہوگی- جبکہ حال یہ ہے کہ اس طبقے سے بہت سارے اولیائے کبار ہوئے ہیں جو کمال و تکمیل کے مرحلوں تک پہنچے ہیں- چہ جائے کہ جو شخص اس راہ میں مبتدی ہو اس کے لیے اس طریقت میں ترک و تجرید عزیمت ٹھہرے-

پھر غور کیا جائے کہ اس معاملے میں کفار کی صحبت، کفری رسوم کی موافقت کے ذریعے اسلامی حدود میں مداہنت، یا ان کی خوشامد، اور جھوٹ اور دیگر مفاسد میں مبالغہ آرائی جو کہ اہل ثروت کے مصاحبین کرتے ہیں، اس طرح کی کوئی قباحت موجود نہیں ہے- پس شریعت و طریقت کی روشنی میں اس کی اباحت میں کوئی شبہ نہیں رہا- یہ اسی کے مثل ہے کہ خلفا اور اصحاب کرام اور اولیا کے بارے میں ہم نے سنا ہے کہ وہ یہود کے بچوں کی تعلیم و تربیت کیا کرتے تھے اور عمدہ بشارتوں کے سزاوار ٹھہرتے تھے- چہ جائے کہ ایسا شخص جو ہنوز اس وادی میں اپنا قدم نہیں رکھا ہے اور اپنے اختیار کے زمام کو ترک و تجرید کے حوالے نہیں کیا ہے-

محررہ امور کے پیش نظر تجویز کی گئی کہ مولوی عبدالحی صاحب یہاں سے جائیں، اگر مفاسد مظنونہ و موہومہ نہ ہوں تو فبہا ورنہ برطرف ہو جائیں- جب اس قدر معلوم ہو گیا تو طبع ناز کو حیران و پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے- اس قدر بات اجمالاً ذہن نشیں رکھی جائے کہ ان امور میں ہم نے اپنی عمریں گزاری ہیں اور اپنے آبا و اجداد سے اسی بات کو دیکھا اور سنا ہے- یکا یک بغیر حجت شرعی اور دلیل طریقت کے کوئی غیر مناسب اقدام جو ان دونوں راستوں میں قبیح اور قابل مذمت ہے، نہ اپنے لیے اور نہ کسی اور کے لیے جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے- زیادہ کیا لکھوں والسلام والاکرام- ☐☐☐

ضمیمہ (2)

علما کا تعارف ☆

مولانا مملوک العلی نانوتوی: نانوتہ ضلع سہارن پور میں تقریباً 1787 میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم نانوتہ میں ہی حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دہلی پہنچے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نامور تلمیذ مولانا رشید الدین خاں (ف: 1827/28) سے تمام علوم متداولہ حاصل کیے۔ مولانا مملوک نے تحصیل علم کے بعد دہلی میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب دہلی کا مشہور مدرسہ، مدرسہ غازی الدین 1825 میں "دہلی کالج" میں تبدیل ہو گیا تو پرنسپل کی حیثیت سے مسٹر جے ایچ ٹیلر اور صدر مدرس (عربی) کی حیثیت سے مولانا رشید الدین خاں کے ساتھ عربی کے نائب مدرس کی حیثیت سے پچاس روپے مشاہرہ پر مولانا مملوک کا بھی تقرر ہوا۔ تقرری کے دو سال کے بعد جب مولانا رشید الدین خاں کا وصال ہو گیا تو صدر مدرس کے عہدے پر مولانا مملوک العلی مقرر کر دیے گئے۔

☆ جن 40 علما کی فہرست صفحہ نمبر 101 پر دی گئی ہے، یہاں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے، جو اپنے اپنے عہد میں سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے۔ ان کے اس تعارفی احوال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صرف علامہ فضل حق خیر آبادی نے ہی سرکاری ملازمت نہیں کی، بلکہ کثیر تعداد میں ہر مسلک و مکتب فکر کے علما نے بھی انگریزی ملازمت قبول کی۔ لہٰذا سرکاری ملازمت کی بنیاد پر اگر علامہ خیر آبادی پر انگریز نوازی کا الزام عائد کیا جاتا ہے تو پھر اس جرم میں ان تمام علما کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔

مولانا ہمیشہ سرکار انگریزی کے منظور نظر رہے، چنانچہ 1842 میں جب انھوں نے حج کے لیے کالج سے ایک سال کی رخصت لی تو بقول ان کے فرزند مولانا یعقوب نانوتوی:

> ''(ایک سال کی رخصت کے ساتھ) سرکار نے براہ قدردانی آدھی تنخواہ بھی دی۔'' (مولانا محمد احسن نانوتوی، ص:175)

کالج میں ملازمت کے دوران وہ تمام انگریزی پرنسپلوں کے معتمد بھی رہے اور سرکار انگریزی کی طرف سے انعامات سے بھی نوازے گئے۔''دہلی کا آخری سانس'' اقتباسات از احسن الاخبار بمبئی 46-1844 کے حوالے سے پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

> ''دہلی کالج کے تمام انگریزی پرنسپلوں کے وہ معتمد رہے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک العلی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقعے پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک العلی کو انعام سے بھی نوازا۔'' (ایضاً، ص:176)

دہلی کالج میں تدریسی خدمات کے علاوہ اس کے مختلف شعبوں سے بھی مولانا وابستہ تھے۔ ادارہ تصنیف و تالیف کے رکن تھے، اس کے مطبع کے حصہ دار تھے اور ہفت روزہ اخبار ''قران السعدین'' کے مشیر و نگراں بھی تھے۔ دہلی کالج کے علاوہ مولانا نے اپنے گھر میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا ہوا تھا۔ مولانا کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، چند کے نام یہ ہیں: مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا محمد یعقوب نانوتوی (صاحبزادہ) مولانا قاسم نانوتوی، مولوی کریم الدین پانی پتی، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولوی ضیاء الدین ایل ایل ڈی۔

نور الحسن راشد کاندھلوی کے خیال کے مطابق مولانا مملوک العلی سید احمد رائے بریلوی سے بیعت و ارادت نیز ان کی تحریک سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔☆

☆ استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی، ص:192،193

11 ذی الحجہ 1267ھ/ 7 اکتوبر 1851 میں مولانا کا انتقال ہوا اور قبرستان مہندیان دہلی میں مدفون ہوئے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی: ابن حافظ لطف علی ابن حافظ حسن کی ولادت تقریباً 1241ھ/ 1825 میں ہوئی۔ حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم نانوتہ میں حاصل کی، پھر مولانا مملوک العلی نانوتوی کے پاس دہلی آگئے اور دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ مولانا مملوک کے علاوہ شاہ عبدالغنی مجددی، مولوی سبحان بخش شکار پوری اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے بھی مروجہ علوم حاصل کیے۔ مولانا محمد احسن جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو 1847 میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرس اول (فارسی) ان کا تقرر ہو گیا۔ 1850 میں بریلی اسکول جب بریلی کالج میں تبدیل ہوا تو شعبۂ فارسی کے صدر کی حیثیت سے مارچ 1851 میں مولانا کی تقرری ہوگئی اور مولانا بنارس سے بریلی منتقل ہو گئے۔ پھر جب اس کالج کے شعبۂ عربی کا افتتاح ہوا تو مولانا احسن اس شعبے کے بھی صدر بنا دیے گئے۔

10 مئی 1857 کو جب انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کا آغاز ہوا تو اس جنگ میں ہندوستان کے مختلف حصوں کے ساتھ روہیل کھنڈ بھی شامل ہو گیا۔ انگریزی حکام بہت خوف زدہ ہو گئے۔ اس موقعے پر مولانا محمد احسن نانوتوی نے انگریزی سرکار سے حق نمک ادا کیا۔ پروفیسر ایوب قادری ایک انگریز مؤرخ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''23 مئی کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

> ''اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کوتوال شہر شیخ بدرالدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔''
>
> (مولانا محمد احسن نانوتوی، ص: 50,51)

بریلی سے نکل کر مولانا اپنے آبائی وطن نانوتہ میں ایک سال مقیم رہے، جب حالات بہتر ہوئے تو جولائی 1857 میں بریلی پہنچے اور دوبارہ ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔

معرکۂ ستاون کے بعد مولانا احسن نے اپنے بھائی مولانا محمد منیر نانوتوی کی شراکت میں ''مطبع صدیقی'' قائم کیا، جس سے علوم اسلامی کی بہت سی کتابیں طبع اور شائع ہوئیں۔ 1867 میں مولانا نے فریضۂ حج ادا کیا۔ 1872 میں بریلی میں ایک درس گاہ بنام ''مدرسہ مصباح التہذیب'' قائم کی۔ 1877 میں بریلی کالج ناقابل برداشت مصارف کی وجہ سے بند کر دیا گیا تو مولانا احسن ترک سکونت کر کے نانوتہ آگئے اور تصنیف و تالیف اور ترجے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا کی حسب ذیل تصانیف ہیں:

تحفۃ المحسنین، اصول جر ثقیل، نافعہ خریداران، قواعد اردو حصہ چہارم، رسالہ عروض، زاد المخدرات، مفید الطالبین، مذاق العارفین، تہذیب الایمان، احسن المسائل، حمایت الاسلام، سلک مروارید، کشاف، نکات نماز ــــــ مولانا احسن نے جن کتابوں کی ترتیب و تہذیب کی وہ یہ ہیں: غایۃ الاوطار، حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفا، کنوز الحقائق، تحفہ الیمن، خیر متین، خلاصۃ الحساب، شفا قاضی عیاض، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، فتاویٰ عزیزی، جواہر القرآن۔ مولانا احسن نانوتوی کا انتقال 1312ھ/1895 میں دیوبند میں ہوا اور وہیں مولانا قاسم نانوتوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد مظہر نانوتوی: 1237ھ/1822-23 میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا مظہر مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہی حاصل کی، پھر مولانا مملوک العلی نانوتوی کی سرپرستی میں دہلی آگئے۔ دہلی کالج میں داخلہ لیا اور علاحدہ بھی متعدد درسی کتابیں مولانا مملوک سے پڑھیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی اکتساب علم کیا اور علم حدیث شاہ محمد اسحٰق اور شاہ عبد الغنی مجددی سے حاصل کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد 1260ھ/1844-45 میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور بنارس کالج کے مدرس اول مقرر کیے گئے۔ دو سال بنارس کالج میں رہنے کے بعد ایک سال کی رخصت لے کر حج کے لیے چلے گئے، لیکن حج کی ادائیگی میں دو سال لگ گئے، اس لیے واپسی پر بنارس کالج سے مستعفی ہو کر دہلی آگئے اور دہلی کی عدالت میں سررشتہ دار ہو گئے۔ لیکن کچھ دنوں کے

بعد یہاں سے سبک دوش ہوکر روڑکی میں ایک دوسری سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔اس ملازمت پر بھی کم ہی رہے، کیونکہ جلد ہی اجمیر کالج میں بحیثیت مدرس اول ان کا تقرر ہوگیا۔ انقلاب 1857 تک اجمیر کالج سے وابستہ رہے،اس کے بعد خراب حالات کے پیش نظر ملازمت ترک کر کے اپنے وطن آ گئے۔

قیام وطن کے دوران قصبہ شاملی میں کچھ شرپسند عناصر سے حافظ ضامن،مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کے ساتھ مولانا مظہر اوران کے کچھ ساتھیوں کی جھڑپ ہوئی اور مولانا کے پیر میں گولی لگ گئی۔اس جھڑپ کی وجہ سے شرپسندوں نے سرکار انگریزی کو مولانا مظہر اوران کے ساتھیوں کے تعلق سے باغی بتا کر بدگمان کرنا چاہا،جس کی وجہ سے وہ کچھ دنوں تک روپوش رہے،مگر جلد ہی انگریزی حکومت کو اس سازش کا پتا چل گیا اوراس کی بدگمانی دور ہوگئی۔جیسا کہ ''تذکرۃ الرشید'' میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا مظہر منشی نول کشور کے پریس میں 'مصحح' کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ یہاں کی ملازمت کے بعد 1283ھ/1867 میں ''مدرسہ مظاہر العلوم'' دیوبند میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔مولانا کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔مولانا خلیل احمد انبیٹھوی اور مولانا قاسم نانوتوی کا شمار آپ کے خصوصی تلامذہ میں ہوتا ہے۔

مولانا نے تین حج کیے، پہلا 1848 میں، دوسرا 1860 اور تیسرا 1877 میں۔اجمیر کالج کی ملازمت کے دوران ''موطا امام مالک'' کا حاشیہ بھی لکھا۔2 ذی الحجہ 1302ھ/3 اکتوبر 1885 کو سہارن پور میں انتقال ہوا اور قبرستان حاجی شاہ کمال میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد منیر نانوتوی: 1831 میں پیدا ہوئے۔مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد شیخ لطف علی سے حاصل کی، پھر دہلی آ گئے اور دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔مولانا مملوک العلی کے ساتھ مفتی صدر الدین آزردہ اور شاہ عبدالغنی مجددی سے بھی استفادہ کیا۔مئی 1861 میں بریلی کالج میں سرکاری ملازم ہو گئے۔قیام بریلی کے دوران اپنے بڑے بھائی مولانا احسن کے شریک و معاون رہے۔خصوصاً مولانا احسن کے 'مطبع صدیقی' کو بحیثیت مہتمم مولانا منیر ہی سنبھالتے تھے۔

1877 میں جب بریلی کالج بند کر دیا گیا تو بریلی سے ترک سکونت کر لیا۔

مولانا قاسم نانوتوی سے مولانا کے گہرے روابط تھے اور دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ مولانا منیر 12-1311ھ/95-1893 میں تقریباً دو برسوں تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ مولانا نے امام غزالی کی کتاب "منہاج العابدین" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا، جو "سراج السالکین" کے نام سے مطبع صدیقی بریلی سے 1281ھ/ 1864 میں شائع ہوا۔

مولانا کے تذکرہ نگاروں کو ان کا سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا، البتہ سبھوں کا اتفاق ہے کہ مولانا 1321ھ/ 1904 تک باحیات تھے۔

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی: ابن شیخ فتح علی عثمانی دیوبند ضلع سہارن پور میں 1237ھ/ 22-1821 میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں ابتدائی تعلیم پائی، پھر دہلی آگئے اور دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی کے خاص شاگرد تھے۔ دہلی میں دوران قیام مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی استفادہ کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد 50-1849 میں بریلی کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ کئی سال تک اس سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے۔ یہاں سے ترقی پا کر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع میرٹھ ہوئے اور اسی ملازمت سے پنشن ہوئی۔

سرکاری ملازمت سے سبک دوشی کے بعد دیوبند میں فروکش رہے۔ وہاں سرکار انگریزی نے مولانا کو دیوبند کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام میں مولانا کی کوششیں بھی شامل رہیں اور 40 سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ مولانا دیوبندی کے دینی و فکری نظریات کو ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمود الحسن دیوبندی نے فروغ دیا۔

مولانا ذوالفقار علی نے متعدد شروحات بھی لکھیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے: دیوان حماسہ کی شرح "تسہیل الدراسۃ" دیوان متنبی کی شرح "تسہیل البیان" سبع معلقات کی شرح "التعلیقات" قصیدۂ بانت سعاد کی شرح "الارشاد الی بانت سعاد" اور قصیدۂ بردہ کی شرح "عطر الوردہ"۔ ان کے علاوہ اردو زبان میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔ مولانا کا انتقال 1322ھ/ 1904 میں دیوبند میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی: ابن شیخ عبدالرحیم دیوبندی۔ دہلی کالج میں مولانا مملوک

العلی نانوتوی سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر بجنور، پیلی بھیت اور سہارن پور میں رہے۔ جنگ آزادی 1857 میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے بریلی میں تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔ زندگی کے آخری لمحات تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن اور دست وبازو رہے۔ مولانا دیوبندی کے صاحبزادوں میں مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (مفتی: دارالعلوم دیوبند) مولانا حبیب الرحمٰن (مہتمم: دارالعلوم دیوبند) مولانا شبیر احمد عثمانی (سرپرست: دارالعلوم دیوبند) معروف ہوئے۔ 12 جمادی الاولیٰ 1325ھ/ 15 جون 1907 کو مولانا کا انتقال ہوا۔

مولوی عبدالحی بڈھانوی: ابن شیخ ہبۃ اللہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے داماد تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس میں مشغول رہے۔ پھر میرٹھ کی عدالت میں بحیثیت مفتی مقرر ہوئے، اس سرکاری ملازمت کی اجازت شاہ عبدالعزیز نے دی تھی۔ سید احمد رائے بریلوی کے مرید اور خلیفۂ خاص تھے، ان کے تذکرہ نگاروں کے بقول: سید صاحب سے غلو کی حد تک ارادت رکھتے تھے۔ سید احمد رائے بریلوی سے بیعت کے بعد گھر بار چھوڑ دیا اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد کے سپہ سالار، معاون اور ترجمان بن کر اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے ذکر کیا ہے کہ: "ہندوستان میں حضرت سید صاحب کی دعوت تجدید و جہاد کے ساتھ ساتھ اتباع سنت اور عمل بالحدیث (ترک تقلید) کا چرچا بھی شروع ہوا۔" ☆ اس کے بعد ہی ہندوستان میں مختلف فرقوں کا ظہور ہوا۔

1233ھ/ 18-1817 میں شاہ اسماعیل کے ساتھ سید احمد رائے بریلوی کے ملفوظات کا مجموعہ "صراط مستقیم" مرتب کیا۔ سید صاحب کے ساتھ شوال 1238ھ/ جولائی 1821 میں حج کیا۔ اسی سفر میں قاضی شوکانی سے مکاتبتاً حدیث کی سند لی۔ جب سید احمد رائے بریلوی سکھوں سے جہاد کے لیے سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو کچھ عرصے کے بعد مولوی عبدالحی بھی جہاد کے ارادے سے سرحد پہنچ گئے اور وہاں پنجتار کے مقام پر بوامیر کے عارضے میں 8 شعبان 1243ھ 24 فروری

☆ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ص: 20

1828 کو انتقال ہوا۔

مولوی امیر احمد سہسوانی: ابن مولوی سید امیر حسن سہسوانی 1262ھ/1845 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی وفارسی کی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، پھر مولوی قلندر علی سے استفادہ کیا، اس کے بعد دہلی میں میاں نذیر حسین دہلوی سے علم حدیث وتفسیر پڑھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی، لکھنؤ، آنولہ، بریلی اور بدایوں میں رہے۔ آگرہ میں ایک عرصے تک سرکاری ملازم رہے اور حکومت انگلشیہ سے وفاداری کے صلے میں ''شمس العلما'' کے خطاب سے نوازے گئے۔ مولوی امیر احمد سہسوانی اور ان کے والد نے ہندوستان میں فرقہ ''اہل حدیث'' کی نمائندگی کی اور تقلید ائمہ اربعہ کی مخالفت میں بہت کچھ لکھا۔ اسی سلسلے کی ایک معروف کتاب ''انتصار الحق'' از مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری کے جواب میں مولوی امیر احمد کے والد مولوی امیر حسن نے ''براہین اثنا عشر'' لکھی۔ ☆ 1306ھ/89-1888 میں مولوی امیر احمد سہسوانی کا بدایوں میں انتقال ہوا۔

مولانا نورالحسن کاندھلوی: ابن مولانا ابوالحسن ابن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی 26 ربیع الثانی 1227ھ/8 مئی 1812 کو پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی درسی کتابیں اپنے والد اور دادا سے پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی بھیج دیے گئے۔ وہاں دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر معقولات کی تحصیل علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ سے کی، جبکہ علم حدیث شاہ اسحٰق دہلوی سے پڑھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ہی آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ چار سال کے بعد اس ملازمت سے استعفاد دے دیا۔ 1262ھ/1846 کو کوڑ میں قائم مقام تحصیل دار مقرر ہوئے اور دو سال کے بعد تحصیل دار ہو گئے۔ 1267ھ/1851 میں اس ملازمت کو بھی خیر باد کہا۔ پھر مہاراجہ الور کی طلبی پر الور چلے گئے۔ یہاں سرکاری منصب کے ساتھ تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ مولانا کے تلامذہ میں چند نام یہ ہیں: مفتی ریاض الدین کاکوروی، مولانا عبداللہ بلگرامی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا محمد احسن مرادآبادی، مولانا سید محمد تقی نصیرآبادی وغیرہ۔ مولانا کی چند تالیفات کا ذکر بھی ملتا ہے، جو یہ ہیں: حاشیہ ہدایہ اولین، تاریخ ریاست الور، رسالہ

☆ الحیاۃ بعد المماۃ، ص: 295

فرائض۔ 11 محرم 1285ھ/ 4 مئی 1868 کو کاندھلہ میں آپ نے وفات پائی۔

مولوی عبدالاحد: ابن غلام محمد بنارسی (مالک: مطبع مجتبائی، دہلی) 1850 میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ مولانا احسن نانوتوی کے قیام بنارس کے زمانے میں مولوی عبدالاحد کے والد غلام محمد بنارسی سے ان کا قریبی تعلق ہو گیا، جب مولوی عبدالاحد چھوٹے ہی تھے تو غلام محمد بنارسی کا انتقال ہو گیا۔ مولانا احسن نانوتوی نے ان کی بیوہ سے نکاح کر لیا اور ان کے لڑکے (جن کا نام مولانا نے عبدالاحد رکھا) اور لڑکی کے کفیل و سرپرست بن گئے۔ مولوی عبدالاحد کی تمام تعلیم و تربیت مولانا احسن نانوتوی نے کی۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد مولوی عبدالاحد نے 1889 میں بریلی کالج سے انٹر پاس کیا اور 1870 میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ 1875 میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اسی سال انبالہ میں ''رسالہ نمبر 15 بنگال'' کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ پھر 1884 میں ملازمت ترک کر کے میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔

1886 میں مولوی عبدالاحد نے منشی ممتاز علی سے ''مطبع مجتبائی'' پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ پہلے یہ ایک معمولی مطبع تھا، لیکن مولوی عبدالاحد نے اسے خوب ترقی دی۔ یہی مطبع مولوی صاحب کی شہرت و دولت کا سبب بنا۔ اس مطبع سے اردو، عربی اور فارسی کی سیکڑوں کتابیں طبع اور شائع ہوئیں۔ بہت سے علما اس مطبع سے وابستہ رہے، جو اس میں تصحیح، تصنیف و تالیف، ترجمے اور حواشی کا کام کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم 15-1914 میں مولوی عبدالاحد نے حکومت برطانیہ کے لیے اپنی گراں قدر خدمات پیش کیں اور وار فنڈ (War fund) میں دل کھول کر چندہ دیا اور جنگ میں تقریباً تین لاکھ روپے قرض بھی دیے۔ انھوں نے سٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی سرکار انگریزی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلے میں سرکار انگریزی نے مولوی عبدالاحد کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ 2 دسمبر 1920 کو مولوی صاحب کا انتقال ہوا اور مہندیان دہلی میں تدفین ہوئی۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی: ضلع بجنور کے ایک موضع میں 1830 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور متوسط درسیات مولانا نصراللہ خویشگی سے پڑھیں۔ 1842 میں دہلی

چلے گئے اور مولانا عبدالخالق دہلوی سے پڑھتے رہے-1846 میں دہلی کالج میں داخلہ لے لیا-1853 میں دہلی کالج سے فراغت کے بعد ضلع گجرات (موجودہ مغربی پنجاب، پاکستان) میں بحیثیت استاذ سرکاری ملازمت مل گئی-1856 میں کان پور میں ڈپٹی انسپکٹر شعبۂ تعلیم مقرر ہوئے-معرکۂ ستاون برپا ہوا تو ملازمت چھوڑ کر دہلی آگئے اور ستاون کی تحریک سے الگ رہے-بلکہ انگریزوں کا ساتھ دیا، اس صلے میں ان کے خاندان کے دیگر افراد کی جاں بخشی ہوئی اور الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر کا عہدہ بھی ملا-1860-61 میں تعزیرات ہند کے اردو ترجمے کی تین رکنی کمیٹی میں شامل کیے گئے اور سب سے بہتر مترجم کی حیثیت سے گورنر نے خصوصی انعام سے نوازا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر ترقی دی-اس کے بعد بھی گورنمنٹ میں مختلف جگہوں میں مختلف عہدوں پر رہے-1883 تک ملازمت میں رہنے کے بعد دہلی آگئے اور درس، نیز تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے-

ڈپٹی نذیر احمد کے تلامذہ اور دینی و ادبی تصانیف کی تعداد کافی ہے-اپنی ادبی تحریروں کی وجہ سے اردو ادب کے اہم ستون قرار دیے گئے-1895 میں ترجمہ قرآن مکمل کیا-دیگر تصانیف میں: الحقوق والفرائض، ادعیۃ القرآن، الاجتہاد، امہات الامہ، مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات، ابن الوقت ایامٰی وغیرہ اہم ہیں-1912 میں انتقال ہوا-

قاضی نجم الدین کاکوروی: قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین علی خاں بہادر اشرف جنگ ابن ملا حمید الدین محدث کی ولادت 15 ربیع الاول 1157ھ/ 28 اپریل 1744 میں ہوئی، ثاقب تخلص تھا، اسی نسبت سے "نجم ثاقب" مادۂ سال ولادت ہے-کاکوری کے مشہور علوی خانوادے سے آپ کا تعلق تھا-ابتدائی تعلیم و تربیت والد ماجد نے کی، پھر جملہ علوم متداولہ ملا حسن فرنگی محلی اور مولوی غلام یحییٰ بہاری سے حاصل کیا-تمام علوم وفنون میں ماہر ویگانہ تھے، لیکن علم جفر و رمل میں درجۂ اختصاص حاصل تھا-

تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے-1205ھ/1790 میں سرکار انگریزی نے آپ کے علمی فضائل و کمالات کی بنا پر آپ کو کلکتے کا پہلا "قاضی القضاۃ" مقرر کیا-اس طرح قاضی نجم الدین کلکتہ آگئے اور وہاں بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے-"تذکرۂ

مشائخ کاکوری' میں ذکر ہے:

''کابل سے لے کر دربار دکھن تک اور ہندوستان کے ہر صوبے الہ آباد
و اکبرآباد و اودھ و اڑیسہ ڈھاکہ و بنگال و بہار وغیرہ میں انہی کے فتوے پر
مسلمانوں کے قضایا فیصل ہوتے۔'' (ص:433)

25 سال تک قاضی القضاۃ کے عہدے سے وابستہ رہے اور اپنے منصبی فریضے کو بخوبی نبھایا،
جس کے صلے میں اعزاز و خطاب سے نوازے گئے اور پوری تنخواہ بطور پنشن ملنا منظور ہوئی، یہاں
تک کہ ان کی وفات کے بعد ان کی پنشن ان کے ورثا کو ملنا طے پایا۔ آپ کے تلامذہ میں نہ صرف
ہندوستان کے علما تھے، بلکہ بعض اعلیٰ عہدے دار انگریز بھی تھے۔ اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ
متعدد تصانیف بھی بطور یادگار آپ نے چھوڑی ہیں۔ مثلاً رسالۂ ستہ جبریہ منظوم، رسالہ در بیان
تناسب اعضائے انسانی، رسالہ در بیان سعد و نحس، شرح اخلاق جلالی، نسب نامہ اور کشکول۔ آپ
کا سب سے اہم تحریری کام فتاویٰ عالم گیری میں درج ''کتاب الجنایات والجرائم'' کی شرح ہے،
جسے آپ نے گورنر جنرل بہادر کے حکم سے لکھا۔ تمام انگریزی عدالتوں میں جو بھی فیصلے ہوتے،
اسی شرح کے حوالے سے ہوتے۔ یہ شرح انگریزی سرکار کے حکم سے کلکتے سے شائع بھی ہوئی۔

بحالت علالت وطن واپس آرہے تھے کہ بنارس میں 13 ربیع الاول 1229ھ/6 مارچ 1814
میں وفات پائی اور وہیں باغ فاطمان میں دفن ہوئے۔

مولانا فضل امام خیرآبادی: ابن شیخ محمد ارشد ہرگامی کا وطن خیرآباد تھا۔ مولانا سید عبدالواجد
کرمانی سے اکتساب علم و فن کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی آ گئے۔ سرکار انگریزی کی طرف
سے دہلی کے سب سے پہلی مفتی، پھر صدر الصدور مقرر کیے گئے۔ سرکاری مناصب کے علاوہ آپ
نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

سرسید احمد خاں نے لکھا ہے کہ:

''علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان
کی زبان دانی سے افتخار۔ اگر ان کا ذہن رسا دلائل قاطعہ بیان نہ کرتا،
فلسفے کو معقول نہ کہتے اور اگر ان کا فکر صائب براہین ساطعہ قائم نہ کرتا،

اشکال ہندسی تار عنکبوت سے سست تر نظر میں آتی-اس نواح میں ترویج علم وحکمت ومعقول کی اسی خاندان سے ہوئی-''

(آثار الصنادید، دوم، ص:88-87)

آپ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ شہرت علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ کو ملی-سرکاری مناصب اور تدریسی مصروفیات کے باوجود آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں-علم منطق میں آپ کی کتاب ''مرقاۃ'' سب سے زیادہ معروف ہے، جو آج تک مدارس کے نصاب میں شامل ہے-اس کے علاوہ تلخیص الشفا، نخبۃ السر، آمد نامہ، تشحیذ الاذہان شرح میزان المنطق اور خلاصۃ التواریخ تصنیف کی-میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال اور افق المبین پر فاضلانہ حواشی لکھے-

5 ذی قعدہ 1244ھ/1829 میں خیر آباد میں آپ کا وصال ہوا اور درگاہ مخدوم شیخ سعد الدین کے احاطے میں مدفون ہوئے-مرزا غالبؔ نے تاریخ وصال کہی:

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل	کرد سوئے جنت الماوئی خرام
چوں ارادت از پئے کسب شرف	جست سال فوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خراشیدم نخست	تا بناء تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر ''سایۂ لطف نبی''	باد آرامش گہ فضل امام

مفتی صدر الدین آزردہ: ابن شیخ لطف اللہ کشمیری 1204ھ/1789 میں دہلی میں پیدا ہوئے-آباواجداد کا تعلق کشمیر سے تھا-شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے علوم نقلیہ اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے علوم عقلیہ کی تحصیل کی-آپ اپنے زمانے میں بڑے صاحب حشمت و وجاہت اور یگانۂ روزگار تھے-سرسید احمد خاں نے آپ کو ''اکمل کملائے روزگار، افضل فضلائے ہر دیار، حاکم محاکم جاہ و جلال، ہتکی ارایک اقبال، کلید دروازۂ علم'' ☆ کے القاب سے یاد کیا ہے-

مفتی آزردہ کے شاگرد مولوی فقیر محمد جہلمی نے ذکر کیا ہے:

☆ آثار الصنادید، جلد: دوم، ص:56

''ریاست درس وتدریس خصوصاً افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحان مدارس وصدارت حکومت دیوانی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہ، دہلی کے تمام اعیان واکابر، علماوفضلا خاص دہلی اوراس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔'' (حدائق الحنفیہ، ص: 481)

علامہ فضل حق خیرآبادی کے ہم درس اور رفیق خاص تھے۔ غالب، مومن اور شیفتہ جیسے نامور اساتذۂ فن آپ کے حلقۂ احباب میں تھے۔ مفتی آزردہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاہ نصیر اور میر ممنون سے تلمذ تھا۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے بھی خصوصی مراسم تھے اور دربار میں انھیں خصوصی اعتبار حاصل تھا۔ اسی مقام کے پیش نظر مفتی آزردہ کے منصب کو بادشاہ کے خزانے سے دو روپے آٹھ آنے ملتے تھے۔ مولانا فضل امام خیرآبادی کے وصال کے بعد عدالت دہلی کے صدر الصدور ہوئے۔ انگریزی سرکار میں بھی آپ کی بڑی عزت تھی۔ جب جنرل آکٹرلونی راجپوتانے کا رزیڈنٹ مقرر ہوا تو مفتی آزردہ اس کے ہمراہ رہے، چار سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ آکٹرلونی مفتی آزردہ پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ سرکاری منصب کے ساتھ طلبہ کو گھر پر درس بھی دیتے تھے۔ مدرسہ دارالبقا (جو جامع مسجد دہلی کے نیچے تھا) کو جب مفتی آزردہ نے از سر نو جاری کیا تو اس کے طلبہ کے جملہ مصارف کے کفیل وسرپرست بن گئے۔ آپ کے سیکڑوں تلامذہ میں سرسید احمد خاں، نواب یوسف خاں والی رام پور، نواب صدیق حسن قنوجی، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا فقیر محمد جہلمی بھی تھے۔ مفتی آزردہ نے جنگ آزادی 1857 میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیا، جس کی وجہ سے گرفتاری، منصب سے برخواستگی اور ضبطی جائداد کی نوبت پہنچی۔ کچھ مہینوں بعد رہائی ہوئی اور آدھی جائداد واگزاشت ہوگئی۔ تقریباً تین لاکھ روپے کی مالیت کا ذاتی کتب خانہ بھی ضبط ہوگیا تھا، جو واپس نہ مل سکا۔ کثرت درس اور مختلف مناصب کی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کم رہی۔ رسالہ ''منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال''، ''درالمنضود فی حکم مرأۃ المفقود'' اور ہزاروں فتاوے آپ کی یادگار ہیں۔ آخر عمر میں تقریباً دو سال فالج کے مرض میں مبتلا رہے اور 61 سال کی عمر میں 24 ربیع الاول 1285ھ/15 جولائی 1868 میں وفات پائی اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ شمس الشعرا مولوی ظہور علی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔ ''چراغ دو جہاں بود''

مادۂ تاریخ ہے۔

مولانا امام بخش صہبائی: ابن مولانا محمد بخش تھانیسری، ہندوستان میں فارسی کے مسلم الثبوت اور بلند پایہ استاذ تھے۔والد ماجد نے تھانیسر کو خیر باد کہا اور دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ والد کی طرف سے سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔مولانا صہبائی نے جملہ فارسی و عربی علوم مولانا عبداللہ خاں علوی سے حاصل کیے اور کم عمری سے ہی فارسی میں فکرِ سخن کرنے لگے۔مولانا کے احباب میں علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، حکیم مومن خاں مومن، مرزا غالب اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے۔غالبؔ نے جہاں اپنے معاصرین کا ذکر کیا ہے، وہاں صہبائی کو بھی نہیں بھولے، کہتے ہیں:

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ　　　حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاہ

1842 میں دہلی کالج میں 40روپے مشاہرہ پر بحیثیت فارسی استاذ مقرر ہوئے۔کچھ عرصے کے بعد صدر مدرس فارسی کے عہدے پر پہنچ گئے۔مولانا فارسی کے باکمال شاعر بھی تھے، اس حیثیت سے قلعہ معلّی کے مشاعروں میں بھی بلائے جاتے۔مولانا نے درس و تدریس اور شعر و سخن کے علاوہ تصنیف و تالیف پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔مفتی انتظام اللہ شہابی کے بقول: ''فارسی میں کثرت سے کتابیں لکھیں، اردو کی کتابوں کی ملک میں مانگ دن بدن بڑھ رہی تھی اور قدر بھی ہونے لگی تو اس کی طرف بھی توجہ کی۔'' ☆

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے کہ'ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔'' ☆☆ سرسید احمد خاں نے ''آثار الصنادید'' کی ترتیب میں بھی صہبائی سے مدد لی تھی، جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے اور اپنی کتاب میں ان کا بڑا تفصیلی اور والہانہ ذکر بھی کیا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ صہبائی'' کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔'' ☆☆☆

مولانا صہبائی نے 1857 کی جنگ میں حصہ لیا۔انگریزی فوج کی گولی کا نشانہ بنے اور وطن پر شہید ہو گئے۔

☆ غدر کے چند علما، ص:7　　☆☆ مرحوم دہلی کالج، ص:162　　☆☆☆ یادگار غالب، ص:23

قاضی امام الدین کاکوروی: ابن ملاحمید الدین محدث 9 شوال 1166ھ/9 اگست 1753 میں ولادت پائی۔ جملہ علوم متداولہ کی تعلیم اپنے والد ماجد، بڑے بھائی قاضی نجم الدین کاکوروی، بحرالعلوم ملا عبدالعلی فرنگی محلی، مولانا عبدالواجد خیرآبادی، ملا محمد اعلم سندیلی اور مولوی حیدر علی سندیلی سے پائی۔ علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ علمی قابلیت کی بنیاد پر جلد ہی بنارس میں قاضی مقرر کر دیے گئے، اس کے بعد پٹنہ میں پورے صوبۂ بہار کے قاضی مقرر ہوئے۔ اپنی عمدہ کارکردگی کی وجہ سے اکرام وخطاب سے بھی سرفراز کیے گئے۔ 18 جمادی الاولی 1239ھ/20 جنوری 1824 کو وفات پائی اور قصبہ کاکوری مولوی محلہ، حظیرۂ ملاغوث میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی: ابن منشی محمد بخش ابن منشی غلام محمد، قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں 9 شوال 1228ھ/ 14 اکتوبر 1813 میں پیدا ہوئے۔ آپ قریشی النسل تھے۔ آپ کے دادا منشی غلام محمد کی سسرال کاکوری میں تھی، اس لیے آپ کے والد نے ننہالی تعلق کی بنا پر کاکوری میں سکونت اختیار کر لی۔ مفتی عنایت احمد نے ابتدائی تعلیم کاکوری میں حاصل کی، جب 13 سال کے ہوگئے تو تحصیل علم کی غرض سے رام پور چلے گئے، وہاں سید محمد بریلوی سے صرف ونحو، مولوی حیدر علی ٹونکی اور مولوی نورالاسلام سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر رام پور سے دہلی آگئے اور شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی سے کتب حدیث سبقاً سبقاً پڑھیں اور سند حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی سے علی گڑھ چلے گئے اور مولانا بزرگ علی مارہروی (تلمیذ شاہ عبدالعزیز وشاہ رفیع الدین) سے اکتساب علوم عقلیہ ونقلیہ کیا اور فراغت پائی۔

فراغت کے بعد اسی مدرسے میں مدرس ہوگئے۔ ایک سال کے بعد مفتی صاحب کا تقرر بحیثیت مفتی ومنصف علی گڑھ میں ہوگیا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا حسین شاہ بخاری اسی زمانے میں آپ سے پڑھ رہے تھے۔ کچھ وقت کے بعد مفتی عنایت احمد کاکوروی کا تبادلہ علی گڑھ سے بریلی ہوگیا، وہاں آپ منصف اور صدر امین مقرر کیے گئے۔

1857 میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا، نواب بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں روہیل کھنڈ میں علم جہاد بلند کیا تو مفتی عنایت نے بھی اس میں سرگرم حصہ لیا۔ جنگ کی ناکامی کے

بعد اسی جرم کی پاداش میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی- جزیرۂ انڈمان میں قید و بند کے دوران درس اور تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا- اسی زمانے میں علم صرف کی معروف کتاب ''علم الصیغہ'' اور سیرت پر ''تواریخ حبیب اللہ'' لکھی- ایک انگریز کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کا ترجمہ دو سال میں مکمل کیا اور یہی کام ان کی رہائی کا سبب بنا- 1277ھ/ 61-1860 میں رہائی پا کر کاکوری آئے اور پھر کان پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی، وہاں ایک تاریخی ادارہ بنام ''مدرسہ فیض عام'' قائم کیا- یہ وہی ادارہ تھا جہاں سے ''ندوۃ العلما'' کے قیام کی تحریک کا آغاز ہوا- دو سال کے بعد اپنے تلامذہ مولانا سید حسین بخاری کو مدرسے کا مدرس اول اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو مدرس ثانی مقرر کر کے حج کے لیے روانہ ہو گئے- جدہ کے قریب 7 شوال 1279ھ/ 27 مارچ 1863 کو مفتی عنایت احمد کاکوروی کا جہاز پہاڑ سے ٹکرا کر ڈوب گیا اور مفتی صاحب غریق و شہید ہو گئے-

سرکاری مناصب سے وابستہ رہنے کے باوجود آپ نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ کبھی ترک نہیں کیا، چنانچہ آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ہے- یوں ہی مذکورہ تصانیف کے علاوہ بھی آپ کی دیگر تصانیف ہیں، جن کے نام یہ ہیں: علم الفرائض، ملخصات الحساب، تصدیق المسیح ردع کلمۃ الفصیح، الکلام المبین فی آیات رحمۃ اللعالمین، ضمان الفردوس، فضائل علم و علمائے دین، فضائل درود و سلام، محاسن العمل الافضل معہ الملتمسات، ہدایات الاضاحی، الدر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید، وظیفہ کریمہ، خجستۂ بہار، احادیث الحبیب المتبرکہ، نقشہ مواقع النجوم، لوامع العلوم و اسرار العلوم-

قاضی علیم الدین: ابن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی، جید عالم دین، طباع اور ذہین تھے- کتب درسیہ کی تعلیم و تحصیل اپنے والد ماجد اور ملا عماد الدین لبکنی، مولوی فضل اللہ نیوتنوی، مولوی عبد الواجد خیر آبادی سے کی-

مطالعہ کتب کی کثرت کی وجہ سے علم حاضر تھا- کچھ دنوں مفتی عدالت رہے، پھر بریلی میں قاضی دائر و سائر ہو گئے- جس وقت محکمہ قضا تخفیف میں آیا تو حسن کارگزاری کے صلے میں صدر اعلیٰ مقرر ہو گئے- حضرت شاہ محمد کاظم قلندر سے بیعت و ارادت تھی- 17 ذی الحجہ 1257ھ/ 29

جنوری 1842 میں وفات پائی اور کاکوری میں مدفون ہوئے۔ آپ کے صاحبزادوں میں مولوی رضی الدین، ریاض الدین اور مولوی مسیح الدین مشہور ہوئے۔ مؤخر الذکر صاحبزادے واجد علی شاہ اودھ کے معاملے کی پیروی کے لیے لندن گئے تھے۔

قاضی حکیم الدین: ابن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی کی 1194ھ/1780 میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد اور کتب درسیہ کی تکمیل ملا عماد الدین بریلوی اور مولوی فضل اللہ نیوتنوی سے کی۔ حضرت شاہ محمد کاظم قلندر سے بیعت تھے۔

پہلے محکمہ ججی میں سررشتہ دار ہوئے، پھر صدر امین کے عہدے پر مامور ہوئے، اس کے بعد صدر الصدور مقرر کیے گئے۔ اسی منصب سے پنشن پائی اور گوشہ نشین ہو گئے۔ سرکاری مناصب اور مصروفیات کی وجہ سے درس و تدریس کی نوبت بہت کم آئی۔ تاہم کتب بینی اور مطالعے کا ایسا ذوق تھا کہ انتقال کے وقت "فتح القدیر" شرح ہدایہ ان کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ 1269ھ/1853 میں وفات پائی اور کاکوری میں مدفون ہوئے۔

قاضی سعید الدین: کی ولادت 1180ھ/1766 میں ہوئی۔ 'روز نیکو سعید پیدا گشت' سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی کے چار صاحبزادے تھے، سب سے بڑے فرزند قاضی سعید الدین تھے۔ نہایت وجیہ صورت، سنجیدہ مزاج، ذکی الطبع اور جید عالم دین تھے۔ تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد، ملا عماد الدین لاہوری اور مولوی فضل اللہ نیوتنوی سے پائی۔ شاہ بدر علی خلیفہ شاہ محمد عاقل سبز پوش سے بیعت تھے۔ اردو اور فارسی میں اچھے شعر کہتے تھے، معاصر شعرا کے تذکروں میں آپ کا والہانہ ذکر ملتا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد قاضی دائر و سائر ہو گئے۔ اس سلسلے میں مختلف اضلاع کا دورہ کرتے رہتے تھے، مقدمات فوجداری کے حکم کا نفاذ آپ کے فتوے کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ حکام کے یہاں آپ کی بہت قدر و منزلت تھی۔ اس کے علاوہ نواب سعادت علی خاں شاہ اودھ اور بادشاہ دہلی کے درباروں میں بھی آپ بہت مقرب اور معتمد مانے جاتے تھے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے چھ سو روپے مشاہرہ پر فرخ آباد میں خورد سال نواب کی نگہداشت کے لیے رہے۔ 21 ذی الحجہ 1262ھ/1846 میں آپ کا وصال ہوا اور کاکوری میں مدفون ہوئے۔

مولانا فضل رسول بدایونی: کی ولادت صفر 1213ھ/99-1798 میں ہوئی۔ آپ کا نام "فضل رسول" رکھا گیا اور تاریخی نام "ظہور محمدی" منتخب ہوا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی تک پہنچتا ہے۔ صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم جد امجد مولانا عبدالحمید سے اور کچھ والد ماجد مولانا شاہ عبدالمجید سے حاصل کی۔ 12 برس کی عمر میں مزید تعلیم کے حصول کے لیے لکھنؤ گئے اور بحر العلوم ملا عبدالعلی فرنگی محلی کے جلیل القدر شاگرد ملا نور الحق فرنگی محلی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چار سال میں تمام علوم وفنون سے فارغ ہو گئے۔ پھر پیر ومرشد کے حکم سے آپ نے دھول پور میں حکیم بہر علی موہانی سے طب کی تکمیل کی۔ والد ماجد کے بلانے پر دھول پور سے واپس وطن پہنچے اور بدایوں میں "مدرسہ قادریہ" کی بنیاد رکھی۔ پھر صلۂ رحمی کے خیال سے ملازمت کا ارادہ کیا اور کلکٹری صدر دفتر، سہسوان ضلع بدایوں میں دو سال تک سررشتہ دار کے عہدے پر رہے۔ ریاست بنارس وغیرہ میں قیام کیا، لیکن درس وتدریس کا سلسلہ کہیں منقطع نہ ہوا۔ آپ کو والد گرامی کی طرف سے سلسلۂ عالیہ قادریہ کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ، نقشبندیہ، ابوالعلائیہ اور سلسلۂ سہروردیہ میں اجازت وخلافت حاصل تھی۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے خصوصی تعلق تھا۔ بادشاہ دینی امور میں آپ سے رہنمائی لیا کرتا تھا۔ آپ کے خصوصی احباب میں علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ شامل تھے۔ آپ کے تلامذہ کا سلسلہ بہت وسیع ہے، چند مشاہیر علما کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے: مولانا شاہ محی الدین (صاحبزادے) تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی (صاحبزادے)، مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی، قاضی القضاۃ مولانا مفتی اسد اللہ خاں الہ آبادی، مولوی رحمٰن علی، مؤلف "تذکرہ علمائے ہند"، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، مولانا شاہ احمد سعید دہلوی، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا سید عبدالفتاح گلشن آبادی، مولانا خرم علی بلہوری، مولانا عبدالقادر حیدر آبادی۔

آپ کے مریدین کا سلسلہ عرب وعجم میں پھیلا ہوا تھا، بے شمار لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ آپ نے خدمت خلق، عبادت وریاضت، درس وتدریس، وعظ وتبلیغ کے مشاغل کے باوجود تصنیف وتالیف کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ آپ نے اعتقادیات، درسیات، طب اور فقہ و تصوف میں قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ مشہور تصانیف درج ذیل ہیں: سیف الجبار، بوارق محمدیہ، تصحیح المسائل، المعتقد المنتقد، فوز المؤمنین، تلخیص الحق، احقاق الحق، شرح فصوص الحکم، رسالۂ

طریقت، حاشیہ میر زاہد بر رسالہ قطبیہ، حاشیہ میر زاہد ملا جلال وغیرہ۔ 20 جمادی الاخریٰ 1289ھ/ 1872 کو وصال ہوا اور درگاہ قادریہ بدایوں میں مدفون ہوئے۔

مفتی انعام اللہ شہابی: ابن محمد اسحٰق سہروردی 1206ھ/92-1791 میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور چچا سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ دہلی کی عدالت میں سر رشتہ دار اور پھر مفتی ہو گئے۔ سرکار انگلشیہ کی جانب سے الہ آباد میں وکیل مقرر ہوئے۔ پھر ٹونک آ گئے، جہاں نواب وزیر الدولہ نے 1259ھ/ 1843 میں مہتمم بندوبست کا عہدہ دیا۔ 75-1274ھ/58-1857 میں وصال ہوا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔

مفتی لطف اللہ علی گڑھی: ابن شیخ اسد اللہ کی ولادت 1244ھ/ 1828 میں علی گڑھ کے قصبہ پلکھنہ میں ہوئی۔ ''چراغم'' سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ مفتی صاحب کا نسب صحابی رسول حضرت عبیدہ بن الجراح سے ملتا ہے۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں جی موہن لال، مولوی محمد عظیم اللہ، سید رونق علی اور مولوی حفیظ اللہ خاں سے پڑھیں، مؤخر الذکر استاذ سے خطاطی بھی سیکھی۔ فارسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد مفتی عنایت احمد کاکوروی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام کتب درسیہ انہی سے پڑھیں۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی اس زمانے میں مفتی و منصف علی گڑھ تھے، اس عہدے کے ساتھ وہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ مفتی عنایت احمد کا تبادلہ بحیثیت صدر امین علی گڑھ سے بریلی ہوا تو مفتی لطف اللہ بھی ان کے ساتھ بریلی آ گئے اور یہیں کتب درسیہ سے فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مفتی عنایت احمد کاکوروی نے اپنے ہی اجلاس میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی کو سر رشتہ دار مقرر کر لیا۔ اس زمانے میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا، مفتی عنایت احمد اس جنگ میں حصہ لینے کے جرم میں کالا پانی بھیج دیے گئے اور مفتی لطف اللہ علی گڑھ چلے گئے، جہاں کایستوں کے قائم کردہ مکتب میں دس روپے ماہانہ پر زندگی بسر کی۔ مفتی عنایت احمد جزیرۂ انڈمان سے سزا کاٹ کر واپس آئے تو کان پور میں مدرسہ فیض عام قائم کیا اور وہیں مفتی لطف اللہ کو مدرس دوم رکھ لیا، کچھ دنوں کے بعد مدرس اول ہو گئے۔ سات برس کان پور میں رہنے کے بعد پچاس روپے مشاہرہ پر مدرسہ جامع مسجد علی گڑھ میں مدرس اول ہو گئے۔ یہاں درس کا بافیض سلسلہ

1258ھ/1868 سے 1312ھ/1894 تک مسلسل جاری رہا- 1895 میں ریاست حیدرآباد میں مفتی عدالت مقرر کیے گئے-تقریباً6 سال اس منصب سے تعلق رہا، پھر علی گڑھ چلے آئے اور 1334ھ/1916 میں وفات پائی-

مفتی خلیل الدین خان: ابن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین خاں کاکوروی کی ولادت 1230ھ/1814 میں ہوئی-نہایت ذہین وفطین تھے-ابتدائی کتب درسیہ اپنے والد ماجد سے پڑھیں، پھر مولوی روشن علی جون پوری کی خدمت میں رہ کر اکتساب علوم کیا اور فراغت پائی-

فراغت کے بعد اپنے والد کے ساتھ کلکتہ آ گئے اور مسٹر ہارنگٹن ممبر کونسل کی فرمائش پر باب التعزیرات درمختار کی فارسی میں شرح لکھی جو گورنر جنرل کے حکم سے طبع ہوئی-عربی کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے-نثر عربی میں شیخ احمد عرب یمنی سے اصلاح لی تھی-اسی زمانے میں حکام کی تحریک پر بعہدۂ ضلع کان پور میں عہدۂ افتا پر مامور ہوئے-علم حکمت اور ریاضی میں اپنی مثال آپ تھے-نواب سعادت علی خاں شاہ اودھ نے ان کی اس قابلیت کو دیکھ کر بعہدہ رسے ان کو طلب کیا اور ایک ہزار روپے ماہوار پر اپنی مصاحبت میں سیاسی معاملات سے متعلق تحریری وتقریری امداد کا کام سپرد کیا-لکھنؤ میں آپ کی تجویز اور اہتمام سے رصد خانہ قائم کیا گیا- 1241ھ/1825-26 میں دوبارہ عہدۂ سفارت قائم ہوا اور مفتی خلیل الدین خاں اس عہدے پر پانچ ہزار روپے مشاہرے پر مقرر کیے گئے-اس کے علاوہ شاہ اودھ نے انھیں چھ ہزار روپے سالانہ کی ایک جاگیر بھی عطا کی اور سرکار انگریزی نے انعام واکرام اور خطاب بہادری سے بھی سرفراز کیا-ساڑھے چار برس اس عہدے پر کام کرنے کے بعد مستعفی ہو گئے-کچھ برسوں کے بعد نواب نصیر الدین حیدر جب شاہ اودھ ہوئے تو مفتی صاحب کو پھر طلب کیا اور بہ اصرار دو ہزار روپے ماہوار پر اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا-جب محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو عہدۂ نظامت صدران کے سپرد ہوا، پھر امجد علی شاہ کے زمانے میں نظامت خفیہ پولیس کے افسر ہو گئے اور اسی عہدے سے پنشن لے لی-

مفتی صاحب کی تصانیف میں مرأۃ الاقالیم، رسالہ در بیان جغرافیہ طرق وشوارع احاطہ اودھ اور رسالہ طول البلد وغایۃ النہار قابل ذکر ہیں- 15 جمادی الاولی 1281ھ/ 1864 میں وفات پائی اور اپنے وطن کاکوری میں مدفون ہوئے-

مولوی مسیح الدین خاں: ابن قاضی علیم الدین خاں ابن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی 15 شعبان 1219ھ/18 نومبر 1804 میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں شیخ قیام الدین موہانی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا امین الدین اور مولوی حسن بخش سنای سے پڑھیں۔ آگرہ میں اپنے والد اور مولوی سید امیر علی سے، کاکوری میں مولوی فضل اللہ نیوتنوی، مولانا مستعان کاکوروی سے اور لکھنؤ میں مولانا ظہور اللہ، مولوی حفیظ اللہ فرنگی محلی اور مولانا قدرت علی فرنگی محلی سے اکتساب علوم کیا اور تکمیل مرزا حسن علی محدث لکھنوی سے کی۔ جلیل القدر ادیب اور ریاضی داں تھے۔ حضرت شاہ میر محمد قلندر سے بیعت وارادت رکھتے تھے۔

فراغت کے بعد آگرہ چلے گئے اور میر منشی محکمۂ گورنری کے لیے منتخب ہوئے۔ حسن کارکردگی اور خاندانی اعزاز کی بنیاد پر 1838 میں حکومت انگلشیہ نے انھیں اعزاز و اکرام اور خطاب سے نوازا۔ ایک سال کے بعد ترقی پاکر میر منشی گورنر جنرل بہادر ہوگئے اور اس طرح پورے ہندوستان اور اس کی ریاستوں کا انتظام انہی سے متعلق ہوگیا۔ اس عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد مرشد آباد میں عہدۂ دیوانی پر تقرر ہوا اور کچھ دنوں کے بعد داروغگی دیوان جات نظامت وعرض بیگی پر ترقی ہوئی۔ چند برسوں کے بعد اس عہدے سے مستعفی ہوکر خانہ نشین ہوگئے۔ دو سال کے بعد جب انتزاع ریاست اودھ کا معاملہ پیش آیا تو مسئلے کے تصفیے کے لیے ریاست اودھ کے سفیر بناکر ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں لندن بھیجے گئے۔ کچھ عرصے نواب ٹونک اور والی رام پور کے پاس بھی رہے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں: مفتاح الرشاد لکنوز المعاش والمعاد، جدول طلوع وغروب، تاریخ انگلستان بہ سفرنامہ لندن، تاریخ الخلفا، تاریخ ہندوستان واودھ۔ 7 محرم 1299ھ/29 نومبر 1881 میں انتقال ہوا اور اپنے وطن کاکوری میں مدفون ہوئے۔

مولوی ریاض الدین خاں: ابن قاضی علیم الدین خاں ابن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی کی ولادت 1229ھ/14-1813 میں ہوئی۔ علوم متداولہ اپنے والد ماجد، چچا، مولوی فضل اللہ نیوتنوی، مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولوی نور الحسن کاندھلوی اور مولوی حسین احمد محدث ملیح آبادی سے حاصل کیے۔ آپ مسلم الثبوت عالم، درویش صفت اور صاحب تقویٰ تھے۔ مولانا امین الدین کاکوروی سے بیعت وارادت تھی۔

فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، پھر آگرہ میں مفتی، اس کے بعد منصف مقرر ہوئے۔ معرکۂ ستاون میں وطن چلے گئے۔ ستاون کے بعد کچھ دنوں کے لیے نواب ٹونک کے یہاں رہے۔ نواب صاحب کی معزولی کے بعد ڈریمن صاحب کمشنر بریلی کی طلبی پر رام پور آ گئے، یہاں نواب کلب علی خاں والی رام پور نے عزت و وقار کے ساتھ نوکر رکھا اور رام پور کی تمام عدالتوں کے مفتی مقرر کیے گئے۔ پھر نواب فدا حسن خاں کاکوری کی طلبی پر حیدر آباد چلے گئے، جہاں صفر 1295ھ/ فروری 1878 میں انتقال ہوا۔

مولوی رضی الدین خاں: ابن قاضی علیم الدین خاں ابن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی 1216ھ/ 02-1801 میں پیدا ہوئے۔ تمام کتب درسیہ اپنے والد ماجد، مولوی فضل اللہ نیوتنوی اور شاہ اسحٰق محدث دہلوی سے پڑھیں اور شاہ صاحب سے احادیث کی سند بھی حاصل کی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا امین الدین کاکوروی سے بیعت تھے۔

فراغت کے بعد بحیثیت مفتی اور صدر امین آگرہ میں تقرر ہوا۔ پھر دہلی میں صدر امین ہوئے اور آخر میں الٰہ آباد میں صدر الصدور ہو گئے۔ وہاں سے مختلف اضلاع میں ہوتے رہے۔ معرکۂ ستاون میں بریلی سے اپنے وطن کاکوری واپس آ گئے اور کچھ مہینے علیل رہ کر 19 ربیع الآخر 1274ھ/ 6 دسمبر 1857 کو وفات پائی۔

مولوی ذکاء اللہ خاں دہلوی: حافظ ثناء اللہ کے فرزند تھے۔ 1247ھ/ 1833 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ اور دہلی کالج میں مولانا مملوک العلی نانوتوی سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ہی دہلی کالج میں ریاضی کے استاذ مقرر ہو گئے۔ وہاں سے ترقی پا کر آگرہ کالج کے پروفیسر ہوئے۔ 1855 میں بلند شہر و مراد آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنائے گئے۔ 1869 میں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں بحیثیت عربی و فارسی پروفیسر تقرر ہوا۔ 26 سال اس عہدے پر رہے، اس کے بعد پنشن لے کر دہلی آ گئے اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

مولوی منشی ذکاء اللہ خاں ہندوستان کے کثیر التصانیف مصنف ہوئے۔ تین سو سے زائد تصانیف، تالیفات اور تراجم کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں تاریخ ہندوستان، تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ اور آئین قیصری وغیرہ معروف ہیں۔ 14 ذی قعدہ 1328ھ

/1910 میں دہلی میں انتقال ہوا۔

مولوی اشرف علی صادق پوری: ابن مولوی احمد اللہ (مرید سید احمد رائے بریلوی) کی پیدائش 1259ھ/1843 میں ہوئی۔ آپ کا تعلق خانوادۂ صادق پور پٹنہ سے تھا، جو سید احمد رائے بریلوی کا معتقد اور ان کی تحریک کا معاون رہا ہے۔ مولوی اشرف علی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد، بڑے بھائی مولوی عبدالحمید اور چچا مولوی فیاض علی سے حاصل کی۔ سکھوں کے خلاف سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد میں حصہ لینے کی غرض سے مولوی عبداللہ ابن مولوی عنایت علی صادق پوری کی امارت کے زمانے میں کچھ عرصے کے لیے سرحد پر گئے اور لوٹ آئے۔ درسیات کی تکمیل مفتی یوسف فرنگی محلی سے کی۔ فراغت کے بعد مغربی علوم کی طرف توجہ کیا اور بنارس گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے کر ریاضی اور انگریزی زبان کی تعلیم لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بنارس کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ اودھ اخبار لکھنؤ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ پھر ریاست بھاول پور میں ہیڈ ماسٹر اسکول مقرر ہوئے۔ آخر میں قصبہ باندہ کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو کر سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ ملازمت کے بعد دینی علوم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ 2 شوال 1326ھ/28 اکتوبر 1908 کو انتقال ہوا۔

مولوی امجد علی صادق پوری: ابن مولوی یحیٰ علی صادق پوری کی ولادت 1263ھ/1847 میں ہوئی۔ خانوادۂ صادق پور کے ایک فرد تھے۔ درسیات کی تکمیل مولوی اشرف علی صادق پوری سے کی۔ سکھوں کے خلاف سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد میں حصہ لینے کی غرض سے مولوی اشرف علی کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے سرحد پر گئے اور لوٹ آئے۔ دینی علوم سے فراغت کے بعد انگریزی پڑھنے کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر بنارس گورنمنٹ کالج سے بی اے اور ایم اے کیا۔ تعلیم میں اچھی کارکردگی کی وجہ سے وظائف اور انعامات پاتے رہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے۔ پہلے فیض آباد میں فورتھ ٹیچر اور بریلی میں سیکنڈ ٹیچر رہے، پھر علی گڑھ کالج میں فلسفے کے پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد الہ آباد میور سینٹرل کالج میں عربی کے پروفیسر اور فیلو آف یونیورسٹی مقرر کیے گئے۔ اسی عہدے سے پنشن لی اور اپنے وطن پٹنہ واپس آ گئے۔ انگریزی سرکار سے مولوی صاحب کو ''شمس العلما'' کا

خطاب بھی ملا-2 شوال 1341ھ/18 مئی 1923 کو انتقال ہوا-

مفتی شہاب الدین: ابن مولانا امین الدین 1191ھ/78-1777 میں پیدا ہوئے- اپنے والد اور چچا قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین سے تعلیم وتربیت پائی- بڑے زبردست عالم و فاضل تھے- فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل کے عہدے پر مامور ہوئے- پھر وہاں سے مغربی ہند کے مختلف اضلاع میں مفتی اور صدر الصدور مقرر ہوئے- کچھ دنوں تک دہلی، مظفر نگر اور سہارن پور بھی رہے- سہارن پور میں ہی 24 محرم 1256ھ/29 مارچ 1840 میں انتقال ہوا اور درگاہ نور شاہ کے قریب دفن ہوئے-

قاضی وحید الدین خاں: ابن قاضی امام الدین خاں ابن ملا حمید الدین محدث نے تعلیم وتربیت اپنے خاندان میں پائی- علمائے عظیم آباد سے بھی اکتساب علوم کیا- آپ کی علمی قابلیت کی وجہ سے آپ کے والد نے اپنی زندگی میں ہی آپ کو اپنا جانشین مقرر کردیا- چنانچہ آپ اپنے والد کی جگہ پر عظیم آباد پٹنہ کے قاضی منتخب ہوئے- سلسلۂ نقش بندیہ میں شاہ محمد غوث پنجابی خلیفہ شاہ ابو سعید دہلوی سے بیعت تھے- 13 ذی قعدہ 1273ھ/5 جولائی 1857 میں پٹنہ میں وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے-

مولوی محمد بخش: ابن شیخ سلطان بخش بدایوں کے نامور رؤسا میں تھے- باصلاحیت عالم اور فاضل تھے- ایک عرصے تک صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہے- پنشن کے بعد اسپیشل آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے- مولانا شاہ عین الحق عبدالمجید سے بیعت وارادت رکھتے تھے- 26 رمضان 1290ھ/17 نومبر 1873 میں وفات پائی اور اپنے مکان کے قریب مسجد میں دفن ہوئے- آپ کے نامور فرزند خان بہادر مولوی حامد بخش وائس چیرمین میونسپل بورڈ بدایوں تھے-

مولوی مجید الدین خاں: ابن مولوی حفیظ الدین خاں ابن مولوی قاضی امام الدین خاں نے تعلیم وتربیت خاندان میں پائی اور کتب درسیہ کی تکمیل مولوی سید احمد علی کابلی سے کی- مولانا امین الدین محدث سے بیعت تھے- تقویٰ اور علمی قابلیت کی وجہ سے اجمیر میں صدر اعلیٰ یعنی سول جج مقرر ہوئے- وقف درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا انتظام بھی انہی سے متعلق تھا- اجمیر میں ہی 27 جمادی الاولیٰ 1270ھ/25 فروری 1854 میں وفات پائی اور درگاہ کے احاطے میں

دفن ہوئے۔

مفتی اسد اللہ الہ آبادی: ابن مفتی کریم قلی کی ولادت 1230ھ/15-1814 میں ہوئی۔ نحو وصرف زین العابدین کڑوی سے، بعض درسی کتابیں مولانا عبدالرحیم شاہجہاں پوری سے اور اقلیدس مولوی جلال الدین رام پوری سے پڑھیں۔ جبکہ کتب درسیہ اور علم حدیث کی تحصیل وتکمیل مولانا شاہ فضل رسول عثمانی بدایونی سے کی۔ظہور محمد بن خیرات علی کالپوی کے مرید تھے۔فراغت کے بعد فتح پور میں مفتی عدالت ہوئے ،اس کے بعد آگرہ میں قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے اور آخر میں جون پور کے صدر الصدور ہوئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔منصبی فریضے کے ساتھ درس وتدریس بھی جاری رکھا۔مولوی رحمٰن علی مصنف 'تذکرۂ علمائے ہند' آپ کے خصوصی تلامذہ میں تھے۔آپ نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔آخر عمر میں تمام ظاہری تعلقات منقطع کرکے گوشہ نشین ہوگئے۔یکم جمادی الاولیٰ 1300ھ/83-1882 میں جون پور میں ہی انتقال ہوا اور وہیں محلہ چتر ساری میں مدفون ہوئے۔

قاضی ارتضا علی گوپا موی: ابن مصطفیٰ علی خاں کی ولادت 1198ھ/84-1783 میں ہوئی۔علوم عقلیہ ونقلیہ مولوی حیدر علی سندیلوی سے حاصل کیا اور فن ادب مولوی محمد ابراہیم بلگرامی سے پڑھا۔جامع شریعت وطریقت تھے۔1225ھ/1810 میں اپنے والد کے پاس مدراس پہنچے اس زمانے میں ان کے والد مدراس کے قاضی تھے۔اپنے والد کے انتقال کے بعد آپ منصب قضا پر فائز ہوئے۔منصبی مصروفیات کے علاوہ درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے اور 'صدرا' اور 'ملا جلال' پر عالمانہ حواشی لکھے۔آپ کی معروف تصانیف حسب ذیل ہیں: نفائس ارتضائیہ، نقود الحساب، رسالہ فرائض، اور شرح قصیدہ بردہ۔1251ھ/36-1835 میں وصال ہوا۔

قاضی عطا رسول چریاکوٹی: مولانا قاضی عطا رسول عباسی چریاکوٹی' قاضی غلام مخدوم عباسی چریاکوٹی (وفات:1255ھ) کے ہونہار فرزند تھے۔علم وفراست اور حکمت وطبابت میں درک رکھتے تھے۔بہت ذہین وفطین، ادب داں اور صائب الرائے تھے۔علوم متداولہ میں گہری نظر رکھتے تھے۔خصوصاً فقہ اور فرائض میں انھیں اختصاص حاصل تھا۔

قاضی صاحب کا خانوادہ علم وفضل کے اعتبار سے منفرد تھا، آپ کے خاندان میں مشاہیر علما و

فضلا پیدا ہوئے، جنھوں نے علم وادب کی سرپرستی اور دین ومذہب کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خصوصاً آپ کے پوتے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی اور مولانا فاروق عباسی چریاکوٹی نے آپ کے بعد آپ کے دینی وفکری نظریات کو آگے بڑھایا۔

سلطنت اودھ میں کچھ دنوں تک عدالت فوجداری میں عہدہ دار رہے۔ نواب تاج الدین حسین خان کنبوہ نے انھیں اپنی ریاست کا ناظم مقرر کیا تھا۔ نواب صاحب سے قاضی عطا رسول کے بہت اچھے مراسم تھے، حالاں کہ ان دونوں کے مذہبی نظریات مختلف تھے۔ قاضی صاحب سنی تھے تو نواب صاحب شیعہ۔☆

مولانا سید عبد الفتاح: ابن سید عبد اللہ حسین نقوی گلشن آباد، ناسک کے رہنے والے تھے۔ عالم باعمل اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ سید میاں سورتی، مولوی شاہ عالم، مولوی بشارت اللہ کابلی، ملا عبد القیوم کابلی، مفتی عبد القادر تھانوی، مولوی خلیل الرحمٰن سے اکتساب علوم وفنون کیا۔ تصوف اور علم حدیث کی تکمیل مولانا شاہ فضل رسول عثمانی بدایونی سے کی۔ 1264ھ/1848 میں امتحان سے فارغ ہوئے اور مفتی کی سند حاصل کی۔

1271ھ/56-1855 میں ضلع خاندیش کی عدالت میں بحیثیت مفتی تقرر ہوا۔ 1284ھ/88-1887 میں الفنسٹن کالج میں میں عربی وفارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے اور پھر اسی عہدے سے پنشن لے لی۔ علمی لیاقت اور حسن کارکردگی کی وجہ سے حکومت انگلشیہ نے ''جسٹس آف پیس'' اور ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا۔ فریضۂ منصبی کے علاوہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے بھی وابستہ رہے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں: تحفۂ محمدیہ فی رد وھابیہ، تائید الحق، جامع الفتاویٰ (4 جلد)، خزینۃ العلوم (2 جلد)، فارسی آموز (دو حصہ)، تشریح الحروف (فارسی)، خزینۂ دانش، کلید دانش (فارسی)، کلید دانش (ہندی)، اشرف القوانین، مصادر الافعال، مجامع الاسما، تعلیم

☆ قاضی عطا رسول چریاکوٹی کے تعلق سے جتنے بھی معروف معاصر تذکرے ہیں، مثلاً نزہۃ الخواطر، تذکرۂ علمائے اعظم، تذکرۂ علمائے ہند اور حدائق الحنفیہ وغیرہ خاموش ہیں۔ کافی تلاش وجستجو کے بعد بھی قاضی صاحب کے تفصیلی احوال نہیں مل سکے۔ مولانا افروز قادری چریاکوٹی (دلاص یونیورسٹی، کیپ ٹاؤن، ساؤتھ افریقہ) ''تذکرۂ علمائے چریاکوٹ'' مرتب کر رہے ہیں۔ علمائے چریاکوٹ کے تعلق سے انھیں بھی جو قلمی یادداشتیں ہاتھ لگیں، ان میں بھی اس سے زیادہ تفصیل نہیں مل سکی۔ ان ہی کے توسط سے یہ مختصر خاکہ دستیاب ہوسکا۔

اللسان، تحفۃ النقال، اشرف الانشا، جغرافیۂ عالم، باقیات الصالحات، دیوان اشرف الاشعار، رحمۃ اللعالمین، تاریخ ردم، تاریخ اولیا۔ 15 صفر 1323ھ/20 اپریل 1905 میں آپ کا وصال ہوا۔

مولوی علی بخش خان: شیخ سلطان بخش کے صاحبزادے اور بدایوں کے رئیس اور عالم دین تھے۔ 1237ھ/22-1821 میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم مولانا فیض احمد بدایونی سے کی۔ مولانا شاہ عین الحق عبد المجید بدایونی سے مرید تھے۔ فراغت کے بعد ایک عرصے تک صدر الصدور کے منصب پر متمکن رہے۔ فن مناظرہ میں اختصاص حاصل تھا۔ سرسید احمد خاں، ڈپٹی امداد علی اور آریائی سماج رہنما دیانند جی سرسوتی کے عقائد و نظریات کا رد و ابطال کیا۔ سرکاری منصب کے علاوہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔ آپ کی تصانیف میں تنقیح المسائل، برق خاطف، تائید الاسلام، مؤید القرآن اور شہاب ثاقب معروف ہیں۔ 17 رجب 1302ھ/3 مئی 1885 میں انتقال ہوا اور آستانہ قادریہ بدایوں میں مدفون ہوئے۔

مولوی احمد حسن خاں: مفتی ابو الحسن عثمانی بدایونی کے بڑے صاحب زادے تھے۔ بریلی کے رؤسا اور بااثر لوگوں میں آپ کا شمار تھا۔ علوم و فنون کی تحصیل مفتی شرف الدین خاں رام پوری سے کی۔ فارسی میں شعر کہتے تھے، اسیر تخلص تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بریلی کے صدر الصدور مقرر ہوئے۔ اپنی حسن کارکردگی وجہ سے سرکار انگلشیہ میں معزز تھے۔ آپ نے سرکاری منصب کے ساتھ تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ رسالہ ''اصل الاصول'' اور ''غایۃ الکلام'' آپ کی تصانیف ہیں۔ شعبان 1273ھ/اپریل 1857 میں آپ کا وصال ہوا۔

□□□

ضمیمہ (3)

قصیدۂ رائیہ☆

[انگریزوں کی مذمت اور ہندوستان پر ان کے غاصبانہ تسلط کے بیان میں]

كَمْ فِي هَوَى الْحُوْرِ مِنْ حَوْرٍ وَمِنْ حُوْرٍ ... فَكَمْ فَتًى بِشِفَارِ الشُّفْرِ مَنْحُوْرِ

لِكُلِّ مُسْتَشْهِدٍ أَجْرٌ يُثَابُ بِهِ ... وَمَا شَهِيْدُ ظُبَا لَحْظٍ بِمَأْجُوْرِ

اَلْعَبْدُ يُعْتَقُ وَالْمَأْسُوْرُ يُطْلَقُ وَالْ ... غَرِيْمُ يُنْظَرُ إِنْظَارًا لِتَيْسِيْرِ

وَلَيْسَ لِلصَّبِّ إِنْظَارٌ وَلَا نَظَرٌ ... وَلَا تَنَظُّرُ إِطْلَاقٍ وَتَحْرِيْرِ

مَنِ اسْتَجَرَّ لِقَاسٍ لَا يَرِقُّ فَلَا ... يَنْحَاصُ عَنْ أَنْ يُقَاسِيْ ضَيْرَ مَضْيُوْرِ

[قَالُوْا] لِقَا الْحِبِّ لِلْمَهْجُوْرِ تَسْلِيَةٌ ... وَلَيْسَ هٰذَا سِوَى هَذْيٍ وَمَهْجُوْرِ

فَالْوَصْلُ عِلَّةُ هٰذَا الْإِعْتِلَالِ فَهَلْ ... يُحَوَّلُ السُّمُّ تِرْيَاقًا بِتَكْرِيْرِ

مَنْ كَانَ لِلشَّوْقِ مَنْشُوْرًا وَطُبَّ بِهِ ... فَلَا يُفِيْقُ بِطِبٍّ أَوْ بِتَنْشِيْرِ

وَمَنْ أُصِيْبَ بِلَحْظٍ سَاحِرٍ مَرِضٍ ... فَلَنْ يَرَى غَيْرَ تَحْيِيْرٍ وَتَسْحِيْرِ

لَا يُرْتَجَى صَحْوُ مُشْتَاقٍ يُفَتِّرُهُ ... فُتَارُ لَحْظٍ غَضِيْضِ الْجَفْنِ مَخْمُوْرِ

☆ اس قصیدے کا متن اور خلاصہ پہلی بار منظر عام پر آرہا ہے۔ قصیدے کا خلاصہ صفحہ نمبر 125 تا 133 پر ملاحظہ کریں۔

أَهْوَى أَغَرَّ غَرِيْرًا إِذْ غُرِرْتُ بِهِ ... غَرَّرْتُ فِيْهِ بِنَفْسِيْ أَيَّ تَغْرِيْرِ

هُيِّمْتُ فِيْهِ غَرِيْرًا بِالْغَرِيْرِ وَكَمْ ... حُرٍّ غَرِيْرٍ بِحُسْنِ الْبِشْرِ مَغْرُوْرِ

وَجْدِيْ بِأَهْيَفَ مَمْشُوْقِ الْمَعَاطِفِ مَعْ ... شُوْقِ السَّوَالِفِ زَاكِي النَّشْرِ مِعْطِيْرِ

عَذْرَاءُ لَوْزَارَهَا الزَّارِيْ لَأَعْذَرَنِيْ ... وَلَمْ يُقَارِعْ بِتَقْرِيْعٍ بِتَقْعِيْرِ

نِزَاعُهُ فِيْ نِزَاعِيْ لاَ يَزِيْدُ جَوَى ... جَوَانِحِيْ غَيْرَ إِيْقَادٍ وَتَسْعِيْرِ

بَدَتْ لَهُ فِي الْهَوَى الْعُذْرِيِّ إِنْ كَشَفَتْ ... لَهُ الْعَذَارَى مَعَاذِيْرًا مَعَاذِيْرِيْ

يُبَلِّغُ النَّاصِحَ النَّسْكَ مِنْ قِبَلِيْ ... أَنْ لَيْسَ مَغْيُكَ فِيْ لَوْمِيْ بِمَشْكُوْرِ

فَالْعِشْقُ إِنْ كَانَ ذَنْبًا فَهْوَ مُغْتَفِرٌ ... وَالتَّوْبُ عَنْهُ جُنَاحٌ غَيْرُ مَغْفُوْر

فَلاَ جَرِيْرَةَ فِيْ إِنِ انْتَجَرَّ لِمَنْ ... يُجَرِّرُ الذَّيْلَ زَهْوًا أَيَّ تَجْرِيْرِ

يَجُرُّ قَلْبِيْ إِلَيْهِ ثُمَّ يُنْصِبُهُ ... بِكَسْرِهِ لاَ يُبَالِيْ نَصْبَ مَجْرُوْرِ

لَوْ ضَمَّنِيْ لِتَلاَ فِي النَّصْبِ ضَمَّتُهُ ... بَلْ رَفْعُهُ طَرْفَهُ جَبْرٌ لِمَكْسُوْرِ

كَأَنَّ مِبْسَمَهَا صُبْحٌ وَمَبْسِمَهَا ... رَوْضُ الْأَقَاحِ بِتَنْوِيْرٍ وَتَنْوِيْرِ

كَالزَّهْرِ فِيْ زُهْرَةٍ وَالنَّوْرِ مُبْتَسِمًا ... وَفِي النَّوَارِ كَنَيْفُوْرٍ مِنَ الْفُوْرِ

كَالنَّوْرِ نَاضِرَةٌ وَالنُّوْرِ نَاظِرَةٌ ... وَالْفُوْرِ نَافِرَةٌ وَالْمِسْكِ فِي الْفَوْرِ

غَزَالَةٌ وَمَهَاةٌ نَفْرةً وَسَنًا ... لاَ بَلْ هُمَا دُوْنَهَا فِي النَّوْرِ وَالنُّوْرِ

تُرِيْكَ طَلْعَتُهَا لَيْلاً إِذَا طَلَعَتْ ... عَلَى الْمَقَاصِيْرِ ضَحْوًا فِي الْمَقَاصِيْرِ

عَنَّتْ فَعَنَّتْ بِفَوْدَيْهَا الْفُؤَادَ فَلاَ ... يُفْدَى وَإِنْ كَانَ يُفْدَى كُلُّ مَأْسُوْرِ

رَاعَتْ فَرَاعَتْ وَمَا رَاعَتْ وَلاَ نَظَرَتْ ... صَبًّا يُرَاعِيْ لَهَا زُهْرَ الدَّيَاجِيْرِ

قَسَتْ فُؤَادًا وَإِنْ لاَنَتْ مَعَاطِفُهَا ... فَأَيْسَرُ الْيُسْرِ مِنْهَا غَيْرُ مَيْسُوْرِ

لَوْ أَنَّهَا مِنْ خَوَاتِيْنِ الْفَرَنْجِ لَمَا ... تَعْصَتْ وَكَانَ لِقَاهَا غَيْرَ مَعْسُوْرِ

قُلُوْبُهُنَّ كَمَا أَعْطَافُهُنَّ فَمَا ... مَنْ زَادَهُنَّ بِمَهْجُوْرٍ وَمَحْجُوْرِ

خُوْدٌ وَجُوْدٌ وَخُوْدٌ مَا جُبِلْنَ عَلَى ... بُخْلٍ وَجُبْنٍ وَلاَ زَهْوٍ وَلاَ تِيْرِ

وَلَمْ يُعَوَّدْنَ قَصْرَ الطَّرْفِ قَطُّ وَلاَ ... قَصْرًا بِقَصْرٍ وَلاَ مَدَّ الْأَخَادِيْرِ

شُكْلٌ سَعَفْنَ بِشَكْلاءِ الْمَشُوقِ وَإِنْ   عَسَفْنَ بِالشَّكْلِ وَالْأَشْكَالِ وَالصُّوَرِ

يَعِدْنَ سِرًّا جِهَارًا كُلَّ مُجْتَهِرٍ   يَسُرُّهُنَّ بِسِرٍّ لَا أَسَارِيرِ

يَسُرُّهُنَّ بَدُوُّ السِّرِّ مِنْ ذَكَرٍ   بَلْ يَنْتَعِضْنَ بِتَذْكَارِ الْمَذَاكِيرِ

إِذَا حُرِمْنَ فَلَا يَحْرُمْنَ قَطُّ عَنِ الْـ   ـحَرَامِ إِلَّا لَدَى إِقْدَارِ فَاجُورِ

مِنَ الْغَضَاضَةِ فِي الْبِكْرِ الْغَضِيضَةِ أَنْ   تَغُضَّ طَرْفًا إِذَا مَرَّتْ بِجَمْهُورِ

بَلْ كُلُّ عَذْرَاءَ تُبْدِي الْكَعْبَ حَاسِرَةً   فَمِنْ زِنَاهُنَّ مَحْسُورٍ وَمَسْحُورِ

فَلَيْسَ بَأْسٌ عَلَى الزَّهْوِ الْعَوَانِ بِأَنْ   تَلْقَى الذُّكُورَ بِفَرْحٍ غَيْرَ مَسْتُورِ

زَهْوَى وَشَهْوَى قَرُوزٌ لَا قُرُوزَ لَهَا   إِلَّا عَلَى كُمَّزٍ لَا فِي مَقَاصِيرِ

لَا تَرْتَضِيْ ذَكَراً غَيْرَ ابْنِ أَنْقَرَ إِنْ   لَوْ كَانَ حَيًّا وَلَمْ يَكْمِلْ بِتَقْلِيرِ

تَصِيدُ ظَبْيَتُهَا فِيلًا وَ قَسْوَرَةً   كَأَنَّ غَارَ مَنِيهَا قَعْرُ غَاثُورِ

تَحُومُ كُلُّ فَتَاةٍ مِنْ خَرَائِبِهِمْ   مَشْغُوفَةً بِفَتًى فِي كُلِّ حَابُورِ

قَدْ صَدَّهَا الْخَمْرُ عَنْ خَمْرٍ وَعَنْ خُمُرٍ   فَخَامَرَتْ حِينَ هَاجَتْ كُلَّ خِمِّيرِ

مَنْشُورَةٌ لَا تَرَى بَأْساً إِذَا قَحَتْ   بِضَمِّ مُنْتَشِرٍ أَوْلَمِّ مَنْشُورِ

لِكُلِّ ذِيْ إِرْبَةٍ فِيْ فَرْجِهَا فَرَحٌ   فَكَمْ شَجِيٌّ لَهَا بِالسِّرِّ مَسْرُورِ

تَفْدِيْ بَغِيًّا وَتُفْدِيْ عَيْنَ صَاحِبِهَا   يبغي كل عظيم................ ☆

تَهِيمُ فِيْ خَفَقَانٍ لَا يَزَايِلُهَا   إِلَّا بِخَفْقٍ وَإِشْعَارٍ وَتَشْفِيرِ

تَخْلُوْ بِكُلِّ فَتًى عَلٍّ لِتَسْلُوَهُ   نَيْكاً فُوَيْرِيَّا كَأَعْلَى زِيرِ

تَدْعُوْ إِذَا اسْتَنْحَتْ خِلْنًا قَبِلَتْحَتْ   بِلَا مُبَالَاتِ تَشْوِيرٍ بِتَشْوِيرِ

تَخْلُوْ هَلُوْكًا بِهُلَّاكٍ فَيَهْتَلِكُ الْـ   ـبَعْلُ الْهَلُوْكُ وَيَخْزَى خِزْيَ مَدْحُورِ

بَلْ بَعْلُهَا نَفْسُهُ يَمْلِيْ وَلَيْسَ يَرَى   بِذَاكَ بَأْساً وَلَا يَعْنِيْ بِتَشْنِيرِ

يُثْنِيْ عَلَى شُكْرِهَا شُكْراً وَيَبْعَثُهَا   لِأَجْرِ بِضْعٍ إِلَى سُوْقٍ مَيَاسِيرِ

يَلْقَى وَيُؤْثِرُ طَلْقَ الْوَجْهِ مُبْتَسِماً   مِنْ آلِرَتِهِ لِتَزْوِيرٍ بِتَزْوِيرِ

☆ اس شعر کا دوسرا مصرع واضح نہیں تھا، اس لیے مکمل پڑھا نہیں جاسکا۔

كَمَا يُقَابِلُ ضَيْقاً لا يُقَبِّلُهَا ... شَوْقاً وَتَوْقاً بِتَطْرِيْدٍ وَتَنْفِيْرِ

يُبِيْحُ كَفْحَ كَفِيْحٍ لا يُكَافِحُهَا ... حُبًّا لِيُكْفِحَهُ إِكْفَاحَ مَهْزُوْرِ

إِذَاأَشَارَتْ إِلَى عَارٍأَشَارَ عَلَى الْـ ... عَارِيْ مُعَاشِرُهَا طَوْعاً بِتَشْوِيْرِ

تُمْسِيْ وَتُصْبِحُ تُضْبِي الْمُخْجَلِيْنَ وَلَا ... تَسْرُنُوْ إِلَيْهِمْ مِنَ الْوَضْوَاضِ وَالصَّبْرِ

لَاتَعْرِفُ الصَّبْرَ وَالْوَضْوَاضَ رَائِدَةً ... مَاعَاوَدَتْ قَطُّ أَخْدَاراً بِأُخْدُوْرِ

تَبْدُوْ تَشِيْرُ إِلَى الرَّانِيْ بِلَاخَفَرٍ ... وَالْبَعْلُ لا يَعْتَنِيْ حِيْنًا بِتَخْقِيْرِ

تَبْغِيْ عَلَى الزَّوْجِ تَبْغِي الْخِلْنَ بَاغِيَةً ... فَالزَّوْجُ وَيْلَاهُ مِنْ خُسْرَانِ مَهْجُوْرِ

يَاوَيْلَ قَوْمٍ أَبَاحُوْا بَوْحَ نِسْوَتِهِمْ ... وَخَيَّرُوْهُنَّ طَوْعاً كُلَّ تَخْيِيْرِ

يُصَفِّقُوْنَ وَيَهْتَزُّوْنَ إِنْ رَقَصَتْ ... أَزْوَاجُهُمْ بَيْنَ أَيْدِي الزُّوْرِفِي الزُّوْرِ

أَصْوَاتُهُمْ فَوْقَ أَصْوَاتِ الْحَمِيْرِ فَإِنْ ... دَنُّوْا وَرَنُّوْا حَكَوْا عَنْ نَقْرِ نَاقُوْر

تَيَقَّنُوْا سَفَهاً إِنْ لَيْسَ مَنْقَبَةً ... تَغَاوُلُ الرَّقْصِ أَوْضَرْبِ الْمَزَامِيْرِ

وَلا يَعُدُّوْنَ غَيْرَ الْغَيْرِ مَنْقَصَةً ... فَالْغَارُ عَارٌ عَلَى الشُّمِّ الْمَغَايِيْرِ

عُذْرُبِهِمْ إِنَّ غَارَالْمَرْءِ يَمْنَعُهُ ... عَنِ الْغِيَارِ وَيُلْقِيْ فِيْ نَهَابِيْرِ

يَخِيْبُ كُلُّ مَنِ انْتَخَيَ وَيَظْفَرُالْـ ... وَقِيْحُ مِنْ دُوْنِ تَكْلِيْفٍ وَتَفْكِيْرِ

لَا يَقْتَنِي الْمَالَ مَنْ يَقْنِي الْحَيَاءَ وَلَا ... يَغْتَارُ مَنْ غَارَ بِاسْتِشْعَارِ تَغْيِيْرِ

أَمَّا الْمُمَاذِيْ فَلَا تَحْمِيْ حَمِيَّتُهُ ... عَنِ ارْتِكَابِ شَنَارٍ أَوْدَفَارِيْرِ

يُفْضِي الْمُذَالَ إِلَى نَيْلِ الْمَنَالِ كَمَا ... يُفْضِي الضَّمِيْرُإِلَى ضَرٍّوَضَارُوْرِ

قَوْمٌ يَبُوْلُوْنَ قَوَّاماً وَإِنْ دَخَلُوْا ... فِيْ غَائِطٍ خَرَجُوْا مِنْ غَيْرِ تَطْهِيْرِ

قَدْ آلَرُوْا كُلَّ رِجْسٍ مِنْتِنٍ أُكُلَا ... يُسَوِّغُوْنَهُ فِيْ أَوَانٍ مِنْ قَوَارِيْرِ

وَيَسْتَطِيْبُوْنَ رِيْحَ الْمُنْتِنَاتِ كَمَا ... يَسْتَكْرِهُوْنَ شَذَامِسْكٍ وَكَافُوْرِ

أُمُّ الْخَبَائِثِ لِلْوِلْدَانِ مُرْضِعَةٌ ... وَلَحْمُ شُبَّانِهِمْ لَحْمُ الْخَنَازِيْرِ

فَمَنْ رَآهُمْ رُتُوْتاًلَمْ يَمِنْ فَهُمُ الرْ ... رُتُوْتُ مِنْ غَيْرِ تَشْبِيْهٍ وَتَنْظِيْرِ

لاغَرْوَإِنْ عُوِّدُوْا عَادَالرُّتُوْتِ فَلِلْـ ... غِذَاءِ فِي الْمُتَغَذِّيْ كُلُّ تَأْثِيْرِ

خُلْفٌ أَقَاوِيلُهُمْ خُلْفٌ وَمَوْعِدُهُمْ   خُلْفٌ وَإِنْ زَوَّرُوا الزَّوْرَاءَ بِالزُّوْرِ
أَشِحَّةٌ يَطْرُدُوْنَ الْمُعْتَرِيْ وَيَبْذُ   ذِرُوْنَ فِيْ خَشَبَاتٍ أَيَّ تَبْذِيْرِ
مَا فِيْ أُولَاءِ سِوَى غُمْرٍ وَذِيْ غَمَرٍ   وَمُقْذِرٍ يَأْكُلُ الْأَقْذَارَ قَاذُوْرِ
فَمِنْ عَزِيْزٍ غَرِيْرٍ غَيْرُ مُخْتَبَرٍ   وَمِنْ شَرِيْرٍ خَبِيْثِ النَّفْسِ فِكِّيْرِ
لَمْ يُلْفِ مُخْتَبِرٌ فِيْ هٰؤُلَاءِ سِوَى   مُوْذٍ وَمُمْذٍ وَصَقَّارٍ وَصَقُّوْرِ
لَنْ يُؤْنِسَ الْأَنْسُ مِنْهُمْ بِالْأُنَاسِ فَلَا   يُؤَانِسُوْنَ سِوَى كَلْبٍ وَخِنْزِيْرِ
فَيَلْحَسُوْنَ لِسَانَ الْكَلْبِ مِنْ شَغَفٍ   بِحُبِّهِ يَمْزُجُوْنَ الشَّوْرَ بِالشَّوْرِ
وَمَنْ يَكُنْ هَمُّهُ حُبُّ الْكِلَابِ فَلَنْ   يَفُوْزَ عَوْضُ مِنَ الْحُسْنَى بِقِطْمِيْرِ
يَرُوْقُ أَسْمَاعَهُمْ مَرُّ الْكِلَابِ كَمَا   يَرُوْقُ سَمْعَ طَرُوْبٍ حُسْنُ مِزْمِيْرِ
تَبْدُوْ لِمَنْ يَجْتَلِيْهِمْ مِنْ مَحَاسِنِهِمْ   حَصَى الْفُرُوْدِ وَأَحْدَاقُ السَّنَانِيْرِ
لَمْ تَبْقَ مِنْ خِيْرَةٍ فِيْ عَهْدِ نَوْلِهِمْ   إِلَّا أَسَاطِيْرُ تُتْلَى فِيْ أَسَاطِيْرِ
وَكَيْفَ يُؤْمَلُ مِنْ صُهْبِ السِّبَالِ وَمِنْ   زُرْقِ الْعُيُوْنِ خِلَالَ الْخَيْرِ وَالْخِيْرِ
وَأَيْنَ هُمْ مِنْ فَعَالِ الْمُكْرَمَاتِ وَهَلْ   خَيْرُ الْخَنَاسِيْرِ يُرْجَى مِنْ خَنَاسِيْرِ
فَمَا بِسَاحَاتِهِمْ لَاجٍ يَلُوْذُ وَلَا   رَاجٍ يَفُوْزُ وَلَا جَارٍ بِمَنْصُوْرِ
بَنَوْا مَدَارِسَ طَمْعًا لِلْعُلُوْمِ كَمَا   سَمُّوْا مَجَاهِيْلَ جَهْلًا بِالنَّحَارِيْرِ
وَلَوْا لِيَدْرُسَ رَسْمُ الدَّرْسِ كُلَّ غَوٍ   مُدَارِسٍ مَا دَرَى مَا فِي الْأَضَابِيْرِ
مُدَارِسٌ دَارِسٌ لِلدَّرْسِ يَشْغَلُهُ   دَرْسُ الدَّوَارِسِ عَنْ دَرْسٍ وَتَذْكِيْرِ
فَلَيْسَ مَقْصُوْدُهُمْ تَرْوِيْجَ مَعْرِفَةٍ   بَلْ كُلُّ ذٰلِكَ تَمْهِيْدٌ لِتَنْصِيْرِ
لِذَا عَمُوْنَ يَرَوْنَ أَنَّ اللّٰهَ ذُوْ وَلَدٍ   قَرًّا بِعِيْسَى وَإِيْمَانًا بِنَسْطُوْر
فَيَخْلُقُوْنَ أَقَانِيْمَ وَآلِهَةً   وَيَفْتَرُوْنَ أَبَاطِيْلَ الدَّوَارِيْر
لَمْ يَبْقَ مِنْ رَسْمِ رَهْبَانِيَّةٍ مَعَهُمْ   سِوَى صَلِيْبٍ مَنُوْطٍ بِالزَّنَانِيْرِ
يَا وَيْلَهُمْ نَسَخُوا الْإِنْجِيْلَ وَابْتَدَعُوْا   قَوَاعِدًا نَسَخُوْهَا فِيْ دَسَاتِيْرِ
هَمُّوْا بِتَغْيِيْرِ تِلْكَ التَّوْرِيَاتِ فَقَدْ   هَمُّوا الْبَرَايَا بِتَغْيِيْرٍ وَتَغْيِيْرِ

فَإِنْ يَكُنْ وَاحِدٌ مِنْهَا بِمُنْشَرِحٍ　　عَنْ هَمِّهِمْ غَيَّرُوْهَا كُلَّ تَغْيِيْرِ
يَشْرُوْنَ أَرْدَأَ قِرْطَاسٍ لِيَكْتُبَ مَا　　يَقْضُوْنَ سُحْتاً بِغَالٍ مِنْ دَنَانِيْرِ
وَلَا يُغِيْثُوْنَ مَنْ لَا يَشْتَرِيْهِ وَإِنْ　　ذَمُّوْا بِذَاكَ بِتَظْلِيْمٍ وَتَجْوِيْرِ
لَا يَسْمَعُوْنَ شَكَاةَ الْمُسْتَغِيْثِ سِوَى　　حَرْفٍ عَلَى ذٰلِكَ الْقِرْطَاسِ مَسْطُوْرِ
وَاهَا تَفَاوَتَ أَثْمَانًا مَهَارِقُهُمْ　　بِاخْتِلَافِ الدَّعَاوِيْ فِي الْمَقَادِيْرِ
لٰكِنْ تَفَاوَتَ نَوْعٌ وَاحِدٌ ثَمَناً　　تَفَاوُتاً غَيْرَ مَحْسُوْبٍ بِتَقْدِيْرِ
لَا يَعْتَنُوْنَ بِعَدْلٍ بَلْ بِتَغْنِيَةِ الْـ　　مُرَافِعِيْنَ بِتَسْوِيْدِ الطَّوَامِيْرِ
يَقْضُوْنَ عِنْدَ خِصَامِ النَّاسِ بَيْنَهُمْ　　بِمَا يُؤَدِّيْ إِلَى بَخْسٍ وَتَخْسِيْرِ
وَيَأْخُذُوْنَ مِنَ الْخَصْمَيْنِ مَالَهُمَا　　أَجْراً عَلَى سَمْعِ إِقْرَارٍ وَتَقْرِيْرِ
وَأَيُّ مَظْلِمَةٍ أَنْهَى وَأَعْظَمُ مِنْ　　بَيْعِ الْقَضَاءِ بِعَقْوِيْمٍ وَتَسْعِيْرِ
يَأْتِيْهِمِ الْمَرْءُ مَبْثُوْراً وَيَرْجِعُ مَثْـ　　بُوْراً مُعَنًّى بِبِشْرٍ أَوْ بِتَبْشِيْرِ
ضَمُّوْا إِلَى الْجَوْرِ جَوْراً فِيْ مَحَاكِمِهِمْ　　فَلَقِّبُوا الْجَوْرَ بَعْدَ الضَّمِّ بِالْجَوْرِ
يَجْزُوْنَ قَطْعاً وَقِصَاصاً بِأَخْذِ الْدِّى　　فَيُطْلِقُوْنَ بِلَا حَدٍّ وَتَعْزِيْرِ
كَأَنَّهُمْ سَاهَمُوْا فِي السَّرْقِ فَاقْتَسَمُوْا　　وَاسْتَأْثَرُوْا بِنَصِيْبٍ مِنْهُ مَوْفُوْرِ
كَأَنَّمَا مَنْ جَنَى يَجْنِي لَهُمْ ثَمَراً　　يَحْظُوْنَ مِنْهُ بِإِثْمَارٍ وَتَثْمِيْرِ
فَإِنَّمَا سَعْيُهُمْ فِيْ أَخْذِ مُنْتَهَبٍ　　لِجَمْعِ خَيْرٍ لَهُمْ لَا مَنْعِ شِرِّيْرِ
وَلُّوا الْقَضَا كُلَّ نِحْرٍ مُبْطِلٍ بَطِلٍ　　يَمْضِي الْقَضَاءُ بِلَا حُكْمٍ وَتَقْدِيْرِ
يَقْنِيْ لَهُمْ نِقْرَةً مِمَّنْ يُنَاقِرُ إِذْ　　يُقْضَى عَلَيْهِ بِلَا بَحْثٍ وَتَنْقِيْرِ
فِيْ عَهْدِهِمْ سُدَّ بَابُ الصِّدْقِ وَانْفَتَحَتْ　　أَبْوَابُ كِذْبٍ وَبُهْتَانٍ وَتَزْوِيْرِ
فَلَيْسَ يَظْفَرُ إِلَّا مُدَّعِيْ كَذِبٍ　　وَلَا يُصَدَّقُ إِلَّا شَاهِدُ الزُّوْرِ
يَعُوْدُ كُلُّ صَدُوْقٍ نَادِماً حَصِراً　　وَالْعَدْلُ يُرْمَى بِتَزْوِيْرٍ وَتَشْهِيْرِ
وَلَا يَفُوْزُ الَّذِيْ يُقْضَى لَهُ أَبَداً　　بِمَا ادَّعَى مِنْ عَقَارٍ أَوْ قَنَاطِيْرِ
وَلَا يَنِيْ يَعْتَرِيْهِمْ طَاوِياً عَطِشاً　　لِأَجْلِ رِقٍّ رَدِيِّ الْحَظِّ مَنْشُوْرِ

مَنْ ظَلَّ يَقْضِيْ لَهُ يُقْضَى عَلَيْهِ فَمَا   قَضَاهُ غَيْرُ قَضَا لِلْحَيْنِ مَقْدُوْرِ
وَلْيَخْبِرْ حَالَ مَنْ يُقْضَى عَلَيْهِ بِمَنْ   يُقْضَى لَهُ فِيْ مُعَانَاةِ الْخَنَاسِيْرِ
عَتَوْا كَفُوْراً وَكُفْرًا مُعْتَدِيْنَ عَلَى الْـ   كُفَّارِ إِذْ أَسْلَمُوْا طَوْعاً بِتَكْفِيْرِ
يُقَدِّرُوْنَ خَرَاجاً بَعْدَ أَنْ مَسَحُوا الْـ   أَرَاضِ مَا بَيْنَ مِمْحَالٍ وَمَمْطُوْرِ
فَيَسْتَوِيْ فِي الْأَتَاوَى فِيْ جِبِلَّتِهِمْ   زَرْعٌ مَجُوْدٌ وَقُطْرٌ غَيْرُ مَقْطُوْرِ
أَقْوَتْ قُرًى وَبِلَادٌ مِنْ مَظَالِمِهِمْ   وَبَلْقَعَتْ وَتَخَلَّتْ مَا بِهَا طُوْرِيْ
يَشْرُوْنَ ظُلْماً لِإِسْتِيْفَاءِ مَا فَرَضُوْا   مَا لِلْمُلَّاكِيْنَ مِنْ أَرْضٍ وَمِنْ دُوْرِ
وَلَا يَرَوْنَ لَهُمْ حَقًّا فَمَا حَصَدُوْا   مِنْ زَرْعِهِمْ غَيْرَ حِرْمَانٍ وَتَخْسِيْرِ
لِيَقْدِرُوْنَ خَرَاجاً يَقْدِرُوْنَ بِهِ   شَجاً عَلَى مَنْ يُعَانِيْ هَمَّ تَبْلِيْرِ
قَدْ أَذْهَبَتْ بَرَكَاتِ الْأَرْضِ بِيُّهُمْ   فَلَيْسَ فِي الْحَرْثِ مِنْ رَيْعٍ وَتَوْفِيْرِ
مَا فِي الْفَلَاحَةِ لِلزُّرَّاعِ مِنْ فَلَحٍ   فَلَا يُرَى فِيْ قُرَاهُمْ غَيْرُ تَمْصِيْرِ
قَدْ تَبَّ مَنْ طُبَّ مِنْهُمْ فَهُوَ يَفْعَلُ كَيْ   يَشْكُوْ شَكَاءً بِلَا رَيْبٍ وَتَأْخِيْرِ
مَنْ حُمَّ حُمَّ لَهُ حِيْنُ الْحَمَامِ إِذَا السَّـ   سَاغُوْرُ يَشْعُرُ حِمَاهُ كَسَاغُوْرِ
يَحُمُّ حُمَّاهُ إِذْ يَسْقِيْهِ أَشْرِبَةً   تَزِيْدُهُ سَحَرًا فِيْ يَوْمِ بَاحُوْرِ
يَسْقِي الْعَلِيْلَ شَرَاباً مُسْهِلاً عَلَلا   وَلَا يُبَالِيْ بِأَنَّ الْيَوْمَ بَاحُوْرِيْ
بِالْجَمْرِ يُثْقِلُهُ حَتَّى إِذَا بَرِدَا   بِالْحُوْمِ خَفَّ خَلِيًّا غَيْرَ مَحْسُوْرِ
وَيْلَاهُ مِنْ خَاسِرٍ يُرْبَى لَهُ خَتَرًا   يُسْقَى مَا لَيْسَ يُرْبِيْ غَيْرَ تَخْتِيْرِ
لَمْ يَبْقَ فِيْهِمْ مِنَ الرُّهْبَانِ مِنْ أَثَرٍ   إِلَّا تُرَوِّعُهُمْ مِنْ كُلِّ سَاغُوْرِ
وَكَيْفَ لَا يَخْشَى قَاتِلٌ أَمِنُ التَّـ   تَعْزِيْرِ بَلْ فَازَ إِذْ أَرْدَى بِتَعْزِيْرِ
لَا تَفْهَمَنْ مِنْ كَلَامِيْ أَنَّهُمْ خَمَسٌ   فَلَيْسَ ذَا شَأْنُ عُوَّارٍ عَوَاوِيْرِ
بَلْ هُمْ أُسُوْدٌ عَلَى مَنْ يَسْتَكِيْنُ وَإِنْ   كَانُوْا نَقَادًا لَدَى إِلْمَامِ مَحْذُوْرِ
لَوْ طَارِقٌ يَعْتَرِيْهِمْ كَيْ يُجَادِلَهُمْ   كَأَجْدَلٍ يَتَقَضَّى فِيْ عَصَافِيْرِ
تَعَارَضُوْهُ وَمَا أَنْ عَارَضُوْهُ وَلَـ   كِنْ يَمْكُرُوْنَ بِهِ مَكْرَ الْعَلَابِيْرِ

رِجَالُهُمْ كَنِسَاءٍ فِي الْعِرَاكِ كَمَا   فُرْسَانُهُمْ كَرِجَالٍ فِي الْمَضَامِيرِ
يَلْغُونَ عَادُونَ مَا عَالُوا الرُّكُوبَ عَلَى   بَاغٍ وَعَادٍ وَسَبَّاقٍ وَمِخْضِيرِ
فُرُوسُهُمْ حِجْرٌ غُرٌّ مُذَلَّلَةٌ   قَدْ ضَمَّرُوهَا ضَنَانًا أَيَّ تَضْمِيرِ
هَيَاكِلُ ضُمَّرٌ جِدًّا يُخَيِّلُهَا الرَّ   ائِي هَيَاكِلَ تَبْقَى مِنْ تَصَاوِيرِ
اِسْتَعْمَلُوهَا كَثِيرًا إِنْ تُنَاطُ بِهَا الْـ   حِجَالُ تُرْخَى لِإِخْرَاجِ التَّدَاوِيرِ
لَا يَمْلِكُ الْخَيْرَ أَحْرَارُ اللِّئَامِ وَلَا   يَفْنَى جَوَادٌ بِسُوحِ الْبُخْلِ الْبُورِ
وَلَا يَرِيبُكَ فِي هٰذَا تَسَلُّطُهُمْ   فَإِنَّ ذَاكَ مَنُوطٌ بِالْمَقَادِيرِ
اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ يُؤْتِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا   قَدْرٌ لِعَبْدٍ بِلَا قَدْرٍ بِمَقْدُورِ
كَمْ أَرْذَلٌ جُبَّأٌ نَالَ الْمَنَالَ وَكَمْ   زُورٍ مَكِينٍ مَتِينِ الزُّورِ بِلَا زُورِ
لَمْ يُجْدِهِ الْعَقْلُ غَيْرَ الْإِعْتِقَالِ وَلَا   تَدْبِيرُهُ غَيْرَ إِدْبَارٍ وَتَتْبِيرِ
وَلَمْ يُفِدْهُ هَمُّهُ غَيْرَ الْهُمُومِ وَلَا   غَارَاتُهُ غَيْرَ تَغْيِيرٍ وَتَغْوِيرِ
لَمَّا خَلَا الْهِنْدُ عَنْ وَالٍ يَقُومُ [بِهَا]   أَثَارَ فِيهَا فَسَادًا كُلُّ عِلْنِيرِ
بَغَى عَلَى مُلْكِهَا عُمَّالُهُ وَطَغَوْا   فَكَلَّفُوهُ بِتَحْرِيرٍ وَتَعْزِيرِ
تَقَاسَمُوا مُلْكَهُ بِالْبَغْيِ اِقْتَتَلُوا   وَكَدَّرُوهُ بِإِلْحَادٍ وَتَغْيِيرِ
تَنَاكَرُوا وَأَتَوْا بِالنُّكْرِ وَابْتَغَوُا النَّـ   ـفَاقَ وَاسْتَنْكَرُوا رَأْيَ الْمَنَاكِيرِ
لَقَدْ تَقَاتَلُوا وَمَا قَاتَلُوا لِفِتْنَتِهِمْ   أَخْنَتْ عَلَى قَاسِرٍ مِنْهُمْ وَمَقْسُورِ
لَمْ يَبْقَ فِي الْمُلْكِ مِنْ مَلِكٍ يُطَاعُ سِوَى   مُؤَمَّرٍ إِمَّرٍ لِلْبُلْهِ مَأْمُورِ
يَرَاعَةٍ وَيَرَاعٍ لَمْ تَنَلْ يَدُهُ الْـ   يَرَاعَ قَطُّ لِرَمْيٍ أَوْ لِتَحْرِيرِ
عَادَى الْعُلُومَ وَعَادَ الْجَهْلَ يَحْسِبُهُ   أَجْدَى وَأَغْوَرَ مِنْ عَقْلٍ وَمَشْعُورِ
فَلَا يَصِيرُ إِلَى الصُّوَرِ لِكُرْتِهِ   وَلَا يَصِيرُ إِلَى عَقْلٍ وَصُورِ
أَمَّا الْوَزِيرُ فَمَا مِنْ وِزْرِهِ وَزَرٌ   وَيْلَاهُ مِنْ وَازِرِ الْأَوْزَارِ مَوْزُورِ
لَمَّا تَنَاهَوْا تَفَانَوْا ثُمَّ أَعْقَبَهُمْ   فِي الْأَمْرِ مَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلًا لِتَأْمِيرِ
خُلِّفَتْ خَوَالِفُ زَادُوا فِي الْعَوَارِ وَقَدْ   عَادُوا بِخُلْفٍ وَإِخْلَافٍ وَتَغْوِيرِ

لَمْ يَجْبُرُوا قَطُّ مَكْسُورًا وَمُفْتَقِرًا ... بَلْ كُلُّهُمْ بَيْنَ جَبَّارٍ وَجِبِّيرِ
صَارُوا سَمَادِيرَ مُلَّاكًا وَهُمْ هُجَعٌ ... عَنِ الرَّعِيَّةِ سَكْرَى فِي سَمَادِيرِ
مَالُوا عَنِ الْعَدْلِ وَالتَّعْدِيلِ وَانْعَدَلُوا ... عَنِ الْحِوَارِ إِلَى نَوْمٍ وَتَغْوِيرِ
تَقَعْدَدُوا عَنْ قِيَامِ الْأَمْرِ وَإِنْ نَهَضُوا ... قَامُوا كُسَالَى لِشَمْرٍ لَا لِتَشْمِيرِ
لَكِنْ قَدِ اعْتَصَرُوا الْأَمْوَالَ وَاعْتَصَرُوا ... وَأَسْرَفُوا فِي عَصِيرٍ أَوْ مَعَاصِيرِ
أَلْهَاهُمُ الْبُؤْسُ عَنْ بَأْسٍ فَقَدْ رَغِبُوا ... فِي الْكَأْسِ وَالْكِيسِ عَنْ كَيْسٍ وَتَدْبِيرِ
لَهَوْا بِلَهْوٍ وَلَهْوٍ عَنْ مُجَاهَدَةِ الْـ ... غُزْوَانِ وَالْجِدِّ فِي رَعْيِ الْجَمَاهِيرِ
لَهَوْا بِبَعْضِ الْبَغَايَا عَنْ قَيَادِيهَا ... كَمَا لَهَوْا عَنْ صِيَانِ السُّورِ بِالسُّورِ
تَهَكَّمُوا وَتَلَهَّوْا بِالتَّهَكُّمِ وَالتَّـ ... ـهَكِيمِ وَالسُّخْرِ عَنْ جِدٍّ لِتَسْخِيرِ
طَرَائِقُ قِدَدًا لَكِنْ جَمَعْنَ عَلَى ... تَيْهٍ وَتَيْهٍ وَإِنْحِدَارٍ وَتَغْلِيرِ
فَمِنْ ضَرِيرٍ ضَرِيرٍ لَا يَضُرُّ وَلَا ... يُجْدِي وَإِنْ كَانَ مَدْعُوًّا بِسُمْلُوزِ
فَمِنْ ثَقِيلٍ خَفِيفِ الرَّأْسِ مُتَّضِعٍ ... وَمِنْ رَقِيعٍ رَفِيعِ الْقَدْرِ جِنِّيرِ
وَمِنْ جَدِيدٍ بَلَا فِي الْهَزْلِ جِلَّتَهُ ... بِالْجِدِّ مُنْجَلِبٍ بِالْجَدِّ فِخِّيرِ
وَمِنْ ضَجُوعٍ ضَجِيعِ الضَّجُوعِ وَمِنْ ... مُضَجَّعٍ عَاذِرٍ فِي السَّتْرِ مَخْدُورِ
وَبُزْهَةٍ بَهْصَمِيٍّ لَا يَبُوءُهُ بِمَا ... يَغْنِي مُبَاهٍ مُبَاهِ الْحُرِّ وَالْحُورِ
وَمِنْ خَسِيسٍ يُبَاهِي الْجَوَادَ وَمِنْ ... فِيلٍ عَلَى الْفِيلِ فِيلِ الرَّأْيِ زُغْرُوزِ
وَمِنْ حَلِيمٍ بِلَا حِلْمٍ يُسَاهِلُ مَنْ ... يَغْصِبُهُ مِنْ أَجْلِ وَفْرٍ لَا لِتَيْفُوزِ
وَحَاكِمٍ مَالَهُ حُكْمٌ وَلَيْسَ لَهُ ... أَنْ يَحْكُمَ النَّاسَ عَنْ شَرٍّ وَتَحْوِيرِ
وَمِنْ غَلِيظٍ رَقِيقِ الدِّينِ ذِي فَظَظٍ ... وَمِنْ رَقِيقٍ رَقِيقِ الْقَلْبِ مَلْغُوزِ
وَطَائِشٍ لَمْ يُصِبْ بَلْ طَاشَ أَسْهُمُهُ ... مُغَلْمِرٌ مُسْتَخِفٌّ ذُو غَذَامِيرِ
وَفَاجِرٍ ذِي فُجُورٍ غَيْرَ ذِي فَجَرٍ ... يُوَدِّرُ الْمَالَ [دَوْرًا] أَيَّ تَوْدِيرِ
وَقَاصِرٍ قَصَّرَتْ فِي الْقَصْرِ هِمَّتُهُ ... يَوَدُّ تَطْوِيلَ تَغْمِيرٍ لِتَغْمِيرِ
وَالْبَعْضُ ذُو خَرَبَاتٍ هَيِّرٌ خَرِبٌ ... دِينًا يَجِدُّ لِتَخْرِيبٍ وَتَهْوِيرِ

تَبَا حَالُهُمْ وَالنَّصَارَى حَوْلَهُمْ خَوَلٌ ... يَسْعَوْنَ فِي الْبَيْنِ فِي سَعْيٍ وَتَوْغِيرِ
فَخَامَرُوا مُلْكَهُمْ بَلْ خَامَرُوا مَعَهُمْ ... يُخَمِّرُونَ نُهَاهُمْ أَيَّ تَخْمِيرِ
سَرَوْا سُرَى غَفْلَةٍ فِي أَعْيُنٍ نُعُسٍ ... أَوْ سَوْرَ مَشْمُولَةٍ فِي رَأْسِ مِسْكِيرِ
تَدَاخَلُوا دَخَلًا فِي كُنْهِ دُخْلِهِمْ ... وَغَفَّلُوهُمْ بِتَسْكِينٍ وَتَسْكِيرِ
قَدْ سَكَّرُوهُمْ وَفَلُّوا حَدَّ شَوْكَتِهِمْ ... وَأَوْهَنُوا بِتَسْكِيرٍ وَتَنْكِيرِ
فَبَعْدَمَا انْكَسَرَتْ أَعْضَاؤُهُمْ جُبِرُوا ... وَأَصْبَحُوا بَيْنَ مَكْسُورٍ وَمَجْبُورِ
لَا يُمْكِنُ الرَّعْيُ إِلَّا بِالتَّيَقُّظِ لَا ... يُغْنِي غَافٍ بِرَاحِ الرَّاحِ مِسْكِيرِ
كَأَنَّمَا نَامَ فِي جُحْرِ الْأَسَاوِدِ مَنْ ... أَغْفَى وَنَامَ إِلَى يَقْظَانَ خِنِّيرِ
يُسَوِّلُونَ وَيَحْتَالُونَ مِنْ دَغَلٍ ... وَيَمْكُرُونَ لِتَهْوِيلٍ وَتَبْشِيرِ
وَنَقَّرُوا بَيْنَهُمْ كَسْرًا لِنُفْرَتِهِمْ ... وَأَنْقَرُوا لِخِدَاعٍ كُلَّ مَنْقُورِ
تَحَمَّلُوا كُلَّ كَلٍّ كَانَ يُثْقِلُهُمْ ... وَنَسَّقُوا فِي نِظَامٍ كُلَّ مَنْثُورِ
فَمَلَّكُوهُمْ قِيَادَ الْأَمْرِ وَائْتَمَرُوا ... لَهُمْ رِجَاءً لِتَأْيِيدٍ وَتَأْزِيرِ
وَمَكَّنُوا مِنْ مَلَاكِ الْمُلْكِ قَادَتَهُمْ ... وَمَكَّنُوا جَيْشَهُمْ فِي الْقَصْرِ وَالسُّورِ
وَهَؤُلَاءِ تَوَلَّوْهُمْ لِمَصْلَحَةِ الْـ ... إِفْسَادِ ثُمَّ تَوَلَّوْا بَعْدَ تَوْدِيرِ
وَنَكَّرُوا بَعْدَ طُولِ الْعَهْدِ أَنْفُسَهُمْ ... وَبَدَّلُوا كُلَّ تَسْهِيلٍ بِتَوْعِيرِ
فَإِنَّمَا ظَفَرُوا بِالْهِنْدِ إِذْ ظَفَرُوا ... بِالْكَيْدِ وَالزُّورِ لَا بِالْأَيْدِ وَالزُّورِ
أَسِيَانَتَكَانُوا قُبَيْلَاتُمَّ إِذْ مَلَكُوا ... لَمْ يُلْفَ فِيهِمْ سِوَى عَاتٍ وَتَيْهُورِ
لَا يَقْدِرُونَ ذَوِي الْأَقْدَارِ إِذْ قَدَرُوا ... بَلْ يَقْدِرُونَ عَلَيْهِمْ كُلَّ تَقْدِيرِ
أُولُو الْحَسَابَةِ فِي حُسْبَانِهِمْ سُفَلٌ ... وَالْأَلْوَنَ أَهْلٌ لِإِحْسَابٍ وَتَوْقِيرِ
يَرْنُونَ قَدْرًا وَيُرْنَى قَدْرُهُمْ صَغَرًا ... يَاوَيْلَهُمْ مِنْ مَنَاكِيلِمَضَاجِيرِ
تَحَلَّمُوا عِنْدَ تَمْعِيرٍ فَإِذْ خَبَرُوا ... لَمْ يُلْفَ مِنْهُمْ سِوَى غَضْبَانَ مَغْرُورِ
أَرْدَى أَتَاوَاهُمُ الزُّرَّاعَ فَانْقَلَبُوا ... غَصْبًا حَصِيدًا فَأَوْدُوا بَعْدَ تَنْضِيرِ
مَغْنَى عَدَالَتِهِمْ ظُلْمٌ فَلَيْسَ هُنَا ... نَهْبٌ بِإِثْمٍ وَلَا سُحْتٌ بِمَحْظُورِ

قَدْ أَخْرَفُوا وَاعْتَنَوْا بِالْاِخْتِرَافِ لِكَيْ … يُلْقُوا أُولِي الْحِرْفِ فِي خُرْفٍ وَتَقْتِيرِ

فَلَيْسَ فِي الْغَزْلِ جَدْوَى لِلْعَجُوزِ وَلَا … لِحَائِكٍ أُجْرَةٌ فِي النَّسْجِ وَالنِّيرِ

دَارَتْ رَحَاهُمْ عَلَى الطَّحَّانِ فَانْقَلَبَتْ … رَجَاهُ مِنْهَا طَحِينًا فِي رَحَى الْحُورِ

هُمْ أَصْفَرُوا الْهِنْدَ عَنْ صُفْرٍ وَلَمْ يَذَرُوا … إِلَيْهَا مُصْفِرٍ مُقْوٍ وَمَصْفُورِ

لَا يَفْرِضُونَ نِصَابًا لِلزَّكَاةِ بَلِ الزَّ … زَكَاةُ مَفْرُوضَةٌ فِي كُلِّ مَنْزُورِ

يَأْتِي سُعَاتُهُمُ السَّاعُونَ إِنْ بَلَغُوا … شَيْئًا وَلَوْ كَانَ مِنْ أَدْنَى مَقَادِيرِ

كَجَفْنَةِ الْمِلْحِ وَالْقِنْدِيدِ فَاعْتَصَرُوا … وَمَرَّرُوا عَيْشَ كُلِّ أَيَّ تَمْرِيرِ

لَا يَسْتَحِقُّ الْمَسَاكِينُ الزَّكَاةَ فَلَا … يُعْطُونَهَا غَيْرَ أَرْبَابِ الْمَوَاخِيرِ

عَادَ الدَّنَانِيرَ سَاعِيهِمْ فَيَسْمَعُهَا … خَرْقًا وَيُلْقِي الرَّعَايَا فِي دَقَارِيرِ

وَبَلَاهُ مِنْ أَخْرَقٍ دُونٍ غَمٍ نَكِدٍ … خُرْمٍ لَئِيمٍ خَبِيثِ النَّفْسِ فَاجُورِ.

هَذَا أَوَائِلُ اِسْتِيلَائِهِمْ وَلَهَا … صِبْرٌ وَفِيهَا رَزَايَا ذَلِكَ الصَّبْرِ

آثَرْتُ بِالْآثْرِ نَبْذًا مِنْ مَآثِرِهِمْ … وَكَمْ لَهُمْ مِنْ فَخَارٍ غَيْرِ مَأْثُورِ

أَجْمَلْتُ فِي وَصْفِ إِجْمَالَاتِهِمْ حَصَرًا … فَلَيْسَ تَفْصِيلُ حُسْنَاهُمْ بِمَحْصُورِ

حَصِرْتُ عَنْ حَصْرٍ وَصْفِ الْحَصْرِ وَالْحَصَرِ … لَـلِيْنَ فِيهِمْ عَلَا كُلَّ التَّفَاسِيرِ

لَمْ أَخْتَلِقْ فِي حَدِيثِي عَنْ خَلَائِقِهِمْ … بَلْ لَمْ أُثْبِتْ صِدْقَ تَخْبِيرِي بِتَخْبِيرِ

مَا ارْتَبْتُ رَيْبًا فَلَنْ يَرْتَابَ مَخْبِرَتِي … إِلَّا الَّذِي رَابَ رَوْبًا فِي أَخَابِيرِي

لَكِنَّنِي قَاصِرٌ فِي وَصْفِهِمْ فَلَئِنْ … رَأَوْا عَلَيَّ عِتَابًا ضَاقَ تَعْذِيرِي

فَلْيَعْذِرُونِي وَإِنْ لَمْ تَجْرِ عَادَتُهُمْ … بِعَفْوِ مُعْتَذِرٍ يَأْتِي بِتَقْصِيرِ

جَلَّى لَنَا اللَّهُ عَنْ إِظْلَامِ ظُلْمِهِمِ الدْ … دَاجِي بِفَلَقِ تَبَاشِيرِ التَّبَاشِيرِ

□□□

ضمیمہ (4)

قصیدۂ نونیہ☆

[دربیان جنگ آزادی 1857]

مَا نَاحَ أَوْرَقُ فِيْ أَوْرَاقِ أَغْصَانِ   إِلَّا وَهَيَّجَ أَشْجَانِيْ وَأَشْجَانِيْ

(1) ادھر کبوتر شاخ کے پتوں پر بولا اُدھر اس کی (درد بھری) آواز نے میرے نہاں غموں کو ابھار کر مجھے رنجیدہ و غمگین کر دیا۔

وَمَا هَمَى عَارِضٌ إِلَّا وَعَارَضَهُ   طَرْفِيْ فَقَابَلَ هَتَّانًا بِهَتَّانِ

(2) جب پیہم برسنے والا بادل برسا تو میری آنکھوں نے (اشکباری میں) اس کا مقابلہ کیا پھر کیا تھا مسلسل برسنے والا بادل اور لگا تار آنسو بہانے والی آنکھ ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے۔

مَا الْبَرْقُ بَرْقٌ بَدَا إِلَّا وَمَثَّلَ لِيْ   بَرِيْقُهُ ضَحْكَ بَسَّامٍ فَأَبْكَانِيْ

(3) آسمانی بجلی روشنی چمک کر ظاہر ہوئی تو اس کی روشنی و چمک نے میرے سامنے ہمیشہ مسکرانے والے محبوب کے مسکرانے کی تصویر کھینچ کر مجھے اشک ریزی پر مجبور کر دیا۔

☆ اس قصیدے کے ترجمے میں مولانا دلشاد احمد قادری (استاذ مدرسہ قادریہ بدایوں) سے مدد لی گئی ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر سلمہ سیہول کی کتاب "علامہ محمد فضل حق خیر آبادی" میں اس قصیدے کا صرف متن شائع ہوا تھا۔ قصیدے کا باضابطہ ترجمہ پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔

إِنْ صَلْصَلَ الرَّعْدُ فِي الْآفَاقِ جَاوَبَهُ   حَنِيْنُ صَبٍّ إِلَى الْأَحْبَابِ حَنَّانِ

(4) بجلی افق پر گرجی تو فوراً اس عاشق زار کی غمزدہ آواز نے اس کی کڑک اور گرج کا جواب دیا جو وصالِ یار کا مشتاق و متمنی ہے۔

إِذَا سَحَابٌ هَمُوْمٌ صَابَ صَابَ بِهِ   قَلْبِيْ هُمُوْمٌ بِهَا يَنْهَمُّ جُثْمَانِيْ

(5) جب پانی سے لبریز بادل برستا ہے تو میرے دل کے وہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے میرا جسم اندر سے گھلا جا رہا ہے۔

إِنْ جَادَ جَوْدٌ بِجُدٍّ عَيْنِيْ وَجَادَنِيَ الْـ   هَوَى وَجَدْتُ بِنَفْسِيْ أَجْلَ تَوْقَانِيْ

(6) اگر موسلادھار بارش ہوئی تو آنکھیں بہت اشکباری کریں گی اور اگر مجھ پر عشق و وارفتگی چھا گئی تو میں شوقِ وصال میں اپنی جاں فدا کر دوں گا۔

يُرْبِي الْغَمَامُ غُمُوْمًا وَالْهَوَاءُ هَوًى   وَالْوَبْلُ كُلُّ وَبَالٍ لِلشَّجِي الْعَانِيْ

(7) بادل حزن و ملال میں اضافہ کر دیتے ہیں اور سرد ہوائیں سوزشِ عشق میں شدت کا باعث بن جاتی ہیں اور تیز بارش تو غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے عاشق کے لیے سراپا عذاب ہے۔

يَحِيْنُ حِيْنُ حِمَامِيْ بَلْ أُحِيْنُ إِذَا   شَكَا حَمَامٌ أَذَى بَيْنٍ عَلَى بَانِ

(8) میرا وقتِ اجل قریب ہے، بلکہ میں تو اس وقت ہلاک ہی ہو گیا جب ''بان'' کے درخت پر کبوتر نے نالہ فراق شروع کیا۔

إِذَا تَبَلْبَلَ أَلْحَانُ الْبَلَابِلِ بَلْـ   بَلَ الْبَلَابِلُ بَالِيْ بَلْ وَجُثْمَانِيْ

(9) جب بلبلوں کی خوش الحان آوازیں باہم ٹکراتی ہیں تو سوزشِ عشق کی شدت میرے قلب و جگر کو چھلنی اور میرے جسم کو غموں سے نڈھال کر دیتی ہیں۔

قَدْ عَبَّرَتْ عَبَرَاتِيْ عَنْ هَوًى وَجَوًى   وَشَانَ تَذْرَافُ شَأْنِيْ فِي الْوَرَى شَأْنِيْ

(10) سوزشِ عشق کے باعث میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور رگِ چشم سے اشک ریزی نے میری عزت و آبرو میں بٹا لگا دیا۔

وَنَمَّتْ عَلَيَّ بِشَأْنِيْ مُقْلَةٌ وَكَفَتْ   سَحَّاحَةً وَكَفَتْ مَا شَانَهُ الشَّانِيْ

(11) آنکھوں کی پیہم اشکباری نے میرے درونِ حال پر چغلی کھائی اور میرے دشمن و حریف کی

عیب گیری سے وہ بے نیاز و بے پرواہ ہوگئی۔

يَزِيدُ كُلُّ زَمَانٍ مِنْ أَسَى زَمِنٍ　　كَلَّ يَكِلُّ بِحُوبِ الْحُزْنِ حَزْنَانِ

(12) ہر زمانہ کمزور و ناتواں کے درد والم میں اضافہ ہی کرتا ہے اور وہ زمانہ کا ستایا ہوا غموں کی وحشت سے تھک ہار جاتا ہے۔

إِنْ بِتُّ لَيْلًا جَفَانِيْ طُوْلُهُ وَسَنَى　　كَأَنَّ أَنْجُمَهُ نِيطَتْ بِأَجْفَانِيْ

(13) میں ایک رات سویا تو اس رات کی درازی مجھ پر گراں گزری گویا کہ اس کے ستارے میری آنکھوں سے باندھ دیے گئے۔

يَغُمُّنِي اللَّيْلُ كَالْيَوْمِ الْمُغِمِّ بِمَا　　يَحْكِيْ جَهَنَّمَ فِيْ حَرٍّ وَّلَفْحَانِ

(14) رات مجھے اس گرم وسخت دن کے مانند ستاتی ہے جو حرارت اور جھلسانے میں دوزخ کی طرح ہے۔

قَدْ أَسْخَنَ الْعَيْنَ فِي الظَّلْمَاءِ أَنْجُمُهَا　　كَأَنَّهُنَّ شَرَارٌ بَيْنَ دُخَّانِ

(15) اندھیرے میں آنکھ کو رات کے ستاروں نے اس قدر رلایا گویا کہ وہ ستارے دھواں کے درمیان اڑتی ہوئی چنگاریاں ہوں۔

قَدْ طَالَ لَيْلِيْ فَلَا يُرْجَى تَمَامَتُهُ　　كَأَنَّهُ مِنْ لُبَانَاتِيْ وَأَشْجَانِيْ

(16) میری رات اس قدر طویل ہوگئی کہ اس کے ختم ہونے کی امید نہیں ہے گویا کہ وہ رات میرے رنج وغم کا ہی ایک حصہ ہو۔

وَصُدَّ عَنِّيْ تَبَاشِيْرُ الصَّبَاحِ كَمَا　　صُدَّتْ تَبَاشِيْرُ صَبَّاحٍ بِلُقْيَانِيْ

(17) صبح کے ابتدائی خوشگوار لمحات مجھ سے روک دیے گیے جیسا کہ خوب صورت محبوب کی خوش خبری میرے پاس آنے سے روک دی گی۔

كَأَنَّ كُلَّ زَمَانٍ لِلزَّمِيْنِ دُجَى　　لَيْلٍ وَمَا صُبْحُهُ فِيْ عَدِّ أَزْمَانِ

(18) عاجز و درماندہ کے لیے تو ہر زمانہ سیاہ رات ہے اور اس کی روشن صبح کا شمار کسی زمانے میں نہیں ہے۔

يَوْمِيْ كَلَيْلٍ دَجِيٍّ ذُوْ كَوَاكِبَ أَوْ　　لَيْلِيْ كَيَوْمٍ مُغِمٍّ غَمَّ سَخْنَانِ

(19) میرا دن سیاہ شب کی مانند ہے اور میری شب اس گرم و سخت دن کے مثل ہے، جس کی گرمی کی شدت و حرارت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

يَوْمُ الْجَوِيْ لَهَبَانٌ ضَوْؤُهُ لَهَبٌ　　وَلَيْلُهُ ظِلُّ يَحْمُوْمٍ وَأَغْفَانِ

(20) عاشق زار کا دن چلچلاتی گرمی ہے اور اس کی روشنی دہکتے شعلے ہیں اور اس کی رات گرمی اور دھواں کے سایے ہیں۔

اِخْضَرَّ لَيْلِيْ لِحُسْنٍ أَحْمَرَ خَضِرٍ　　وَابْيَضَّ عَيْنِيْ وَدَمْعِيْ أَحْمَرُ قَانِ

(21) میری رات سرخ و سبز کے حسن امتزاج سے سیاہ ہوگی اور میری آنکھ (روتے روتے) سفید ہوگئی اور میرے آنسو گہرے سرخ ہوگئے۔

تَلَمَّاحُ عِقْدِ الثُّرَيَّا فِيْهِ يُذْكِرُنِيْ　　نِظَامَ دُرٍّ يُحَلِّيْ فَرْعَ فَيْنَانِ

(22) عقد ثریا (تاروں کے جمگھٹ) کی چمک مجھے موتی کی اس لڑی کی یاد دلا رہی ہے جو لمبے بالوں والے محبوب کے بالوں کو زینت بخشتی ہے۔

فَيْنَانُ فَرْعٍ أَثِيْثٍ فَنَّ مِنْ سَمَةٍ　　أَفْنَانُ دَلٍّ فَدَلَّانِيْ بِأَفْنَانِ

(23) وہ لمبے بالوں والا محبوب جس کے گھنے اور گھنگرالے بال اس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں، وہ ہوش ربا حسین و جمیل جس نے اپنے دراز گیسو سے مجھے لوٹ لیا۔

إِذَا نَشِيْتُ أَرِيْجًا مِنْهُ أَوْ خَبَرًا　　نَشِيْتُ مِنْ سَكْرَةٍ لَا خَمْرَ سَكْرَانِ

(24) جب میں اس محبوب کی خوشبو سونگھتا ہوں اور مجھے اس کے آنے کا علم ہوتا ہے تو میں نشہ سے مست ہو جاتا ہوں اور یہ نشہ شرابی کی شراب میں نہیں ہے۔

نَشْوَانُ نَشْوَتُهُ نَشْرٌ وَرِيْقَتُهُ　　[نَشْوٌ] فَمَنْ يَهْوَهُ اسْتَهْوَاهُ نَشْوَانِ

(25) (میرا محبوب) ایسا مست ہے کہ اس کی خوشبو اور لعاب بھی نشہ آور ہے جو اس سے دل لگاتا ہے تو یہ دونوں نشے (خوشبو اور لعاب) اس کی عقل کو سلب کر کے اسے سرگشتہ و سرمست کر دیتے ہیں۔

نَشْوَانُ مَنْ ذَاقَ خَمْرَ الرِّيْقِ مِنْهُ فَلَا　　يَصْحُوْ وَإِنْ كَانَ يَصْحُوْ كُلُّ نَشْوَانِ

(26) میرا محبوب ایسا مست ہے کہ جس نے اس کی جھوٹی شراب چکھ لی تو اس کا نشہ کبھی نہیں اترے گا (یعنی وہ کبھی ہوش میں نہیں آئے گا) اگرچہ ہر مست و شرابی کا نشہ اتر جاتا ہے۔

هِجْرَانُهُ سَكْرَةٌ لُقْيَانُهُ سَكَرٌ فَالْعَيْشُ وَالْمَوْتُ فِيْ وَصْلٍ وَهِجْرَانِ

(27) اس سے جدائی موت ہے اور اس کا وصال نشہ آور ہے لہٰذا موت و زیست، ہجر و وصال کے درمیان ہچکولے کھا رہی ہے۔

يَبِيْتُ فِيْ مِنَةٍ عَنْ كِلْفِهِ الدَّنِفِ السْـ سَهْرَانَ وَيْلَاهُ مِنْ مَيْسَانَ مِيْسَانِ

(28) وہ (ظالم محبوب) اس ناتواں، بیمار عاشق سے غافل و بے پرواہ ہو کر (مزے سے) رات گزار رہا ہے جو (اس کے فراق میں) جاگا کرتا ہے ہائے افسوس اس تابناک بیدار کرنے والے ستارے پر۔

غَضٌّ غَضِيْضٌ غَضِيْضُ الطَّرْفِ فَاتِرُهُ وَلَا فُتُوْرَ لَهُ فِي الْفَتْكِ بِالرَّانِيْ

(29) وہ نازک اندام، تر و تازہ، نیم باز نگاہوں والا ہے مگر نیم نظروں کے تیر سے قتل و غارت گری میں ضعیف و لاغر نہیں ہے۔

عَدْلٌ ظَلُوْمٌ عَدِيْمُ الْعِدْلِ يَهْتَضِمُ الْـ كِلْفَ الْهَضِيْمَ هَضِيْمُ الْكَشْحِ خَمْصَانِ

(30) وہ سخت، بے نظیر پتلی کمر اور دبلے پیٹ والا معشوق اپنے کمزور و نحیف عاشق پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا ہے۔

أَحَرُّ حُسْنًا وَلٰكِنْ ثَغْرُهُ بَرِدٌ بِالْبَرْدِ وَالْبَرْدُ يَشْفِيْ حَرَّ حَرَّانِ

(31) وہ حسن و جمال کے رُو سے گرم ہے لیکن اس کے دانت ٹھنڈے ہیں اور ٹھنڈک ہی سخت پیاسے کی تشنگی کو شفا دیتی ہے۔

وَيْلَاهُ مِنْ مِلْهَبٍ يُذْكِيْ لَهِيْبَ جَوًى وَبَرْدُهُ الْعَذْبُ يُطْفِيْ لَهْبَ لَهْبَانِ

(32) ہائے حسن کی دلکشی و رعنائی! یہ ہی عشق کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے اور اس حسن کی میٹھی ٹھنڈک پیاسے کی آگ کو بجھاتی ہے۔

مَنْ ذَاقَ سَلْوَى اللَّمَى الْحُلْوَ الْبَرُوْدَ فَلَا يَلُوْقُ بَرْدًا وَلَا يَسْلُوْ بِسُلْوَانِ

(33) جس نے (ایک بار) اس میٹھے سرد گندمی ہونٹ کے شہد کو چکھ لیا تو پھر اس کے لیے ہر سرد چیز بے ذائقہ ہو جائے گی اور "سُلوان" (ایک دوا) سے بھی اسے تسلی نہیں ملے گی۔

خَوْدٌ تُقَتِّلُ إِذْ مَاسَتْ تُقَتِّلُ فِيْ تَخْوِيْدِهَا كُلَّ إِنْسَانٍ بِمَيْسَانِ

(34) وہ پری پیکر اپنی نازک خرامی سے قتل کرتا ہوا چلتا ہے اور اپنی چال سے ہر اس شخص کو قتل کرتا ہے جو اس پری پیکر کے حصول سے مایوس ہو چکا ہے۔

رَقْرَاقَةٌ تَنْتَرِقُ الْعَيْنَ رِقَّتُهَا   بَرَّاقَةٌ بَرْقُهَا بَرْقٌ لِأَغْيَانِ

(35) وہ ایسا چمک دمک والا ہے کہ اس کی چمک سے آنکھ خیرہ ہو گئی، وہ درحقیقت ایسی بجلی والی بدلی ہے جس کی چمک آنکھوں کے لیے روشنی ہے۔

بَهْنَانَةٌ نَشْرُهَا نَشْرٌ لِمَنْ قَتَلَتْ   وَهْنَانَةٌ هُوْنُهَا هَوْنِي وَإِنْهَالِي

(36) وہ نرم خو، خوش مزاج ہے، اس کی پاکیزہ خوشبو اپنے مقتول کو زندگی عطا کرتی ہے، وہ نازو نعم میں پرورش کی بنا پر بہت نازک مزاج ہے اس کی شدت میرا سکون بھی ہے اور مجھے کمزور بھی کرتی ہے۔

خَضْرَاءُ زَافِنَةٌ حَمْرَاءُ رَاقِنَةٌ   يَجْفُوْ تَلَوُّنُهَا الضَّمْنَى بِأَلْوَانِ

(37) اس کی چال گویا رقص کے مشابہ ہے، اس کے رنگ میں سیاہ وسفید کی آمیزش ہے اور اپنے رنگ کے تلون سے وہ عاشق کو مرض (عشق) میں مبتلا کرتا ہے۔

حُمِّلْتُ ظُلْمَ تَثَنِّيهَا فَأَهْلَكَنِي   وَذُقْتُ ظَلْمَ ثَنَايَاهَا فَأَحْيَانِي

(38) میں نے اس کی دلفریب بل کھاتی چال کے بارگراں کو اٹھایا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا پھر میں نے اس کے دندانِ بالا کی چاشنی چکھی تو اس مٹھاس نے مجھے زندہ کر دیا۔

إِنْ خَاطَبَتْ ظَامِئًا يَظْمَأْ إِلَى الشَّفَةِ الظَّـ   ـمْيَا شَفَتْهُ وَزَادَتْ ظَمْأَ ظَمْآنِ

(39) اگر وہ پری زاد کسی ایسے تشنہ کام سے بالمشافہ کلام کرے جو اس کے لب کا شائق ہو تو وہ اس کو شفایاب بھی کرے گا مگر اس پیاسے کی پیاس میں اضافہ بھی کر دے گا۔

كَمْ أَلْطَفَتْنِي بِجَنْبَيْهَا مُلَاطَفَةً   سَقْيًا لِسَاقٍ لَطِيْفِ السَّاقِ لَطْفَانِ

(40) کتنی ہی بار اس نے محبت و نرمی سے مجھے اپنے پہلوؤں سے چمٹایا، اللہ اس مہربان، نرم و نازک پنڈلی والے ساقی کو سیراب کرے۔

جَمَالُهَا جَنَّةٌ عَذْرَاءُ قَاصِرَةٌ   عَنْ نَيْلِ رُمَّانَةٍ مِنْهَا يَدُ الْجَانِي

(41) اس کا حسن و جمال ان چھوا باغ ہے، کسی مجرم کا ہاتھ اس باغ کے انار کو نہیں پا سکتا۔

كَمْ فَاكَهَتْنِيْ وَقَدْ بَاتَتْ تُشَاعِرُنِيْ ‏ ‏ وَفَكَّهَتْنِيْ بِتُفَّاحٍ وَرُمَّانِ

(42) کتنی ہی بار اس نے مجھ سے ہنسی مذاق کیا اور کتنی راتیں اس نے مجھ سے شعر وشاعری میں مقابلہ کرنے میں گزاریں اور کتنی ہی بار اس نے مجھے سیب اور انار کھلائے۔

كُنَّا ضَجِيْعَيْ هَوًى دَهْرًا بِعَافِيَةٍ ‏ ‏ فَحَالَ مَا بَيْنَنَا بَيْنٌ لِحِدْثَانِ

(43) ہم محبت کے بازوں میں ایک زمانے تک خیر وعافیت سے رہے کہ ناگہاں ہمارے درمیان حوادث زمانہ کی وجہ سے فرقت وجدائی حائل ہوگئی۔

إِذْ شَطَّنَا الدَّهْرُ شَطَّ الْوَصْلِ وَانْقَطَعَتْ ‏ ‏ لِأَجْلِ حِدْثَانِهِ أَسْبَابُ حُدْثَانِ

(44) زمانے نے وصل کا کنارہ ہم سے دور کر دیا اور حوادث زمانہ کی وجہ سے جوانی کے مشغلے منقطع ہوگئے۔

عَمَّتْ عَلَيْنَا حَدِيْثَ الْحُبِّ حَادِثَةٌ ‏ ‏ عَمَّتْ وَطَمَّتْ عَلَيْنَا طَمَّ طُوْفَانِ

(45) اس حادثے نے ہماری عشق ومحبت کی باتیں ختم کر دیں اور چاروں طرف سے مصائب و آلام کے طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔

وَتِلْكَ أَنَّ النَّصَارَى كَانَ نِيَّتُهُمْ ‏ ‏ تَنْصِيْرَ مَنْ فِي الْوَرَى مِنْ أَهْلِ أَدْيَانِ

(46) وہ حادثہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا مقصد سارے دین وملت کے لوگوں کو عیسائی بنانا ہے۔

كَانُوْا يَجِدُّوْنَ لِلتَّنْصِيْرِ فِيْ حِيَلٍ ‏ ‏ وَيَكْتُمُوْنَ مُنَاهُمْ أَيَّ كِتْمَانِ

(47) وہ اس آرزو وتمنا کو اپنے دلوں میں چھپا کر حیلوں اور تدبیروں کے ذریعہ مذہب عیسوی کی ترویج واشاعت کی منظم کوشش کر رہے ہیں۔

إِذْ خَيَّسُوْا كُلَّ وَالٍ عَاهَدُوْا فَبَغَوْا ‏ ‏ عَلَيْهِ عَادِيْنَ مِنْ غَدْرٍ وَخَيْسَانِ

(48) انھوں نے ہر فرماں روا سے کیا ہوا عہد وپیمان توڑ دیا اور عہد شکنی کر کے اس کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔

غَلَوْا إِذِ اغْتَصَبُوْا كُلَّ الْمَمَالِكِ فِيْ ‏ ‏ طَغْوَى وَعَدْوَى وَفِيْ كُفْرٍ وَكُفْرَانِ

(49) جس ملک پر بھی انھوں نے غاصبانہ قبضہ کیا اس میں ظلم وستم، شر وفساد، احسان فراموشی اور ناشکری کرنے میں حد سے گزر گئے۔

بَنَوْا أَرَاذِلَ هَدْمًا لِلنُّبَالِ كَمَا　　بَنَوْا مَدَارِسَ تَخْرِيبًا لِصِبْيَانِ

(50) باکمال لوگوں کو مٹانے کے لیے انھوں نے کمین وذلیل لوگوں کو نوازا اسی طرح بچوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے مدارس و دانش گاہیں تعمیر کروائیں۔

بِلَدْرِسِ رَسْمِ الْهُدٰى هَمُّوْا لِلَدْرِسِ لَغًى　　مِمَّا افْتَرَى النَّفْسُ مِنْ زُوْرٍ وَبُهْتَانِ

(51) ان مدارس و دانش گاہوں میں رشد و ہدایت کو مٹا کر گمراہی و بے دینی، جھوٹ، بہتان تراشی کی تعلیم دی جاتی جو ان کے پادریوں کے دلوں کی اپج ہے۔

وَوَكَّلُوْا طَمَعًا فِيْ نَشْرِ مِلَّتِهِمْ　　فِيْ أَرْضِنَا كُلَّ أُسْقُفٍّ وَمَطْرَانِ

(52) ہماری زمین پر اپنے دین کی نشر و اشاعت کے لیے انھوں نے اپنے مذہبی رہنماؤں کو مقرر کر دیا۔

مُدَارِسٌ دَارِسٌ لِلدَّرْسِ حِرْفَتُهُ الدْ　　تَحْرِيْفُ وَيْلَاهُ مِنْ غَسَّانَ مَيَّانِ

(53) وہ گناہ گار پادری جس کا کام علم کو مٹانا ہے جس کا کام تحریف معانی ہے، اس جھوٹے، گمراہ، نفس پرست کی ہلاکت و تباہی ہو۔

يُفْشِيْ بِمَكْرٍ وَنُكْرٍ نُكْرَهُ نُكُرًا　　مَا فِي الْأَنَاجِيْلِ مِنْ حَقٍّ وَتِبْيَانِ

(54) وہ اپنے حیلے اور فریب سے ایسی واہیات و منکر باتیں پھیلاتا ہے جس سے اللہ کی مقدس کتاب انجیل کا دامن پاک ہے۔

غَرُّوْا أَغِرَّاءَ أَرْذَالًا بِتَوْسِعَةٍ　　وَضَيَّقُوْا عَيْشَ أَشْرَافٍ وَغُرَّانِ

(55) ان گوروں نے نا تجربے کار، کج فہم، کوتاہ ہمت نوجوانوں کو دولت و ثروت کے ذریعے دھوکے اور فریب میں ڈال دیا اور ہر شریف النفس کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

وَقَتَّرُوْا رِزْقَ كُلٍّ مِنْ غَوَازِلَ أَوْ　　نُكْدٍ يَسْحَكْنَ وَصُنَّاعٍ وَأَقْيَانِ

(56) سوت کاتنے والی تنگ دست عورتیں ہوں یا غریب لوہار اور کاریگر ہوں، ان انگریزوں نے ہر ایک کی روزی کے راستے مسدود کر دیے۔

لَمْ يَتْرُكُوْا مِنْ فَلَاحٍ فِي الْفَلَاحَةِ بَلْ　　دَقُّوْا رَحٰى كُلِّ دَقَّاقٍ وَطَحَّانِ

(57) حتیٰ کہ کسانوں کی کھیتی باڑی میں بھی کوئی نفع نہیں چھوڑا بلکہ غریب آٹا پیسنے والے کی چکی

تک چکنا چور کر دی۔

أَلْقَوْا أُولِي الْوُجْدِ فِيْ وَجْدٍ وَ مَوْجِدَةٍ　　وَ كُلَّ ذِيْ حِرْفَةٍ فِيْ حُرْفِ حُرْفَانِ

(58) خوشحال اہل ثروت حضرات کو انھوں نے غیض و غضب، حزن والم میں مبتلا کر دیا اور ہر دستکار عامی شخص کو محرومی و نامرادی کی وادی میں پھینک دیا۔

وَ كُلَّ ذِيْ خَطَرٍ أَلْقَوْهُ فِيْ خَطَرٍ　　وَ كُلَّ ذِيْ حُرْمَةٍ فِيْ هَمِّ حِرْمَانِ

(59) اور ہر ذی رتبہ شخص کو ہلاکت کے قریب کر دیا اور ہر محترم شخص کو غم و محرومی کے گڑھے میں ڈال دیا۔

بِنَهْرِهِمْ أَنْهَرَ الصُّعْلُوْكُ وَ انْتَهَرُوا الْـ　　حُـرَّاثَ عَنْ سَقْيِ أَنْهَارٍ وَ غُدْرَانِ

(60) ان کے دھتکارنے کی وجہ سے فقیر و مسکین خیر سے محروم ہو گئے، انھوں نے کسانوں پر نہروں اور تالاب کا پانی بند کر دیا۔

قَدْ أَوْجَبُوْا مَغْرَمًا لِلسَّيْرِ فِيْ طُرُقٍ　　عَلَى جِمَالٍ وَ أَفْيَالٍ وَ ثِيْرَانِ

(61) ان گوروں نے اونٹ، ہاتھی، بیل وغیرہ جانوروں کے راستوں میں چلنے پر بھی ٹیکس مقرر کر دیا۔

قَضَاؤُهُمْ يَسْلُبُ الْخَصْمَيْنِ مَالَهُمَا　　فَيَتْلُوْنَهُمَا سُحْتًا بِخُسْرَانِ

(62) ان کے فیصلے فریقین کے مال کو چھین لیا کرتے اور انھیں نقصان و خسارے کی بنا پر رشوت کی لعنت میں مبتلا کر دیتے۔

رَأَوْا سَلَاطِيْنَ أَرْضِ الْهِنْدِ قَدْ وَهَنُوْا　　بِمَا لَهَوْا بِالْمَلَاهِيْ كُلَّ لِهْيَانِ

(63) جب ان نصاریٰ نے دیکھا کہ سرزمین ہند کے بادشاہ و امرا موسیقی اور لہو و لعب میں پڑ کر اپنی طاقت و قوت کھو چکے ہیں۔

فَحَاوَلُوْا حِوَلَ الْأَدْيَانِ مِنْ حِوَلٍ　　حَالَتْ فَآلَتْ إِلَى خُسْرٍ وَ بُطْلَانِ

(64) تو انھوں نے مکر و فریب سے دین و ملت کو تبدیل کرنے کا عزم کیا اور دین تبدیل ہوئے اور دائمی خسارے کی طرف لوٹے۔

كَمْ لَجَّ فِي الدِّيْنِ رُهْبَانٌ فَبَكَّتَهُمْ　　قَوْمٌ أَقَامُوْا عَلَيْهِمْ كُلَّ بُرْهَانِ

(65) کتنی ہی مرتبہ راہبوں نے (لاجواب ہوکر) دیر میں پناہ لی تو انھیں ایک حق پرست جماعت نے (دندان شکن جواب دے کر) غلبہ حاصل کیا اور ان پر دلیل و برہان قائم کی۔

خَزَوْا وَ أَخْزَاهُمُ الْحَيُّ الْحَيِّيُّ وَمَا مُعْتَادُ خِزْيٍ بِمُسْتَحْيٍ وَ خَزْيَانِ

(66) حق پرست جماعت نے انہیں مغلوب کیا، شرم و حیا والے زندہ دل حضرات نے انہیں ذلیل و رسوا کیا مگر ذلت کے خوگر کو شرمندگی و پشیمانی نہیں ہوتی۔

لَمَّا رَأَوْا زَوْرَهُمْ لَمْ يُجْدِهِمْ قَصَدُوْا بِالزُّوْرِ إِفْشَاءَ مَاهَمُّوْا بِإِعْلَانِ

(67) جب انگریزوں نے دیکھا کہ ان کے جھوٹ اور فریب نے انھیں فائدہ نہیں پہنچایا تو طاقت و قوت سے علی الاعلان انھوں نے اپنے مشن کو پھیلانا شروع کیا۔

دَعَوْا جِهَارًا إِلَى التَّثْلِيْثِ عَسْكَرَهُمْ وَ جُلُّ عَسْكَرِهِمْ عُبَّادُ أَوْثَانِ

(68) اور ببانگ دہل انھوں نے اپنی فوج کو تثلیث کی دعوت دی اور فوج میں اکثر سپاہی بت پرست تھے۔

وَ بَعْضُهُمْ مُسْلِمٌ مُسْتَسْلِمٌ فَعَدَا هُمُ الْحَمِيَّةُ عَنْهُمْ أَيَّ عُدْوَانِ

(69) کچھ سپاہی مسلمان تھے چنانچہ حمیت و غیرت نے لشکر کو انگریز کی تابعداری سے عداوت و دشمنی کی طرف پھیر دیا۔

وَ كَلَّفُوْهُمْ بِأَكْلِ الشَّحْمِ مِنْ بَقَرٍ وَ مِنْ زَنُوْتٍ لِيَرْتَدَّ الْفَرِيْقَانِ

(70) انگریزوں نے سپاہیوں کو گائے اور خنزیر کی چربی کھانے پر مجبور کیا تا کہ دونوں فریق (ہند و مسلمان) اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔

إِنَّ الْبَقَرَ لَمَعْبُوْدُ الْهَنَادِكِ وَالْـ خِنْزِيْرَ رِجْسٌ لَدَى أَتْبَاعِ قُرْآنِ

(71) ہندو گائے کی پرستش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک خنزیر نجس العین ہے۔

وَ إِذْ عَدَا جَيْشُهُمْ عَنْ أَمْرِهِمْ وَ عَدَوْا لَهُمْ وَ عَادَوْا تَعَدَّوْا أَيَّ عُدْوَانِ

(72) جب فوج نے ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور غضب ناک ہوئی اور ان کی دشمن ہو گئی تو یہ ظلم و زیادتی میں حد سے گزر گئے۔

فَقَتَلُوْا أُمَرَاءَ الْجَيْشِ أَكْثَرَهُمْ كَقَوْمَسٍ وَ كَبِطْرِيْقٍ وَ تُرْخَانِ

(73) چنانچہ (ردعمل میں) فوج نے لشکر کے اکثر امرا، قائدین اور سپہ سالاروں کو تہہ تیغ کر دیا۔

جَالُوْا وَ صَالُوْا وَ غَالُوْا كُلَّ مَنْ وَجَدُوْا مِنْهُمْ وَ أَعْدُوْا عَلَى وُلْدٍ وَ نِسْوَانِ

(74) باغیوں نے ہر طرف سے حملہ کر دیا انھوں نے جس کو بھی پایا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا حتیٰ کہ بچوں اور عورتوں کو بھی ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

وَ أَتْلَفُوْا كُلَّ مَالٍ مِنْ خَزَائِنِهِمْ وَ أَحْرَقُوْا كُلَّ إِيْوَانٍ وَ دِيْوَانِ

(75) انھوں نے خزانوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ہر کوٹھی و کچہری کو نذر آتش کر دیا۔

لَمْ يَبْقَ فِيْ جُلِّ مُلْكِ الْهِنْدِ مِنْ حَكَمٍ يَقْضِيْ لِمَنْ ضِيْمَ أَوْ يَقْضِيْ عَلَى جَانِ

(76) ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کوئی فیصل و حاکم نہ رہا جو مظلوم کے موافق اور مجرم کے خلاف فیصلہ کرے۔

وَ طَافَ فِيْ كُلِّ قُطْرٍ مِنْهُ طَائِفَةٌ تَعْدُوْ لِقَطْعِ طَرِيْقٍ أَوْ لِعُدْوَانِ

(77) ہندوستان کے ہر گوشہ میں فتنہ گروں کی جماعتیں لوٹ مار، شر و فساد برپا کرنے کے لیے گردش کرنے لگیں۔

وَثَارَ قُطْعٌ وَ أَلْصَاصٌ بَغَوْا وَطَغَوْا يَسْعَوْنَ لِلنَّهْبِ أَوْ تَخْرِيْبِ عُمْرَانِ

(78) ڈاکوؤں اور چوروں کی ٹولیاں نکل پڑیں، انھوں نے لوٹ مار، آبادی کو برباد کرنے کے مقصد سے ہر طرف شورش اور تباہی مچا دی۔

يَغْدُوْنَ يَعْدُوْنَ عَدْوَى يَعْتَدُوْنَ عَلَى مَالٍ وَ عِرْضٍ وَ أَعْرَاضٍ وَ أَبْدَانِ

(79) یہ چوریاں کرتے، شر و فساد برپا کرتے، جان و مال عزت و آبرو پر دست درازیاں کرتے۔

كَمْ يُهْلِكُوْنَ نُفُوْسًا لِلنَّفِيْسِ وَكَمْ يَسْتَصْوِبُوْنَ لِتِبْرٍ تَبْرَ إِنْسَانِ

(80) انھوں نے مال و دولت کے لیے کتنی ہی جانوں کو تہہ تیغ کر دیا اور سونے چاندی کی خاطر انسان کی گردن مارنا روا جانی۔

ذَلَّ الْعَزِيْزُ وَ عَزَّ الْعَزُّ وَافْتَقَرَ الْـ غَنِيُّ وَ ابْتَزَّ وَاعْتَزَّ (الرَّدَى) الدَّانِيْ

(81) عزت و شرف والے ذلیل ہو گئے، طاقت ور کمزور ہو گئے، مالدار مفلس و نادار ہو گئے، کمینے اور ذلیل لوگ عزت و شرف والے بن گئے۔

فَالْخَطْرُ فِيْ خَطَرٍ وَالدُّوْنُ فِيْ بَطَرٍ   فَالْكُلُّ فِيْ شُغْلِ أَحْزَانٍ وَ إِحْزَانِ

(82) بلند مرتبہ ومقام والے ہلاکت کے نزدیک پہنچ گئے، کمتر وحقیر، مغرور ومتکبر ہو گئے غرض کہ کوئی غم واندوہ میں مستغرق تھا اور کوئی داد عیش دے رہا تھا۔

جَلَّتْ وَ عَمَّتْ وَ غَمَّتْ جُلَّنَا فِتَنٌ   بَلْ كُلُّنَا بَيْنَ مَفْتُوْنٍ وَ فَتَّانِ

(83) ہم میں سے اکثر کو فتنوں نے گھیر لیا بلکہ سب ہی لوگ فتنہ وفساد کے احاطہ میں تھے۔

قَدْ صَارَ عَافِيَةُ الْآنَامِ عَافِيَةً   فَكُلُّهُمْ فَقَدُوْهَا كُلَّ فُقْدَانِ

(84) مخلوق خدا کے نگہبان ومحافظ نقشِ پا کی مانند مٹ گئے، بے سہارا مظلوموں نے انھیں کہیں نہیں پایا اور ان سے محروم ہو گئے۔

لَمَّا [انْتَأَى] كُلُّ جَيْشٍ مِنْ مُعَسْكَرِهِمْ   أَوَوْا إِلَى خَرِفٍ يُدْعَى بِسُلْطَانِ

(85) جب انگریزوں کے لشکر اپنی چھاؤنی سے دور ہو گئے تو لوگوں نے ایک خبط الحواس شخص کے دامن میں پناہ لی جسے بادشاہ کہا جاتا ہے (یعنی بہادر شاہ ظفر)

أَشَلُّ سَمَّى شُجَاعًا نَفْسَهُ صَلَفًا   فِخْلٌ وَ فَخْلٌ جَبَانٌ جُبْنَ خِصْيَانِ

(86) اس نے خود پسندی اور خودستائی کے طور پر اپنا نام بہادر رکھا حالاں کہ وہ مفلوج، بزدل، کمزور وناتواں بوڑھا ہے۔

حَلُّوْا بِدِهْلِيْ وَ خَصُّوْا أَمْرَ إِمْرَتِهِمْ   بِذَاهِلٍ ذَاهِلٍ تَيْهَانَ وَ لَهْيَانِ

(87) وہ لوگ دہلی میں قیام پذیر ہوئے اور اپنی حکومت کے قضیہ کو ایسے سرگشتہ ومتحیر شخص. کے سپرد کر دیا جو شدت غم سے مفلوج الحواس ہو چکا تھا۔

ثُمَّ دَعَانِيْ لِهَمٍّ بِالْمُهِمِّ فَلَمْ   يَعْمَلْ بِرَأْيِيْ وَلَمْ يَنْفَعْهُ إِذْ كَانِيْ

(88) اس شیخ فانی (بہادر شاہ ظفر) نے مجھے (فضل حق خیرآبادی کو) اس سخت مہم کے لیے بلایا پھر اس نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا اور اسے میرا سمجھانا بے سود رہا۔

كَانَتْ عَشِيْرَتُهُ تَهْوَى مُعَاشَرَةً   مَعَ الْعِدَى فَلَهُمْ كَانَتْ بِإِذْعَانِ

(89) اس کے اہل خاندان کے دشمنوں کے ساتھ محبت آمیز معاشرتی تعلقات تھے، چنانچہ وہ انگریزوں کے مطیع وفرماں بردار ہو گئے۔

وَ كَانَ عَامِلُهُ مِنْ قَبْلُ بَائِعَهُمْ   دِيْنًا بِدِيْنٍ وَ إِيْمَانًا بِإِيْمَانِ

(90) اس (بہادر شاہ ظفر) کے خدام وملازمین پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھ اپنے دین وایمان کا سودا کر چکے تھے۔

رَأَى النَّصَارَى إِذَا مَا عَاهَدُوْا غَدَرُوْا   وَ أَغْدَرُوا الْوَالِ إِلَّا حِيْنَ رَهْبَانِ

(91) بادشاہ نے دیکھا کہ انگریز جو عہد کرتے ہیں اسے نبھاتے نہیں، صرف خوف کی حالت میں عہد شکنی سے باز رہتے ہیں۔

يَمِيْنُ كُلِّ كَفُوْرٍ فِيْ الْيَمِيْنِ وَلَا   يَهُمُّ عَوْضَ بِبِرٍّ أَوْ بِكُفْرَانِ

(92) ہر کافر قسم کھا کر جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اسے پورا کرنے یا کفارہ ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتا۔

لٰكِنَّهُ اغْتَرَّ إِذْ أَعْمَى بَصِيْرَتَهُ   أَصَمُّ أَعْوَرُ مِنْ صَمٍّ وَ عُمْيَانِ

(93) یہ بادشاہ دھوکا کھا گیا جب ایک بہرے بھینگے نے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی (بھینگے بہرے سے مراد غالباً رجب علی ہے)

كِلَاهُمَا جَدَّ فِيْ كَسْرِ الْجُيُوْشِ وَ فِيْ الْـ   ـتَّاوُنِ ابْتَدَعَا أَفْنَانَ إِفْتَانِ

(94) ان دونوں نے لشکروں کو شکست دینے اور شکار کو گھیرنے کی جدوجہد کی اور فتنہ میں ڈالنے والے فنون ایجاد کر لیے۔

تَنَاوَلَا كُلَّ مَا جَاءَ الْجُيُوْشُ بِهِ   كَبِرْهَمٍ وَ كَدِيْنَارٍ وَ عِقْيَانِ

(95) لشکر جو بھی درہم دینار اور سونا لے کر آئے ان دونوں نے سب کچھ ہتھیا لیا۔

كَم عُدَّةٍ وجِرَابٍ لِلْعِدَى أُخِذَتْ   مِنْهُمْ فَبِيْعَتْ بِأَيْدِيْهِمْ بِأَثْمَانِ

(96) دشمن سے لوہا لینے کے لیے لوگوں سے کتنا ہی ساز وسامان اور ہتھیار لیے گئے وہ سب ان ہی کے ہاتھ قیمت لے کر فروخت کر دیے گئے۔

فَغَلَّهَا كُلُّ ذِيْ غِلٍّ وَ أَغْلَبُهُمْ   فِي الْخَوْنِ ذَانِ الْأَبْلَانِ الْأَضَلَّانِ

(97) ہر بغض وکینہ پرور اس سامان کی خیانت میں شریک ہوا اور خیانت میں سب سے بڑھ کر یہ ہی دونوں فاسق وفاجر تھے۔

اَلْخَوْنُ ذَانِ كَثِيْرٌ مَنْ يُقَارِفُهُ   وَ ذَانِ أَسْبَقُهُمْ فِيْ ذٰلِكَ الذَّانِ

(98) خیانت بہت بڑا عیب ہے اور یہ دونوں اس عیب میں سب پر سبقت لے گئے۔

وَ قَدْ نَرَی مِنْ بُغَاةِ الْجَیْشِ طَائِفَةٌ   مَعَ الْبَغَایَا بِفَضْرٍ أَوْ بِدُکَّانِ

(99) باغی لشکر میں سے ایک گروہ بازاری عورتوں کے ساتھ بدکاری میں مشغول ہو گیا۔

صَارَ الْبَغَایَا بَغَایَا الْجَیْشِ حِیْنَ بَغَوْا   وَ بِلِیْ بُغَاةٌ لِسُخْطِ اللّٰهِ بُغْیَانِ

(100) بغاوت کے وقت لشکر کا اولین دستہ ان بازاری عورتوں کا تھا، اللہ کا غیض وغضب ان بدکاروں پر نازل ہو۔

عَادُوْا یُعَادُوْنَ مَا قَدْ عُوِّدُوْا وَ نَسُوْا   قَوَاعِدَ الْحَرْبِ عَمْدًا کُلَّ نِسْیَانِ

(101) جس فعل کے یہ عادی ہو گئے اسے بار بار انجام دینے لگے اور دانستہ طور پر انھوں نے جنگ کے قوانین وضوابط فراموش کر دیے۔

وَ بَعْضُهُمْ أَشِرٌ لِلْمَالِ مُدَّخِرٌ   مُثَاقِلٌ مُثْقَلٌ مِنْ ثِقْلِ هِمْیَانِ

(102) لشکر میں بعض وہ متکبر تھے جو مال جمع کرنے کے خوگر تھے۔ یہ مال سے بھری ہوئی تھیلیوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔

وَ بَعْضُهُمْ مُسْتَفِیْقٌ لَایَقُوْمُ مِنَ الْـ   مِهَادِ وَ یْلَاهُ مِنْ رَفْهَانَ کَسْلَانِ

(103) لشکر میں بعض وہ تھے جو ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئے انھوں نے ابھی بستر بھی نہیں چھوڑا، ہلاکت ہو اس سستی اور عیش پرستی پر۔

وَالْبَعْضُ غَرْثَانُ خَمْصُ الْبَطْنِ أَقْعَدَهٗ   عَنِ النُّهُوْضِ إِلَی حَرْبٍ وَ مَیْدَانِ

(104) بعض فوجی بھوکے تھے، خالی پیٹ نے انھیں میدانِ کارزار میں جانے سے روک دیا۔

کَمْ تَائِهٍ لَمْ یُطِقْ حَمْلَ السِّلَاحِ وَ کَمْ   مِنْ تَائِهٍ أَنِفٍ مِنْ حَمْلِ سُلْحَانِ

(105) کتنے ہی متحیر لشکری ایسے تھے جن میں ہتھیار اٹھانے کی بھی سکت نہیں تھی اور کتنے ہی مغرور متکبر سپاہی ہتھیار اٹھانے کے انکاری تھے۔

عَاجَ النَّصَارَی تِجَاهَ الْمِصْرِ فِيْ جَبَلٍ   فَحَصَّنُوْهُ بِأَبْرَاجٍ وَ حِیْطَانِ

(106) انگریزوں نے شہر کا رخ کیا اور پہاڑوں پر مضبوط قلعہ اور فصیلیں تعمیر کر لیں۔

وَ إِذْ بَنَوْا قَلْعَةً فِيْ رَأْسِهٖ قَلَعُوْا   مَا حَوْلَهٗ مِنْ عِمَارَاتٍ وَ جِیْرَانِ

(107) جب وہ شہر کے قریب قلعہ تعمیر کر کے فارغ ہوئے تو اس کے اطراف و جوانب کی عمارتیں اکھاڑ پھینکی اور باغات کو تباہ کر دیا۔

غَشْی السَّوَادَ سَوَادٌ مِنْ عِدَی کُفُرٍ　　سُوْدِ الْکُبُوْدِ وَ زُرْقِ الطَّرْفِ بِیْضَانِ

(108) سیاہ جگر سخت دشمن گوروں کے کثیر لشکر نے شہر کے اطراف و نواح کا محاصرہ کرلیا۔

ضَمَّ النَّصَارَی لِتَکْثِیْرِ السَّوَادِ إِلَی الْـ　　بِیْضَانِ مِنْ سُوْدِ زُطٍّ جَمْعَ حُمْرَانِ

(109) فوج کی تعداد بڑھانے کے لیے انھوں نے انگریز فوج کے علاوہ سیاہ جاٹ قوم کو بھی شامل کرلیا۔

وَ ثُلَّةٌ مِنْ رَعَاعٍ مُسْلِمِیْنَ قَدِ ارْ　　تَدُوْا وَعَادُوْا کُفَارًا بَعْدَ إِیْمَانِ

(110) پست درجہ، کم ہمت مسلمانوں کی ایک جماعت برگشتہ ہوگئی، وہ لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے۔

وَ مِنْ أَرَاذِلَ دُوْنٍ سِفْلَةٍ هَمَجٍ　　وَ مِنْ أَحَابِیْشَ سُوْدَانٍ کَحُبْشَانِ

(111) ان میں سے بعض بے وقوف کمینے لوگ تھے اور کچھ حبشیوں کی مثل کالے لوگوں کے جتھے تھے۔

فَمَرَّنُوْهُمْ عَلَی مَشْقٍ بِأَسْلِحَةٍ　　مِنْ بُنْدُقٍ وَ مَجَانِیْقَ وَ مُرَّانِ

(112) انگریزوں نے اس مرتد گروہ کو توپ، بندوق، منجنیق جیسے ہتھیار چلانے کی مشق کرائی۔

وَ أَلَّفُوْا جُلَّ أَهْلِ الْمِصْرِ فَانْتَلَفَ الْـ　　أُلُوْفُ مِنْهُمْ فَصَارُوْا شَرَّ خُصْمَانِ

(113) انگریزوں نے اکثر اہل شہر کو جمع کیا ان میں سے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوگئے پھر یہ ان سے سخت جھگڑا کرنے لگے۔

مَانُوْا وَ مَانُوْا وَ مَنُّوْهُمْ مُنًی وَفَنَی　　وَ بَعْدُ ذَاقُوا الْمَنَا خَنْقِیْ بِأَرْسَانِ

(114) انھوں نے جھوٹ بولا اور اُن کو آرزوؤں، تمناؤں نے کمزور کر دیا اور اس کے بعد پھانسی کے پھندوں پہ انھوں نے موت کا مزہ چکھا۔

فَأَوْقَدُوْا نَارَ حَرْبٍ أَشْهُرًا وَ رَمَوْا　　أَعْدَاءَهُمْ مِنْ مَجَانِیْقَ بِشُهْبَانِ

(115) ان ظالموں نے کئی مہینے تک جنگ کی آگ بھڑکائی اور دشمنوں پہ توپ کے گولے برسائے۔

شَادَالْجُيُوْشُ بُرُوْجَ السُّوْرِ فَالْتَحَمَتْ   مَلَاحِمٌ بَيْنَ أَبْطَالٍ وَ أَقْرَانِ

(116) لشکروں نے شہر پناہ کی فصیلیں مضبوط کیں پھر بہادروں، دلیروں کے درمیاں معرکہ گرم ہوگیا۔

وَ جَاءَ دِهْلِيْ غُزَاةٌ مُخْلِصُوْنَ غَزَوْا   رَجَاءَ فَضْلٍ مِنَ الْمَوْلٰى وَ رِضْوَانِ

(117) دہلی میں کچھ مخلص مجاہدین بھی آئے جنھوں نے محض رضائے الٰہی کی امید میں جہاد کیا۔

وَلَا طَعَامٌ لَهُمْ غَيْرَ الْحُبُوْبِ وَلَا   لِبْسٌ لَهُمْ غَيْرَ أَطْمَارٍ وَ خُلْقَانِ

(118) (مگر) اِن کے پاس سوائے چند دانوں کے کوئی کھانا نہیں تھا اور سوائے چند پرانے کپڑوں کے لباس (جنگ) نہیں تھے۔

سُلَاحَانُهُمْ أَقْوَسٌ أَوْ أَسْيَفٌ صَدِئَتْ   لِطُوْلِ مَالَزِمَتْ بُطْنَانَ أَجْفَانِ

(119) ان کے ہتھیاروں میں کجی اور ٹیڑھا پن تھا، ان کی تلواریں عرصۂ دراز سے میانوں میں رہنے کے باعث زنگ آلود ہوچکی تھیں۔

لٰكِنَّهُمْ نَجَدُوْهُمْ نَجْدَةً رَمَتْ   مِنْ حِزْبِهِمْ كُلَّ جَبَّانٍ بِجَبَّانِ

(120) مگر جواں مردی و دلیری کی وجہ سے یہ انگریز فوج پر غالب آئے اور انھوں نے اپنے ان ہی ہتھیاروں سے میدان جنگ میں ہر بزدل کا مدفن بنادیا۔

كَمْ مَرَّةً حَمَلُوْا فِيْهِمْ كَأَنْ حَمَلَتْ   أُسْدٌ جِيَاعٌ عَلٰى أُجْدٍ وَ حُمْلَانِ

(121) بارہا وہ انگریز فوج پر اس طرح حملہ آور ہوئے جیسے بھوکے شیر اونٹنی اور بکری کے بچوں پر حملہ کرتے ہیں۔

إِنْحَازَ جُنْدُ النَّصَارٰى كُلَّمَا حَمَلُوْا   وَلَمْ يَكُنْ لِلنَّصَارٰى طَوْقُ حُمْلَانِ

(122) جب بھی ان جانبازوں نے نصاریٰ کی فوج پر حملہ کیا اس نے شکست کھائی ان میں حملہ کرنے کی سکت بھی نہ رہی۔

قَدْ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ الْحَقِّ وَاتَّبَعُوْا   رِضْوَانَهُ وَ اسْتَحَقُّوْا رَوْضَ رِضْوَانِ

(123) انھوں نے راہِ حق میں جہاد کیا اور رضائے الٰہی کے طریقے پر گامزن رہ کر جنت کے مستحق ہوئے۔

فَكَفَّرَ الْبَعْضُ بِالْأَجْرَاحِ مَا اجْتَرَحُوْا　　وَرَاحَ بَعْضٌ إِلَى رَوْحٍ وَ رَيْحَانِ

(124) ان مجاہدین میں سے بعض نے اپنے زخموں کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور بعض واصل الی الحق ہو گئے۔

أَمَّا الْجُيُوْشُ فَجَاشَتْ أَوَّلاً وَحَدَثْ　　رَمْيًا بِرَمْيٍ وَ طُغْيَانًا بِطُغْيَانِ

(125) بہر حال فوجوں نے شروع میں جوش وخروش کا مظاہرہ کیا، تیر کا جواب تیر اور سرکشی کا جواب سرکشی سے دیا۔

قَدْ أَقْدَمُوْا قَبْلُ فِي الْهَيْجَا وَهُمْ قَدَمٌ　　ثُمَّ انْثَنَى كُلُّ جِيْلٍ بَعْدَ جِيْلَانِ

(126) اوّلاً انھوں نے میدان کارزار میں دلیروں اور جانبازوں کے مثل پیش قدمی کی پھر ہر دستہ منھ موڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

قَدْ كَانَ كُلٌّ قَدِيْمًا أَحْمَسَ قَدَمًا　　وَ صَارَ الْآنَ كُلٌّ كُلَّ جَبَّانِ

(127) شروع میں ان میں ہر ایک بہادر و دلیر تھا لیکن اب سب کمزور و بزدل ہو گئے۔

وَ ذَاكَ شَأْمَةُ ظُلْمٍ قَارَفُوْهُ مِنَ النَّـ　　ـهْبِ وَ تَقْتِيْلِ نِسْوَانٍ وَ وِلْدَانِ

(128) ان لوگوں نے بچوں و عورتوں کو قتل کیا اور لوٹ مار کی یہ پسپائی اسی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی نحوست کی وجہ سے ہوئی۔

صَارَ الرِّجَالُ كَنِسْوَانٍ وَ أَجْبَنُهُمْ　　مَنْ كَانَ فِي الْجَيْشِ مِنْ خَيْلٍ وَ فُرْسَانِ

(129) لشکر کے مرد عورتوں کی مانند ہو گئے ان میں بھی سب سے بزدل گھڑ سوار تھے۔

فَيَبْطُـنُوْنَ إِذَا نُوْدُوْا لِمَعْرَكَةٍ　　يُسَارِعُوْنَ إِلَى نَهْبٍ وَ غُنْمَانِ

(130) یہ وہی لوگ ہیں جب ان کو جنگ کے لیے آواز دی جاتی تو چھپتے اور لوٹ مار اور مال غنیمت کے لیے دوڑ پڑتے۔

حَرْبَى إِذَا حُرِبُوْا حَرْبَى إِذَا احْتَرَبُوْا　　فَأَمْعَنُوْا فِيْ فِرَارٍ أَيَّ إِمْعَانِ

(131) یہ وہی لوگ ہیں کہ جب ان سے مال چھینا جاتا تو غضبناک ہو جاتے اور اب خود جنگ کی آگ بھڑکا کے لوٹ مار کر رہے ہیں اور جنگ سے فرار کی راہ تلاش کر رہے ہیں۔

كَمْ نَامَ مَنْ بَاتَ بِالْمِرْصَادِ فِيْ سِنَةٍ　　عَنْ كَيْدِ خَصْمٍ شَدِيْدِ الْأَيْدِ يَقْظَانِ

(132) ان میں سے کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو دشمن کی گھات میں تھے مگر بے دار مغز دشمن کے مکر سے غافل ہو کر سو گئے۔

نَامُوْا لِخَصْمُهُمُ الْيَقْظَانُ بَيَّتَهُمْ　　بِجُنْدِهٖ فَأَنَامُوْا كُلَّ وَسْنَانِ

(133) جب یہ خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگے تو ہوشیار دشمن نے اپنے لشکر کے ساتھ ان پر شب خون مارا اور ہر اونگھنے والے کو تہ تیغ کر دیا۔

وَالْخَصْمُ إِذْ أَعْلَمُوْا مِرْصَادَهُمْ نَصَبُوْا　　مَجَانِقًا دُوْنَ ذَاكَ الْمَرْصَدِ الدَّانِيْ

(134) جب دشمن نے ان کی کمین گاہ کو پایا تو اس کے سامنے ایک منجنیق نصب کی۔

فَضُعْضِعَ السُّوْرُ مِنْ أَوْبِ مَجَانِقِهِمْ　　وَ أُوْهِنَتْ أُسُّ أَبْرَاجٍ وَ أَرْكَانِ

(135) اور ان منجنیقوں سے شہر پناہ منہدم کر دی گئی، قلعوں اور فصیلوں کی بنیادوں کو کمزور کر دیا گیا۔

وَ أَمْطَرُوْا مَطَرًا مِنْ بُنْدُقٍ قَذَفُوْا　　فَفَرَّ حُرَّاسُ أَبْرَاجٍ وَ بِيْرَانِ

(136) انھوں نے گولیوں کی بوچھار کر دی، قلعے اور شہر پناہ کے محافظین اور نگہبان بھاگ کھڑے ہوئے۔

لَمْ يَبْقَ فِي السُّوْرِ مِنْ حُرَّاسِهٖ أَحَدٌ　　وَلَا لَدَى الْبَابِ مِنْ حَامٍ وَ دَرْبَانِ

(137) شہر پناہ میں کوئی محافظ و نگہبان باقی نہ رہا اور قلعہ کے دروازے پر کوئی چوکیدار اور دربان نہ رہا۔

فِرَارُ فَسْلٍ وَ فَشْلٍ حِيْنَ صَوْلِ عِدًى　　أَزَلَّ أَقْدَامَ أَقْدَامٍ وَ شُجْعَانِ

(138) دشمنوں کے حملے کے وقت کمزور اور بزدلوں کے بھاگنے نے بڑے بڑے شہ زوروں اور بہادروں کے پاؤں اکھاڑ دیے۔

صَالَ النَّصَارٰى فَقَالُوْا كُلَّ مَنْ وَجَدُوْا　　مِنْ غَيْنِ دِهْلِيْ وَ سُفَّارٍ وَ قُطَّانِ

(139) انگریزوں نے حملہ کر کے شہر دہلی میں جس مسافر و متوطن کو پایا اس کی گردن مار دی۔

قَدْ كَانَ أَكْثَرُ أَهْلِي الْمِصْرِ قَدْ خَرَجُوْا　　مِنْ دُوْرِهِمْ لِاتِّقَاءٍ أَوْ لِخَشْيَانِ

(140) اکثر شہر کے باشندگان جان کی حفاظت یا خوف و دہشت کی وجہ سے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔

وَالْبَعْضُ لَمْ يَبْرَحُوْا لِلِاتِّكَاءِ عَلَى　　وَعْدِ النَّصَارَى بِإِرْفَاهٍ وَ إِيْمَانِ

(141) بعض لوگ نصاریٰ کے امن وامان کے وعدے پر بھروسہ کر کے وہیں قیام پذیر رہے۔

وَ كَانَ ذَا الْوَعْدُ إِيْعَادًا فَقَدْ خُنِقُوْا　　وَلَمْ يُوَارُوْا بِأَرْمَاسٍ وَ أَكْفَانِ

(142) وہ وعدہ ایک دھمکی ثابت ہوا، انھیں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا اور ان کی نعشیں بے گور و کفن پڑی رہیں۔

وَ حِيْنَ جَاسُوْا خِلَالَ الدُّوْرِ أَطْعَمَهُمْ　　مِنْ خُوْنِهِ كُلُّ مُرْتَدٍّ وَ خَوَّانِ

(143) اور جس وقت انگریزوں نے گھروں کی تلاشی لی تو ہر بے دین وخائن نے اپنے خیانت کے مال میں سے ان کی خاطر و مدارات کی۔

كَمْ تَاجِرٍ فَاجِرٍ آوَى حِمَاهُ مِنَ الْـ　　بِيْضَانِ كُلَّ ظَلُوْمٍ فَاجِرٍ زَانِ

(144) کتنے ہی فاسق وفاجر تاجروں نے ظالم، بدکار، زانی گوروں کو (اپنے گھروں میں) ٹھہرلیا۔

فَلَمْ يَذَرْ ضَيْفُهُ عِرْضًا وَلَا عَرَضًا　　وَلَا مَتَاعًا لَهُ فِي الْبَيْتِ وَ [الْحَانِيْ]

(145) مگر اس کے مہمان نے گھر میں نہ جان و مال چھوڑا نہ عزت وآبرو سلامت چھوڑی۔

وَ عِنْدَمَا وَلَجُوْا فِي الدُّوْرِ لَمْ يَذَرُوْا　　مَا كَانَ فِي الدُّوْرِ مِنْ سُقُفٍ وَ جُدْرَانِ

(146) اور جب یہ گھروں میں گھسے تو گھروں کی چھتوں اور دیوار کو بھی نہیں بخشا۔

لِلْأَسِّ أَوْ لِدَفِيْنٍ فِي الثَّرَى قَلَعُوْا　　أُسَّ الْبُيُوْتِ وَهَدُّوْا كُلَّ بُنْيَانِ

(147) فساد برپا کرنے کے لیے یا دفینہ حاصل کرنے کے لیے ان بدبختوں نے گھروں کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا اور ہر عمارت کو منہدم کردیا۔

هَدُّوا الْمَغَانِيَ وَ اغْتَامُوْا نَفَائِسَهَا　　فَلَيْسَ فِيْ أَهْلِهَا غَانٍ وَلَا غَانِ

(148) گھروں کو ڈھانے کے بعد اس کی نفیس وعمدہ اشیا انھوں نے ہتھیالیں پس اہل خانہ میں سے نہ کوئی مقیم رہا اور نہ صاحب مال۔

سُكَّانُهَا ذَهَبُوْا أَيْدِيْ سَبَا وَ سَبَى الْـ　　عَدُوُّ مَنْ شَذَّ مِنْ رَكْبٍ وَ رُجْلَانِ

(149) گھروں کے ساکنین تتر بتر ہوگئے اور بعض جو سوار اور پا پیادہ بچے انھیں دشمنوں نے حراست میں لے لیا۔

لَمْ يَنْجُ مِنْهُمْ سِوَى مَنْ فَرَّ مُخْتَفِيًا   كَبَعْضِ وُلْدٍ وَ نِسْوَانٍ وَ ذُكْرَانِ

(150) ان قسمت کے ماروں میں سے صرف وہی مرد وعورت اور بچے نجات پا سکے جو چھپ کر بھاگ گئے۔

لَهْفِيْ عَلَى بَلَدٍ قُطَّانُهَا ذَهَبُوْا   أَيْدِيْ سَبَا فَاقِدِيْ أَهْلٍ وَ قُطَّانِ

(151) افسوس ہے ایسے شہر پر جس کے باشندگان اہل وعیال کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔

لَهْفِيْ عَلَى بَلَدٍ وَحْشٍ تَوَحَّشَ مَا   فِيْمَنْ ثَوَاهُ سِوَى وَحْشٍ وَ وَحْشَانِ

(152) ہائے افسوس اس ویران شہر پر جو لوگوں سے خالی ہو گیا سوائے وحشی جانور اور غمگین لوگوں کے اس کے آباد کرنے والوں میں سے کوئی نہیں بچا۔

يَتِيْهُ أَهْلُوْهُ أَوْ حَاشَا بِمَتْيَهَةٍ   مُسْتَأْنِسًا كُلُّ وَحْشَانٍ بِوُحْشَانِ

(153) اس شہر کے باشندے بھوکے پیاسے میدانِ تیہ میں بھٹک رہے ہیں اور ان کا حال یہ ہو گیا کہ وہ پریشان حال لوگ وحشی جانوروں سے اپنی وحشت دور کر رہے ہیں۔

كَانُوْا يَتِيْهُوْنَ مُخْتَالِيْنَ فِيْ مَرَحٍ   صَارُوْا يَتِيْهُوْنَ فِيْ تِيْهٍ وَقِيْعَانِ

(154) اِدھر یہ انگریز خوش وخرم تکبر سے اترا رہے ہیں اور اُدھر مظلوم بنجر اور چٹیل میدانوں میں بھٹک رہے ہیں۔

كَمْ مَنْ نَأَى مِنْ إِنَاثٍ أَوْ أَبٍ وَأَخٍ   عَنْ أَوْلِيَاءٍ وَ أَبْنَاءٍ وَ إِخْوَانِ

(155) بہت سے لوگ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، بچوں سے بچھڑ گئے۔

لَمْ يَدْرِ بَعْلٌ وَلَا ابْنٌ أَيْنَ بَعْلَتُهُ   وَ وَالِدَاهُ وَ جَارٌ حَالَ جِيْرَانِ

(156) شوہر کو علم نہیں کہ اس کی بیوی کہاں ہے، بچے کو نہیں معلوم کہ اس کے والدین کس حال میں ہیں، پڑوسی اپنے ہم سایوں کے حال سے نابلد ہے۔

كَمْ بَادَ فِي الْبِيْدِ وِلْدَانٌ وَ مَنْ وَلَدُوْا   فَمِنْ يَتِيْمٍ وَ مِنْ ثَكْلَى وَ ثَكْلَانِ

(157) جنگل اور صحرا میں بہت سے بچے اور والدین ہلاک ہو گئے ان میں یتیم بھی ہیں اور وہ مرد وعورت بھی جن کی اولاد ہلاک ہو گئی۔

وَ فِيْ حُجُوْرِ نِسَاءٍ إِلْدَةٌ حُرِمُوْا   لِبَكْءِ أُمَّاتِهِمْ أَفْوَاقَ أَلْبَانِ

(158) ماؤں کے پستانوں میں دودھ سوکھنے کے باعث ان کی گود میں بچے دودھ سے محروم ہو گئے۔

بُكَاؤُهُمْ لِبُكَاءِ الْأُمَّهَاتِ كَمَا　　　بُكَاؤُهُنَّ لِجُوْعٍ أَوْ لِأَحْزَانِ

(159) بچے ماں کے دودھ کی کمی کی وجہ سے بلک رہے ہیں اور ماں بھوک کی شدت اور مصائب و آلام کے سبب رو رہی ہے۔

كَمْ فَائِقٍ كَانَ يُعْطِي الْفَاقَ كُلَّ طَوٍ　　　فَافْتَاقَ حَتّٰى تَمَنّٰى أَكْلَ أَسْغَانِ

(160) کتنے ہی تونگر جو بھوکے کو کھانا دیا کرتے تھے آج خود مفلس و نادار ہیں حتیٰ کہ سڑے اور بیکار کھانوں کی خواہش رکھتے ہیں۔

طَعَامُهُمْ كُلُّهُ زِنٌّ إِذَا رُزِقُوْا　　　وَالشُّرْبُ مِلْحٌ أُجَاجٌ آسِنٌ آنِ

(161) صرف لیس دار اناج ان کا کھانا ہے، کھارا گرم گدلا ان کا پانی ہے۔

قَدْ زُنِّنُوْا بَعْدَ مَا كَانَتْ مَآكِلُهُمْ　　　أَشْهَى الْمَطَاعِمِ مِنْ دَرٍّ وَلُحْمَانِ

(162) آج فقط انھیں ماش ملتا ہے جبکہ قبل ازیں لذیذ گوشت اور دودھ تناول کرتے تھے۔

بَاتُوْا نِيَامًا عَلَى اسْتَبْرَقٍ زَمَنًا　　　وَالْآنَ بَاتُوْا عَلَى شَوْكٍ وَصَفْوَانِ

(163) یہ لوگ ایک زمانے تک ریشم کے نرم و گداز بستروں پر سوتے اور آج کانٹوں اور سخت پتھروں پر رات گزار رہے ہیں۔

جُلُّ الرِّجَالِ رِجَالٌ يَشْتَكُوْنَ حَفًا　　　وَقَلَّ مَنْ هُوَ مِنْ خَيْلٍ وَ رُكْبَانِ

(164) اکثر لوگ برہنہ پا ہیں جو چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے بہت کم لوگوں کو سواریاں میسر ہیں۔

قَاسُوْا عِقَابًا بِرُقِيٍ فِيْ عِقَابِ ذُرًى　　　فَوَاسِيًا مَابِهَا مَرْقًى لِعِقْبَانِ

(165) ان لوگوں نے بلند و بالا دشوار گزار گھاٹیوں پر چڑھنے میں بے پناہ مشقتیں برداشت کیں اور ان چٹانوں پر چڑھے جو در حقیقت عقابوں کا مسکن ہے۔

قَدْ يَسَّرَ الْهَوْلُ لِلزَّمْنَى التَّسَرُّعَ وَالْـ　　　عُرُوْجَ فِيْ مُرْتَقًى صَعْبٍ لِعُرْجَانِ

(166) خوف اور ہول ناکی نے کمزور اور لاغر کے لیے اس بلندی پر چڑھنا آسان بنا دیا جو لنگڑوں کے لیے انتہائی دشوار ہے۔

يَعْلُوْ شَوَامِخَ طَلَّاعًا تَوِ زَمِنٌ　　　يَطْوِيْ فَرَاسِخَ فِيْ آنٍ طَوٍ آنِ

(167) (حیرت ہے) کہ بے حد بلند و بالا ہلاکت خیز پہاڑی پر ایک اپاہج چڑھ جاتا ہے اور بھوکا اور نادار ایک آن میں کئی فرسخ راستہ طے کر لیتا ہے۔

سَارُوْا حُفَاةً تَشُوکُ الشَّوکُ أَرْجُلَهُمْ　　وَ قَـدْ تَسَـوَّخُ فِيْ وَ حْـلٍ وَ اُمْـهَـانٍ

(168) یہ قسمت کے مارے لوگ برہنہ پا کانٹوں پر چل رہے تھے کبھی کانٹے ان کے پیروں میں چبھتے اور کبھی کیچڑ اور ریتلی زمین میں دھنستے۔

مَنْ كَـانَ ذَا حَفَّةٍ قَدْ صَـارَ ذَا خَفَفٍ　　وَ صَـارَ تَـارِكُ حَـفَّـانٍ وَ حَـفَّـانٍ

(169) جوان میں سخی و فیاض تھا وہ اب تنگ دست و نادار ہو چکا تھا اور نوکر چاکر، مال و متاع چھوڑ کر چل پڑا تھا۔

كَـمْ تَيْهَـانٍ غَـدَا تَيْهَـانَ مُضْطَـرِبًا　　كَـمَـا غَـدَا هَيِّـانًـا كُـلُّ هَيْبَـانٍ

(170) بہت سے گھمنڈی متکبر لوگ آج اضطراب و بے چینی کا شکار ہیں اور بہت سے دلیر و بہادر بزدل ہو گئے۔

كَـمْ هَيِّـنٍ لَيِّـنٍ يَـكْبُوْ وَ يَعْثُرُ فِي الصَّـ　　ـمَّـانِ وَالصُّلْبِ مِنْ غُمْيٍ وَ صُمَّانٍ

(171) بہت سے نزاکت پسند، نازک مزاج پتھریلی زمین اور سخت پتھروں پر لڑکھڑا کر گر رہے تھے۔

كَـمْ مُسْـكِـنٍ مُسْتَكِيْنٍ نَاءَ عَنْ سَكَنٍ　　قَـدْ نَـاءَ مِـنْ مَـسْـكَـنٍ مِنْ فَقْدِ أَسْكَانٍ

(172) بہت سے مسکین و مفلس اپنی جھونپڑی سے دور ہو گئے اور بے روزگاری کی بنا پر گھر بار چھوڑ دیا۔

كَـمْ نَـاعِـلٍ صَـارَ نَعْلاً بِالْهَوَانِ وَ كَمْ　　مِـنْ مُـحْتَفٍ مَـالُـهُ مِنْ مُحْتَفٍ حَـانٍ

(173) کتنے ہی جوتا پوش ذلت و رسوائی کے سبب خود پیر کی جوتی کی مانند ہو گئے اور کتنے ہی ننگے پاؤں پھرنے والے آج صاحب عظمت ہو گئے۔

حَـارُوْا وَ حَـارُوْا فَـمِـنْ هَارٍ وَ مُهْتَوِرٍ　　وَ هَيْـرِتَـاهُ فِـي الْـحِيْـرَانِ حَيْـرَانٍ

(174) لوگ متحیر و سرگرداں ہیں، بعض کمزور ہلاکت کے نزدیک پہنچے ہوئے جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں۔

وَ هَـاجِـرٍ هَـاجِـرِ الـسَّـكْنِ هَجَّرَ أَوْ　　مُـدَاجِـرٍ فِيْ دُجَـى الـدَّيْجُوْرِ دَجْرَانٍ

(175) بہت سے ذی علم وفضل لوگ گھر کو چھوڑ کر چلچلاتی دھوپ میں ہجرت پر مجبور ہوئے اور بہت سے شب دیجور (سخت تاریک رات) میں حیران وششدر ہیں۔

وَقَانِعٍ بَاتَ بِالْقُنْعَانِ مُضْطَبِرًا　　وَقَانِعٍ جَازِعٍ أَمْسَى بِقِنْعَانِ

(176) بہت سے قناعت پسند، صابر لوگوں نے قناعت کے ساتھ رات بسر کی، بہت سے جلد باز بے صبر لوگوں نے کھلے آسمان کے نیچے رات گزاری۔

وَ جَائِعٍ كَانَ مِطْعَامًا لِكُلِّ طَوٍ　　وَ نَاهِلٍ كَانَ مِنْهَالاً لِنَهْلاَنِ

(177) (آج) بہت سے لوگ وہ ہیں جو بھوکوں کی مہمان نوازی کرنے والے تھے اور بہت تشنہ لب وہ ہیں جو سخاوت وفیاضی میں خود ایک گھاٹ کی مانند تھے۔

وَ هَائِمٍ قَدْ تَنَاسَى الْهَيْمَ أَهْيَمَ فِي الْـ　　هُيَامِ وَالْهَوْمِ وَالْهَيْمَاءِ هَيْمَانِ

(178) کتنے ہی عاشق وہ ہیں جو عشق ومحبت کو بھول کر بے آب وگیاہ جنگل میں سخت پیاس کے عالم میں سرگشتہ ہیں۔

وَ مُعْتَرٍ ذِيْ كَسَاءٍ لاَكِسَاءَ لَهُ　　وَ كَانَ يَكْسُوْ قُبَيْلاً كُلَّ عُرْيَانِ

(179) (آج) بہت سے مجد وشرف والے ایسے ہیں کہ انھیں کپڑا میسر نہیں حالاں کہ قبل ازیں وہ برہنہ جسموں کو کپڑے پہنایا کرتے تھے۔

وَ مُغْرِبٍ مُغْرَبٍ أَوْدَى بِغُرْبَتِهِ　　فَصَارَ جُثَّتُهُ طُعْمًا لِغِرْبَانِ

(180) بہت سے تکلیف زدہ مسافر اپنے وطن سے دور ہلاک ہوگئے اور ان کی نعش چیل کووں کا لقمہ بن گئی۔

لَمْ يَبْقَ عَارٌ عَلَى عَارٍ يَعُرُّ وَلاَ　　عَارٍ يُعَرِّيْ وَلاَ كَاسٍ بِدِرْمَانِ

(181) آج برہنگی باعث شرم نہیں ہے، نہ کپڑے اتارنا باعث عار ہے اور نہ ہی معمولی اور گھٹیا کپڑا پہننا باعث شرمندگی ہے۔

كَمْ بَادَ فِي الْبِيْدِ وَالْبَادَاةِ أَوْ سَرَبٍ　　سِرْبٌ مِنَ الْغِيْدِ يَحْكِيْ سِرْبَ غِزْلاَنِ

(182) کتنی ہی دوشیزائیں جنگل، صحرا اور راستوں میں ہلاک ہوگئیں جو ہرنوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔

تَيْهُ فِي التِّيهِ رَبَّاتُ الْحِجَالِ بِلاَ دَالٍ وَ وَالٍ بِلاَ سِتْرٍ و أظْعَانِ

(183) عورتیں بغیر پردہ اور بغیر ڈولی کے ویران میدان میں بھٹک رہی ہیں نہ ان کا کوئی ولی ہے اور نہ کوئی رہنما۔

تَحُوزُ حُوزُ الْحَوَارِيَّاتِ مِنْ شَزَنٍ يَحْزَنَ يَرْبُوْنَ فِيْ رَبْوٍ وَ حُوزَانِ

(184) سفید لباس میں ملبوس خوب صورت عورتیں پتھریلی زمین میں حیرانی کے عالم میں بھٹک رہی ہیں اور رہنمائی نہ ہونے کی بنا پر ٹیلوں وغیرہ پر چڑھ رہی ہیں۔

تَحُوزُ حُوزٌ خَوَائِنٌ يَحْزَنَ بِلاَ حَامٍ مُحَامٍ كَأَحْمَاءٍ وَأَخْتَانِ

(185) کتنی پاک باز اور شریف عورتیں دیور اور داماد جیسے کسی محافظ کے بغیر حیران پھر رہی ہیں۔

سَنَائِعُ خُلْقُهُنَّ الْجُنْنُ جُبْنَ حَفًا سَنَائِعَ الطَّوْدِ أَوْ أَوْعَارَ جَبَّانِ

(186) نازک اندام خوبصورت عورتیں ننگے پاؤں، پہاڑی راستوں یا وحشت ناک وادیوں میں بھٹک رہی ہیں۔

خُودٌ مُكَافِلُ قَدْ عُجِّزْنَ أَعْجَزَهَا كُثْبَانُ أَعْجَازِهَا عَنْ جَوْبِ كُثْبَانِ

(187) کتنی ہی نوجوان لڑکیاں جن کی منگنی ہو چکی ہے، بوڑھی ہو گئیں، ان کے جسم کی نزاکت نے ان کو ٹیلوں پر چڑھنے سے عاجز کر دیا۔

كَمْ خَضَّبَ الشَّوْكُ أَقْدَامَ الرَّوَاقِنِ مِنْ دَمٍ وَ كَمْ خُضِّبَتْ قِدْمًا بِإِزْقَانِ

(188) کانٹوں نے کتنی ہی حسین وجمیل عورتوں کے پاؤں خون سے رنگین کر دیے جبکہ قبل ازیں کتنی ہی بار انھیں مہندی و زعفران سے رنگا گیا تھا۔

كَمْ حَاصِنٍ فُرِّقَتْ فِيْ لُجَّةٍ غَرِقَتْ فَأَهْلَكَتْ نَفْسَهَا صَوْنًا لِأَحْصَانِ

(189) بہت سی عفت مآب عورتیں پانی میں ڈوب گئیں، انھوں نے عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کو ہلاک کر دیا۔

صَارَ الْمَوَالِيْ عَبِيْدًا لِلْعَبِيْدِ كَمَا صَارَتْ حَرَائِرُ إِمْوَانًا لِإِمْوَانِ

(190) آقا (اپنے) غلاموں کے غلام ہو گئے اور آزاد عورتیں (اپنی) باندیوں کی باندیاں بن گئیں۔

اَلنَّاسُ فِيْ هَرَبٍ يَسْتَرْجِعُوْنَ فَمِنْ بَاكٍ وَ شَاكٍ وَ حَنَّانٍ وَ أَنَّانِ

(191) لوگ انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہوئے بھاگ رہے ہیں، ان میں گلہ وشکوہ کرنے والے اور آہ وبکا کرنے والے بھی ہیں۔

يَسْتَرْجِعُوْنَ بِتَرْجِيْعِ الْحَنِيْنِ إِلَى الدِّ　　دِيَارِ لِلْيَأْسِ عَنْ أَوْبٍ وَ رُجْعَانِ

(192) دوبارہ گھر لوٹنے سے مایوس ہو چکے لوگ گھٹی گھٹی آواز میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہے ہیں۔

يَجِدُّ جُنْدُ النَّصَارَى فِيْ تَجَسُّسِهِمْ　　فَيَفْتُكُوْنَ بِغِلْمَانٍ وَ فِتْيَانِ

(193) انگریزوں کا لشکر ان کی تلاش میں کوشش کر رہا ہے، پس وہ بچوں اور جوانوں کو پکڑ کر قتل کر دیتے ہیں۔

يَسْعَوْنَ سَعْيًا حَثِيْثًا فِيْ تَطَلُّبِهِمْ　　يُرْدُوْنَ مَنْ يَبْتَلِيْ مِنْهُمْ بِوِجْدَانِ

(194) وہ ان کی طلب میں بے حد کوشش کرتے اور جس مصیبت زدہ کو پاتے قتل کر دیتے۔

وَ يَأْسِرُوْنَ فَرِيْقًا يَلْحَقُوْنَ بِهِمْ　　إِلَى ظَلُوْمٍ غَلِيْظِ الْقَلْبِ غَضْبَانِ

(195) وہ ایک گروہ کو قید کر کے اس شخص کے پاس لے جاتے جو انتہائی ظالم، سخت دل اور غصہ ناک تھا۔

يَقْضِيْ عَلَيْهِمْ بِخَنْقٍ ثُمَّ يَقْتُلُهُمْ　　بِبُنْدُقٍ بَعْدَ مَا شُدُّوْا بِأَشْطَانِ

(196) وہ ظالم ان کی پھانسی کا حکم صادر کرتا پھر وہ ان کو رسیوں سے باندھ کر گولی سے اڑا دیتے۔

وَالْمَلِكُ عَنُّوْهُ إِذْ عَنُّوْهُ مُحْتَبَسًا　　فِيْ حَرْسٍ أَزْرَقَ كَالشَّيْطَانِ خَيْطَانِ

(197) شیطان صفت سرکش دشمن نے بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کو قید کر کے سخت ترین تکالیف دیں۔

وَقَتَّلُوْا مِنْ بَنِيْهِ الْغُرِّ أَرْبَعَةً　　وَ عَلَّقُوْا جُثَثَ الْقَتْلَى بِعِيْدَانِ

(198) اس کے چار خوبرو بیٹوں کو قتل کر دیا اور مقتولوں کی نعشیں درختوں کے تنوں پر لٹکا دی گئیں۔

أَهْدَوْا إِلَى الْمَلِكِ الْعَانِيْ مَفَارِقَهُمْ　　مَقْطُوْعَةً وَ ضَعُوْهَا فَوْقَ أَخْوَانِ

(199) ان کے کٹے ہوئے سروں کا تحفہ دسترخوان پر سجا کر مصیبت زدہ بادشاہ کو پیش کیا گیا۔

وَ زَوْجُهُ بَعْدَ طُوْلِ الطَّوْلِ قَدْ قُصِرَتْ　　مِنْ بَيْنِ مَقْصُوْرَةٍ فِيْ سِجْنِ سَجَّانِ

(200) بادشاہ کی بیوی قدرت وطاقت کا ایک طویل عہد گزارنے کے بعد جیل خانہ کی ایک

کوٹھری میں قید ہو کر رہ گئی۔

لَمْ يَنْجُ مِنْ قَتْلِهِمْ مِنْ قَوْمِهِ أَحَدٌ   إِلَّا مَنِ اخْتَفَىٰ فِي شِعْبٍ بِأَكْنَانِ

(201) اس بد بخت قوم کی قتل و غارت گری سے کوئی محفوظ نہ رہا صرف وہی لوگ بچ سکے جو پہاڑوں کی گھاٹیوں اور غاروں میں چھپ گئے۔

أَوْمَنْ تَنَكَّرَ أَوْ مَنْ فَرَّ مُغْتَرِبًا   إِلَىٰ قُرَىٰ حَمِيَتْ مِنْهُمْ إِلَى الْآنِ

(202) یا جنھوں نے اپنا حلیہ بدل لیا یا وہ جو چھپ کر ان بستیوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جنھوں نے اب تک ان کی حفاظت کی۔

غَالُوا الْأُلُوفَ الْأُولَىٰ أَلْفَوْا بِمَا اطَّلَبُوا   مِنْ آلِ تَيْمُورَ مِنْ مُلَّاكِ جُرْجَانِ

(203) انگریزوں نے آل تیمور (شاہی خاندان) تلاش کر کر کے ہزاروں افراد کی گردن ماردی۔

تَسَلَّطُوا إِذْخَلَتْ دِهْلِيْ لَهُمْ وَ خَوَتْ   عَلَىٰ قُرَىٰ فِيْ نَوَاحِيْهَا وَ بُلْدَانِ

(204) جب شہر دہلی ان کے لیے خالی ہو گیا تو یہ اس پر مسلط ہو گئے اور دہلی کے اطراف و نواحی میں بسے ہوئے شہروں و گاؤں کو تباہ و برباد کر دیا۔

فَخَنَّقُوا جُلَّ أَهْلِيْهَا وَلَمْ يَذَرُوْا   إِلَّا أَقِلَّاءَ مِنْ شِيْبٍ وَ شِيْخَانِ

(205) چند بوڑھوں اور ضعیفوں کو چھوڑ کر اکثر اہلیان دہلی کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا۔

لَمْ يَتْرُكُوْا عَالِمًا فِيْهَا وَلَا عِلْمًا   مِنَ الْعُلُوْمِ الَّتِيْ حُقَّتْ بِإِتْقَانِ

(206) نہ انھوں نے کسی عالم کو بخشا اور نہ ہی کسی علم کا نشان چھوڑا۔

لَمْ يَتْرُكُوْا فِيْ صُحُفٍ مُصْحَفًا شَغَفًا   بِدَرْسٍ أَرْسُمِ تَدْرِيْسٍ وَ قُرْآنِ

(207) انھوں نے قرآنی صحیفے تک نہیں چھوڑے اس کی درس و تدریس کے نشان مٹا دیے۔

هَدُّوا الْمَسَاجِدَ إِلَّا نَادِرًا مَنَعُوْا   فِيْهِ الصَّلَاةَ بِتَثْوِيْبٍ وَ إِيْذَانِ

(208) چند مساجد کے علاوہ سب کو منہدم کر دیا اور ان میں بھی اذان و تھویب اور نماز پڑھنے سے روک دیا۔

دَاسُوْا الْبِلَادَ وَ دَاسُوْهَا فَلَمْ يَذَرُوْا   مَا كَانَ فِيْهِنَّ مِنْ قَصْرٍ وَ إِيْوَانِ

(209) شہروں کو روند کر رکھ دیا ان میں کوئی کوٹھی اور ایوان صحیح و سالم نہیں چھوڑا۔

شَبُّوْا وَ شَبُّوْا لَظًى فِيْهَا قَدِاحْتَدَمَتْ   عَلٰى شَبَابٍ وَ وِلْدَانٍ وَ كُهْلَانِ

(210) انھوں نے شہروں میں آگ کے شعلے بھڑکا دیے جس میں جوان بچے، بوڑھے سبھی جھلس گئے۔

وَ قَتَّرُوْا رِزْقَ كُلٍّ غَيْرَ مَنْ نَصَرَ الْـ   ـنَصْرَانَ فِي الْحَرْبِ مِنْ زُطٍّ وَ غُمَّانِ

(211) اور ہر ایک کی روزی کی راہیں تنگ کر دیں سوائے ہندستانی جاٹ اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کے جنھوں نے جنگ میں انگریزوں کی اعانت و مدد کی۔

وَ أَرْصَدُوْا لِيُعَنُّوْا مَنْ جَلَا هَرَبًا   زُطًّا غِلَاظًا بِمِرْصَادٍ بِإِكْمَانِ

(212) یہ راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے تا کہ جو بھی جاٹ وغیرہ چھپ کر بھاگے، اسے قید کر کے اذیتیں دیں۔

لُدًّا [شِدَادًا] شَيَاطِيْنًا زَنَادِقَةً   لَا يَرْحَمُوْنَ عَلٰى وَانٍ وَلَا فَانِ

(213) یہ جھگڑالو، سخت، شیطان صفت، بے دین لوگ کسی کمزور اور بوڑھے پر بھی ذرا رحم نہیں کھاتے۔

لَمَّا جَلَا أَهْلُ دِهْلِيْ خَاذِلِيْنَ مَعَ الْـ   ـجَيْشِ الْأُولٰى خَذَلُوْهُمْ كُلَّ خَذْلَانِ

(214) وہ اہل دہلی جو پہلے والے لشکر سے پیچھے رہ گئے تھے جب انھوں نے دہلی شہر کو چھوڑا تو ان شیطانوں نے انھیں ہر طرح ذلیل وخوار کیا۔

لِضِيْقِ عَيْشٍ إِذِ الْأَعْدَاءُ لَمْ يَذَرُوْا   أُكْلًا لِطَاوٍ وَلَا شِرْبًا لِعَطْشَانِ

(215) انھوں نے تنگ دستی کی وجہ سے دہلی سے کوچ کیا اس لیے کہ دشمنوں نے بھوکے کے لیے کوئی لقمہ اور پیاسے کے واسطے پانی تک نہیں چھوڑا۔

غَلُّوْا بِغِلِّهِمِ الْغَلَّاتِ وَ انْتَهَرُوْا   مَنْ غَلَّ فِي الْمِصْرِ مِنْ ......

(216) بغض و کینہ کی وجہ سے ان گوروں نے غلوں کو مہنگا کر دیا اور ہر اس شخص کو زجر و توبیخ کی جس نے شہر میں خفیہ......

خَرَجْتُ أَسْتَوْقِفُ الْجَيْشَ الْهَزِيْمَ وَمَا   ثَبَّتُّ مَنْ فَرَّ فِيْ وُسْعِيْ وَ إِمْكَانِيْ

(217) میں شکست خوردہ لشکر روکنے کے لیے نکلا لیکن بھاگے ہوئے لوگوں کو ثابت قدم رکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔

وَقُلْتُ إِنَّ الْعِدَى لَنْ يَصْفَحُوْا أَبَدًا　　　فَمَا مِنَ الْحَرْبِ مِنْ بُدٍّ وَ حُتْنَانِ

(218) میں نے ان سے کہا کہ دشمن ہرگز انھیں معاف نہیں کرے گا،لہٰذا جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

لَمْ آلُ فِيْ نُصْحِهِمْ جُهْدًا فَمَا اسْتَمَعُوْا　　　إِلَى النُّصْحِ وَلَمْ يُصْغُوْا بِإِذْعَانِ

(219) میں نے انھیں نصیحت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی مگر انھوں نے اس نصیحت پر کان نہیں دھرے۔

فَقَادَنِي الْعَجْزُ إِذْصَادَفْتُهُمْ صَدَفُوْا　　　عَنِ الْقِتَالِ إِلَى أَهْلِيْ وَ أَوْطَانِيْ

(220) جب میں نے محسوس کیا کہ وہ جنگ وقتال سے اعراض وروگردانی کرر ہے ہیں تو مجبوراً میں نے اپنے گھر والوں اور وطن کا قصد کیا۔

وَدَّعْتُ دِهْلِيْ وَدَاعَ الرُّوْحِ قَالِبَهَا　　　كُرْهًا وَ وَدَّعْتُ خُلَّانِيْ وَ خُلْصَانِيْ

(221) میں نے دکھے دل سے شہر دہلی کو ایسے ہی چھوڑا جیسے روح جسم سے جدا ہوتی ہے اور اپنے مخلص دوستوں اور حباب کو الوداع کہا۔

تَفُوْرُ فِيْ كَبِدِي الْحَرَّى لَظَى كَبَدٍ　　　تَثُوْرُ فِيْ خَلَدِيْ أَشْجَانُ أَفْجَانِ

(222) میرے زخمی دل میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور میرے دل میں غموں کا طوفان اٹھ رہا ہے۔

وَ قَدْ أَشَاعَ النَّصَارَى فِي الْقُرَى عِدَةَ النْ　　　نُحْلِ الْجَزِيْلِ لِمَنْ يَسْعَى لِيِشْدَانِيْ

(223) انگریزوں نے بستیوں میں اعلان کر دیا کہ مجھے ڈھونڈ کر لانے والوں کو بڑے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔

وَ دُوْنَ أَرْضِيْ بَوَادٍ دُوْنَهَا قُنَنٌ　　　فِيْهَا بَوَادٍ وَ أَنْهَارٌ وَ بَحْرَانِ

(224) میرے گھر کے سامنے جنگلات تھے جن میں پتھریلے علاقے ،دریا،نہریں تھیں۔

لَمْ يَتْرُكِ الْخَصْمُ فِيْ بَحْرٍ وَلَا فَلَكٍ　　　فُلْكًا وَ جِسْرًا لِمَلَّاحٍ وَ سُفَّانِ

(225) دشمن نے ملاح اور کشتی بان کے لیے دریا میں کوئی کشتی اور پل سلامت نہیں چھوڑا۔

فَسِرْتُ فِيْ كُلِّ بَرٍّ بَاعِدٍ وَ عَلَى الرْ　　　رَبِّ الْقَرِيْبِ الرَّقِيْبِ الْبَرِّ تُكْلَانِيْ

(226) میں نگہبان شہ رگ سے زیادہ قریب رب قدیر پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے ہر دور دراز خشکی کے راستے پر چلا۔

قَدْ كَانَ مَنْ كَانَ غَيْرِيْ عَابِرًا عَبِرًا وَقَدْ عَبَرْتُ بِحَارًا غَيْرَ عَبْرَانِ

(227) پریشان حال مصیبت کے مارے میرے ساتھ تھے۔ میں نے حزن وملال اور گریہ کیے بغیر سمندروں کو عبور کیا۔

عَايَنْتُ عَيْنَ الْعِدَى فِيْ كُلِّ مَرْحَلَةٍ وَاللّٰهُ عَمَّاهُ عَنْ عَيْنِيْ وَ أَعْيَانِيْ

(228) ہر منزل پر میں نے دشمن کے جاسوس کو دیکھا اللہ نے اسے میرے دیکھنے سے اندھا کر دیا۔

وَ كَمْ نَجِدْتُ وَكَمْ كَابَدْتُ مِنْ نَجْدٍ فِيْ جَوْبِ وَ غَوْرٍ وَ أَنْجَادٍ وَ وُهْدَانِ

(229) میں نے وحشت ناک اور نشیب وفراز سے پُر راستوں کو طے کرنے میں بے شمار کرب و تکلیف کو برداشت کیا۔

أَجَمْتُ نَفْسِيْ وَ صَحْبِيْ فِي الْتِحَامِيْ فِيْ آجَامِ أُسْدٍ وَ أَنْمَارٍ وَ ذُؤْبَانِ

(230) میں نے بلا جھجک خود کو اور اپنے ساتھیوں کو شیر، چیتوں اور بھیڑیوں کی کچھار میں ڈال دیا۔

وَقَفْتُ خَوْفَ اغْتِيَالٍ فِيْ غَوَائِلَ مِنْ غَوْلٍ وَ غُوْلٍ وَ أَغْوَالٍ وَ غِيْلَانِ

(231) میں قتل کے خوف سے کتنی مشقتوں، ہلاکتوں اور آفتوں میں آ گھرا۔

وَاللّٰهُ يُصْحِبُنَا مِنْهَا وَ يَصْحَبُنَا فَإِنَّهُ خَيْرُ وَاقٍ خَيْرُ مِعْوَانِ

(232) اللہ ہی نے ہماری حفاظت فرمائی اور اس کی مدد ہمارے ساتھ رہی۔ بے شک بہترین حفاظت کرنے والا اور مددگار ہے۔

حَتّٰى قَدِمْتُ نَجِيْحًا سَالِمًا أَمِنًا فَارْتَاحَ أَهْلِيْ وَجِيْرَانِيْ بِمَقْدَمَانِيْ

(233) یہاں تک کہ میں صحیح سلامت اپنے اہل وعیال سے آ ملا تو میرے گھر والوں اور پڑوسیوں نے میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

أَوْ فَوْا نُذُوْرًا بِقُرْبَانٍ قَدِ الْتَزَمَتْهَا أُسْرَتِيْ وَ أُولُو الْقُرْبٰى لِقُرْبَانِيْ

(234) میرے خاندان اور رشتہ داروں نے میرے آنے کے لیے جو نذریں اور منتیں مانی تھیں انھیں پورا کیا۔

فَاسْتَبْشَرُوْا وَتَلَقَّوْنِيْ بِتَهْنِئَةٍ　　كُلٌّ أَتَانِيْ فَحَيَّانِيْ فَهَنَّانِيْ

(235) وہ سب لوگ خوش ہوئے اور مجھے مبارک باد پیش کی جو میرے پاس آتا وہ مجھے سلام کرتا اور مبارک باد پیش کرتا۔

□□□

کتابیات

مندرجہ ذیل کتابوں، مقالوں، رسائل اور دستاویزات سے براہ راست استفادہ کیا گیا

(1) آثار الصنادید: سرسید احمد خاں (مرتبہ خلیق انجم) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2003
(2) اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد: غلام رسول مہر، لاہور پاکستان، 1957
(3) اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی خاں رام پوری، نول کشور لکھنؤ، 1918
(4) استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی: نور الحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ مظفر نگر، 2009
(5) اکمل التاریخ: مولوی یعقوب ضیا قادری، مطبع قادری بدایوں، 1915
(6) الحیاۃ بعد المماۃ: فضل حسین بہاری، مطبع اکبری آگرہ، 1908
(7) الدر المنثور فی تراجم اہل صادق فور: عبد الرحیم صادق پوری، دی آزاد پریس پٹنہ، 1964
(8) انتخاب یادگار: منشی امیر احمد مینائی، تابع المطابع لکھنؤ، 1290ھ
(9) باغی ہندوستان: عبد الشاہد خاں شیروانی، المجمع الاسلامی مبارک پور، 2001
(10) برطانوی مظالم کی کہانی: عبد الحکیم اختر شاہجہانپوری، فرید بک اسٹال لاہور، سنہ ندارد
(11) بہادر شاہ کا مقدمہ: خواجہ حسن نظامی، مشمولہ "1857: شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی کی

بارہ قدیم یادگار کتابیں''، نئی دہلی، 2008

(12) پرتھم سوتنتر تا آندولن 1857 (ہندی): محمد معین الحق خیر آبادی، خیر آباد، سیتاپور، 2001

(13) تاریخ جھجھر: منشی غلام نبی تحصیل دار، مطبع فیض احمدی، 1866

(14) تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ: ذکاء اللہ، مطبع شمس المطابع دہلی، 1904

(15) تذکرۃ الرشید: عاشق الٰہی میرٹھی، مکتبہ خلیلیہ سہارن پور، سنہ ندارد

(16) تذکرہ علمائے ہند: رحمٰن علی، مرتبہ: ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، 1981

(17) تذکرہ کاملان رامپور: احمد علی شوق، خدا بخش لائبریری پٹنہ، 1986

(18) تذکرہ مشائخ کاکوری: محمد علی حیدر کاکوروی، اصح المطابع لکھنؤ، 1927

(19) تواریخ عجیب (کالا پانی): جعفر تھانیسری، مرتبہ ایوب قادری، سلمان اکیڈمی کراچی، 1962

(20) تواریخ عجیبہ (سوانح احمدی): جعفر تھانیسری، بلالی اسٹیم پریس، ساڈھورہ پنجاب، 1895

(21) جنگ آزادی 1857: واقعات و شخصیات: ایوب قادری، پاک اکیڈمی کراچی، 1976

(22) حدائق الحنفیہ: فقیر محمد جہلمی، نول کشور لکھنؤ، 1886

(23) حیات جاوید: الطاف حسین حالی، نامی پریس کانپور، 1901

(24) حیات علامہ فضل حق خیر آبادی اور ان کے سیاسی کارنامے: مفتی انتظام اللہ شہابی، دائرۃ المصنفین کراچی، 1957

(25) خطوط غالب: غلام رسول مہر، مطبوعات مجلس یادگار غالب لاہور، 1969

(26) خیر آباد کی ایک جھلک، نجم الحسن رضوی خیر آبادی، نامی پریس لکھنؤ، 1969

(27) دیوانِ فضل حق الخیر آبادی: دراسۃ و تحقیق: ڈاکٹر سلمہ سیہول (زیر طبع)

(28) سفر اور تلاش: محمود احمد برکاتی، مجلس مطبوعات و تحقیقات اردو کراچی، سنہ ندارد

(29) العلامۃ فضل حق الخیر آبادی مع تحقیق کتابہ الثورۃ الھندیۃ: قمر النسا بیگم، مکتبہ قادریہ لاہور، 1986

(30) علامہ محمد فضل حق خیر آبادی: سلمہ سیہول، الممتاز پبلی کیشنز لاہور، 2001

(31) علمائے ہند کا شاندار ماضی: سید محمد میاں، جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور، 2008

(32) غالب اور ہماری تحریک آزادی: شمیم طارق، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، بار دوم، 2007

(33) غالبیات چند عنوانات: کالی داس گپتا رضا، ول پبلی کیشنز، بمبئی، 1982

(34) غدر دہلی کے اخبار، از: خواجہ حسن نظامی، مشمولہ "1857: شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی کی بارہ قدیم یادگار کتابیں"، نئی دہلی، 2008

(35) غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط، لاہور

(36) غدر کے چند علما: مفتی انتظام اللہ شہابی، دینی بک ڈپو دہلی، سنہ ندارد

(37) فتاویٰ عزیزی (فارسی)، شاہ عبدالعزیز دہلوی، مطبع مجتبائی دہلی، 1311ھ

(38) فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون: حکیم محمود احمد برکاتی، برکات اکیڈمی کراچی، 1975

(39) مرحوم دہلی کالج: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1989

(40) مقالات سرسید: محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، سنہ ندارد

(41) مولانا محمد احسن نانوتوی: ایوب قادری، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، کراچی، 1966

(42) ہمارے ہندستانی مسلمان: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی، 2002

(43) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک: مسعود عالم ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، 1999

(44) یادگار غالب: الطاف حسین حالی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1986 (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن)

(45) 1857: پس منظر و پیش منظر: یٰسین اختر مصباحی، دارالقلم دہلی، 2007

(46) 1857 کا تاریخی روزنامچہ: خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی، دسمبر 1971

(47) 1857 کے غداروں کے خطوط: سید عاشور کاظمی، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، 2011

اخبارات و رسائل

(48) صادق الاخبار، شمارہ: 3,4، جلد: 4، جولائی 1857

(49) العاقب (ماہنامہ) مولانا فضل حق خیر آبادی و جنگ آزادی 1857 نمبر، لاہور، جولائی تا ستمبر 2009

(50) قومی آواز (روزنامہ لکھنؤ ایڈیشن) شمارہ: 24 فروری 1985

(51) مظہر حق (ماہنامہ) تاج الفحول نمبر، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں، نومبر تا مارچ 1998/1999

مقالات

(52) مولانا فضل حق خیرآبادی: مالک رام، مشمولہ "ماہنامہ تحریک دہلی شمارہ جون 1960

(53) مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857 کا فتوئ جہاد: امتیاز علی خاں عرشی، ماہنامہ تحریک دہلی، شمارہ: اگست 1957

(54) مولانا فضل حق خیرآبادی: دور ملازمت: ایوب قادری، مشمولہ مولانا فضل حق خیرآبادی: ایک تحقیقی مطالعہ: افضل حق قرشی، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، 1992

دستاویزات

(55) ضلع گزیٹیر سیتاپور، مطبوعہ 1905

(56) میوٹنی پیپرز، کلکشن: 16، نمبر: 12، 1 ستمبر 1657، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی

انگریزی مراجع

(57) دی گریٹ ریولیوشن آف 1857، ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی، 1968

(58) میموائرس آف حکیم احسن اللہ خاں، ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی پاکستان، 1958

□□□
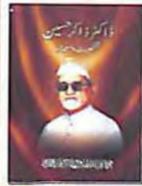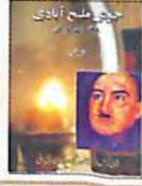
₹ 91/-

ISBN: 978-81-7587-983-6

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025